سلوکِ سلیمانی

یا

شاہراہِ معرفت

مرتب

حضرت مولانا پروفیسر محمد اشرف خان صاحب سلیمانی
صدر شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی

سلیمان اکادمی
دفتر شرف منزل نزد اسلامیہ کالج پشاور یونیورسٹی

1

سلوکِ سلیمانی

یا

شاہراہِ معرفت

جلد اول

جس میں سید الملۃ شیخ وقت حضرت علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہ
خلیفہ مجاز حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کی اسلامی
سلوک کی پیش کردہ تعلیمات مرتب کی توضیحات و تعبیرات کے ساتھ پیش کی گئی ہیں

مرتب

حضرت مولانا پروفیسر محمد اشرف خان صاحب سلیمانی
صدر شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی

سلیمان اکادمی
(اشرف منزل)، نزد اسلامیہ کالج پشاور یونیورسٹی

نام کتاب : ـــــــــ سلوک سلیمانی یا شاہراہ معرفت (جلد اول)

مرتب : ـــــــــ حضرت مولانا پروفیسر محمد اشرف سلیمانی

ناشر : ـــــــــ سلیمان اکیڈیمی اشرف منزل
نزد اسلامیہ کالج پشاور یونیورسٹی

طابع : ـــــــــ کمبائن پرنٹرز بلال گنج لاہور

بائینڈر : ـــــــــ ایم اسحاق شیش محل روڈ لاہور 7654742

تعداد : ـــــــــ گیارہ سو (۱۱۰۰)

قیمت : ـــــــــ ۱۵۰ روپے

کتابت : ـــــــــ محمد نعیم صدیقی

تاریخ اشاعت ستمبر ۱۹۸۱ء - (ذی القعدہ - ۱۴۰۱ھ)

إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمَانَ وَ إِنَّهُ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

○ ○

إِنَّ اللهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ

حدیثِ دل کسی درویش بے گلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ

انتساب

سید الملۃ استاذ الکل حضرۃ الشیخ

علامہ سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہ

کے نام

رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانۂ تست

کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

فقیر بے نوا

محمد اشرف سلیمانی

صدر شعبہ عربی پشاور یونیورسٹی

۱۲؍شعبان ۱۴۰۱ھ

فہرست ابواب

(جلد اوّل)

"پہلا باب"

دوسرا باب

تیسرا باب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

الحمد للہ العلی العظیم والصلوٰۃ والسلام علی

رسولہ المزکی الکریم وَاَصْحَابِہِ الطَّیِّبِیْنَ ط

اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمتوں کو اسی کی حکیم وخبیر ذات جانتی ہے۔ رب قدیر کی قدرت کاملہ جس سے چاہے جو کام چاہے لے لے۔ اس کا ارادہ ہی ہر چیز کا وجود اور اس کا فضل ہی ہر خیر کا سبب ہے۔ سچ ہے ع

داد او را قابلیت شرط نیست — بلکہ شرط قابلیت داد اوست

بارہا نادانوں سے وہ کام لے لیا گیا کہ دانا حیران رہ گئے۔

جولائی، اگست ۱۹۵۴ء کی بات ہے کہ ہیچمدان اپنی ایک بیماری کے علاج کے سلسلے میں اپنے بھائی ڈاکٹر محمد اسلم خان صاحب کے پاس جہلم میں مقیم تھا۔ مرشدی و مولائی حضرت الشیخ علامہ سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کو سات آٹھ ماہ کا عرصہ گذرا تھا۔ ان کی وفات کا زخم تازہ تھا۔ ان کی یاد دل ودماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ نہیں جانتا کہ کیا ساعت تھی۔ جس میں کودک ناداں حضرت سلیمانؒ کے سلوک پر قلم اٹھانے کی ہمت وجرأت کر بیٹھا۔ اور "سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر" کے عنوان سے تقریباً ایک سو بیس صفحات کا مضمون لکھ ڈالا جس کا تانا بانا

حضرت سیّد صاحب قدس سرہٗ کے مکتوبات و ملفوظات سے عبارت تھا۔ یہ مقالہ رسالۂ معارف اعظم گڑھ میں دسمبر ۱۹۵۵ء تا جنوری ۱۹۵۶ء) شائع ہوا بندہ کو ہرگز یہ توقع و اُمید نہیں تھی کہ یہ مقالہ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے حلقۂ خاص اور دیگر دینی و علمی حلقوں میں بارِ قبولیت پائے گا۔ حضرت الشیخ قدس سرہٗ کے قریبی احباب و تلامیذ خصوصاً حضرت مولانا عبدالباری ندوی نوراللہ مرقدہٗ حضرت عبدالماجد دریابادی رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہم، حضرت محمد اویس ندوی نگرامی رحمۃ اللہ علیہ، برادرِ معظم ڈاکٹر مولوی غلام محمد صاحب دام کرمہٗ مولانا عبدالرؤف صاحب اورنگ آبادی (مسترشد خاص حضرت مرشدیؒ) کی قدر افزائی اور دیگر اہلِ نظر[۱] کی تحسین نے مزید حوصلہ بڑھایا۔ اور اپنی بساط و ظرف کے مطابق

---

[۱] مثلاً فیلسوف شہیر ڈاکٹر میر ولی الدین (ایم۔اے۔ پی ایچ ڈی بیرسٹرایٹ لاء) حیدرآبادی نے ایک خط میں لکھا "سلوک سلیمانی پر ایک نظر میں نے معارف میں پڑھا تھا اور کافی استفادہ کیا تھا۔ اگر اب آپ ایک مفصل مرتبع شائع فرمائیں تو مجھے یقین ہے کہ نہایت مفید چیز ہوگی ـــــ علامہ محمد زکریا بنوری نوراللہ مرقدہٗ و والد بزرگوار حضرت علامہ یوسف بنوری نے ایک گرامی نامہ میں ارقام فرمایا۔ "آپ کا ہدیہ مبارک "سلوک سلیمانی" ملا حضرت علامہ سیّد سلیمان رحمۃ اللہ علیہ نے جو ارشادات عالیہ تصوف کے پیچیدہ و مشکل مسائل میں اپنے عقیدہ مندوں کو فرمائے تھے۔ آپ نے ان جواہر پاروں کو اپنی کتاب "سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر" میں نہایت اختصار سے اور بہت عمدہ و لطیف پیرایہ میں درج فرما دیا ہے۔ میں آپ کے زورِ طبع و قلم سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ جزاکم اللہ احسن الجزا فی الدنیا والاخرہ"۔

(اسی طرح کے کئی خطوط مختلف حلقوں سے موصول ہوئے)

"سلوکِ سلیمانی" کا ایک مفصل مرقع پیش کرنے کا ارادہ کرلیا۔ مواد کی کمی، تربیتی خطوط کی کمیابی و عدم دسترس راہ میں حائل تھی تاہم بحمداللہ تعالیٰ اپنے ذہنی خاکہ میں کچھ رنگ بھر سکا۔ ابھی پانچ سو صفحات لکھے گئے تھے، کہ بندہ کے دو عزیزوں نسیم اختر شیخ صاحب اور سرمد الحسینی صاحب نے معارف کا مطبوعہ مضمون میرے مقدمہ کے ساتھ سلوکِ سلیمانی کے نام سے کتابی صورت میں شائع کردیا۔ فقیر نے اولاً تفصیلی کتاب کے لئے یہ نام سنبھال رکھا تھا۔ جب یہ نام اجمالی پیشکش کا عنوان بن گیا تو تفصیلی کتاب سے اس کے امتیاز کیلئے دوسرے نام کی ضرورت پیش آئی۔ خطبہ راندیر میں حضرت والاؒ نے اسلامی راہ سلوک کیلئے "انسانی شاہراہ معرفت" کے الفاظ استعمال فرمائے تھے۔ دل نے کہا ع

حق این نکتہ از روئے نگار آخر شد

حضرت مولانا دریابادیؒ نے استصواب پر تائید فرمائی اور یہ قرار پایا۔ کہ کتاب کا اصل نام سلوکِ سلیمانی ہی رہے لیکن ثانوی نام "شاہراہ معرفت" رکھدیا جائے۔

لے یہ رسالہ سلوکِ سلیمانی جب حضرت دریابادی کی خدمت میں پہونچا تو صدق جدید ۲۶ جون ۱۹۷۰ء میں رسید کتب کی تحت جو تبصرہ فرمایا اس کا کچھ حصہ درج ذیل ہے۔ . . . . . . یہ محمد اشرف خان ایم اے پشاوری صدر شعبہ عربی و فارسی اسلامیہ کالج پشاور ہیں جن کا رسالہ سلوکِ سلیمانی پیش نظر ہے اور بڑی ترکیبوں اور پُرپیچ راستہ اختیار کرکے ہندوستان پہنچ سکا ہے۔ کتاب صحیح نمونہ ماقل و دل کا ہے ظاہری اعتبار سے مختصر لیکن معنوی اعتبار سے پر مغز اور گہری سمجھنا چاہیئے کہ سلوک سلیمانی بلکہ سلوک اشرفی کا ایک جامع دستور العمل۔ اشرف صاحب اس موضوع پر بسط و تفصیل سے لکھنے والے ہیں وہ تو خیر جب ہوگا، ہوگا، خود یہ خاکہ بھی نافع ہونے میں کچھ کم نہیں اور شائقین کو اس کے مطالعہ میں کسی تامل کو راہ دینا چاہیئے نہ تساہل کو پھر زبان لطیف سلیس شگفتہ اور انداز بیان دلچسپ پر مزہ قلم کسی درویش خانقاہ نشین کا نہیں بلکہ تعلیمیافتہ ادیب و انشا پرداز کے کسی شاگرد رشید کا۔ مصطلحات فن سے اوراق کتاب تقریباً خالی۔"

کتاب کا تفصیلی خاکہ ۱۹۷۰ء میں مکمل ہوگیا، کتاب ٹائپ کرائی اور مختلف نسخے تبصرہ و تقریظ کیلئے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے رفقاء و محبین میں سے مخدومین عالی قدر حضرت مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبدالماجد دریابادی رحمہ اللہ تعالیٰ، محترمی مولانا ابوالحسن علی الندوی مدظلہم عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحئی صاحب عارفی زادت فیوضہم وبرکاتہم کی خدمت میں بھیجے گئے۔ ان سب حضرات نے خورد نوازی اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا ابوالحسن علی الندوی دامت برکاتہم کے تبرکات تحسین ناشناس اور پیش لفظ کے عنوانات سے آگئے۔ مخدومی حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب عارفی نے اس بارے میں دو عدد مکتوبات سے نوازا جو بندہ کیلئے مایۂ شرف وسعادت ہیں۔ خیر وبرکت اور قبولیت کا نشان سمجھتے ہوئے یہ تمام تحریریں کتاب کے مقدمات کی حیثیت سے پیش کیجارہی ہیں۔ کہ ان میں سے ہر تحریر اپنی جگہ مستقل افادیت کی حامل ہے۔ فقیر اپنے بزرگوں کی ان عنایات کیلئے سراپا سپاس اور دعاگو ہے۔ مخدومی المحترم حضرت ابوالحسن علی ندوی مدظلہم نے اپنے پیش لفظ میں سلوک کی ضرورت واہمیت پر اپنے انداز میں ایک اچھوتی اور قابل ستائش و دید بحث بھی فرمائی ہے۔ حضرت مولانا عبدالباری ندوی نوراللہ مرقدہٗ ان دنوں شدید بیمار تھے۔ پڑھنے لکھنے کی کما حقہٗ طاقت نہ تھی تاہم اولاً کچھ لکھوانے کا ارادہ فرمایا، پھر طبیعت زیادہ مضمحل ہوگئی۔ تو حضرت دریابادی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر پر ہی "آمین بالجہر" کہنے کا اظہار فرمایا، تاہم پھر کچھ طبیعت سنبھلی اور کچھ لکھنا شروع کیا، اُسے بھیجنے کی خوشخبری دی اور جو کچھ ارقام فرمایا تھا۔ ڈاک کے ذریعہ بندہ کو بھیج دیا۔ لیکن دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ کیوجہ سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر راستہ میں ضائع ہوگئی اپنے ایک غیر ملکی دوست جو ہندوستان گئے تھے ان کے ذریعہ پیغام بھجوایا لیکن

حضرتؒ کے پاس نقل نہ تھی اور پھر صحت جواب دے چکی تھی۔ اس طرح بندہ حضرتؒ کی قیمتی تقریظ سے محروم رہ گیا۔ جس کا ہمیشہ قلق اور افسوس رہے گا۔ حضرت مولانا عبدالباری قدس سرہٗ کے مکتوبات جو اس بارے میں آئے وہ بھی بندہ کے لئے مایہ تسکین و سعادت ہیں۔ اس لئے ان کے چند اقتباسات یہاں نقل کر رہا ہوں۔

ایک گرامی نامہ میں تحریر فرمایا،

" انشاء اللہ " اشرفی سلوک ' سلیمانی قالب ' میں قلم اشرف ' سے اشرف السلوک ہی ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ انجام پذیر فرمائیں "۔ (۷، ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ)

دوسرے متعلقہ اقتباسات درج ذیل ہیں۔

" تازہ کرمنامہ نے مشرف فرمایا۔ اور سلوک سلیمانی کا مجلہ ہمارے مولانا ماجد میاں نے خود ملاحظہ فرمانے سے پہلے ہی میرے پاس بھیج دیا میں اپنا حال کیا عرض کروں۔ کوئی سال بھر سے آنکھوں کی شکایت چلی آرہی ہے ...... ڈاکٹر مہرا جو آنکھوں کے خاص ماہر خیال کیئے جاتے ہیں انہوں نے موتیا بند کی توثیق کی ہے۔ پھر مجھے ٹائپ رائٹر کے نسخہ کا پڑھنا اور بھی دشوار ہوتا ہے ...... البتہ ندوہ کے ایک صاحب نے جمعہ جمعہ کو کچھ وقت دینے کو کہا ہے۔ اگر وہ آتے رہے تو انشاء اللہ ان سے پڑھوا کر اس درمیان میں سنتا رہوں گا۔ مگر ضخامت سے الحمدللہ اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے سلوک سلیمانی کا حق خوب ہی خوب ادا فرمایا ہوگا۔ خصوصاً حضرت مرحوم کے مکتوباتِ تربیت کو دیکھنا چاہتا تھا۔

ابھی اس خط کے دوران تحریر میں مولانا (دریا بادی) کے بھتیجے اور داماد ہمارے حکیم عبدالقوی بھی آ گئے ان کو بھی اپنی معذوری کا یہ حال کچھ تفصیل سے سُنایا اور یہ درخواست بھی ان کی زبانی مولانا دریا بادی کو بھجوا دی ہے کہ پہلے وہ ملاحظہ فرماکر اس پر جو کچھ تحریر فرمانا چاہے تحریر فرمادیں۔ پھر احقر کی سمجھ میں اگر کچھ آیا تو تحریر کردونگا۔ ورنہ آمین پر اکتفا کروں گا" (۱۶ ستمبر ۷۵ئہ)

"سلوک سلیمانی جب تک میرے پاس رہی از اول تا آخر جتنا خود پڑھ یا دوسروں سے پڑھا کر سن سکتا تھا اس سے مستفیض ہوتا رہا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس کارنامہ کو قبول اور مقبول فرمائے، پھر ایک دن مولانا عبدالماجد تشریف لاکر اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اب انہیں کے پاس ہے — مولانا دریا بادی تنقید و تبصرہ کے خاص ماہر ہیں، چھوٹی بڑی جس کتاب کا نقد و تبصرہ فرماتے ہیں اس کا کوئی چھوٹا بڑا عیب بمشکل ہی چھوٹتا ہوگا۔ میں ان کی تنقید و تبصرہ کا بہت قائل ہوں۔ طرح طرح کی کتابیں اور رسائل وغیرہ ان کے پاس ڈھیر کے ڈھیر آتے رہتے ہیں۔ پھر خواہ وہ چند سطروں ہی میں کسی کے متعلق جو خیال صدق میں ظاہر فرماتے ہیں۔ وہ انہیں کا حصہ ہے۔ صدق میں چھوٹی بڑی ہر طرح کی کتابوں پر تبصرے آپ کی نظر سے گذرے ہوں گے۔ میرے نزدیک تو اب تبصرہ و تنقید کا کم از کم اردو میں ان سے زیادہ کوئی حقدار مبصر نہیں، ظاہر ہے کسی ضخیم کتاب

کا اوّل تا آخر پڑھنا تو ان کے لئے ناممکن ہی ہے پھر بھی سلوک سلیمانی کو انشاء اللہ وہ جتنا زیادہ سے زیادہ وقت دے کر توجہ کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں ضرور پڑھیں گے اور تبصرہ اور تنقید کا پورا حق وہی ادا فرمائیں گے۔ باقی انشاء اللہ جیسا کہ ماجد میاں کو لکھ چکا ہوں اُنکی رائے اور تبصرہ پر آمین ہی کہنا میرے جیسے کم علم کیلئے مناسب اور سلامتی کی راہ ہوگی۔ خصوصاً جبکہ میں ماشاء اللہ اتنی ضخیم کتاب کا حق پورا کیا بر لئے نام ہی ادا کر سکتا ہوں۔ البتہ ان کے تبصرہ کے پڑھنے کے بعد انشاء اللہ میں آمین بالجہر کا حق ادا کرونگا۔" (۲۵، نومبر ۷۰ء)

" ہمارے مولانا دریابادی نے تحسین ناشناس' کی ایک نقل بھی مجھے بھیجدی ہے۔ اور صدق میں شائع بھی فرمایا تھا۔ اُمید ہے کہ آپکی نظر سے گذر چکا ہوگا۔ فرمائیے کہ کیا ماشاء اللہ ایسے شہیر صاحب قلم کی تحسین کے بعد بھی اس نابکار کو جو حکم دیا گیا ہے وہ بحال رہے گا؟ اگر حکم حکم محکم ہی رہا تو ایک صورت ذہن میں آئی ہے۔ کہ میں حضرت سید صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق قریباً ۴۵ سالہ کے گوناگوں تعلقات کے کچھ ذاتی تجربات عرض کردوں اور گو میرے لئے وہ بھی اس فریش حالت میں زیادہ آسان نہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی بات یاد دلادی کہ اسکی مدد سے انشاء اللہ العزیز آپکے حکم محکم کی کچھ نہ کچھ تعمیل ہو ہی جائیگی ...... بہر حال جو صورت ہو انشاء اللہ جواب گرامی کے بعد جو کچھ مجھ کو بن پڑے گا عرض کردونگا۔" (۱۳ اپریل ۷۱ء)

"احقر تنقید اور تبصرہ کے معاملہ میں سب سے زیادہ قائل مولانا دریابادی کا ہے۔ طرح طرح کی چھوٹی بڑی ہر طرح کی کتابیں ان کے پاس آتی ہیں۔ مجھ کو تو اتنی کتابوں کا پڑھنا اور پھر ان پر متوازن تبصرہ یہ ان کی اتنی بڑی کرامت معلوم ہوتی ہے کہ اگر مجھے کسی چیز کے لکھنے کی توفیق ہوتی ہے تو سب سے پہلے انہیں کو دکھلا لیتا ہوں۔ پھر آپ ہی فرمایئے کہ انکی تحسین کے بعد آمین بالجہر ثم آمین بالجہر کے سوا اور کیا عرض کیا جاسکتا ہے؟ پھر بھی خیال تھا کہ حضرت سید صاحب سے ۴۵ سالہ گوناگوں تعلقات میں جو خاص تاثرات میرے رہے ہیں ان کو کچھ عرض کردوں لیکن جس دن اس کے ارادہ سے قلم اٹھانا چاہتا تھا اس سے ایک دن پہلے ہی آنکھوں میں روہوں کا زور ہو گیا۔ اب انشاء اللہ دعا فرمائیں کہ جلد اس معذوری سے شفا ہو تو پھر امتثال امر کروں"

(۲۸ اپریل ۱۹۷۱ء)

"حرمین شریفین سے واپسی پر بھی آپ کا کرم نامہ مل گیا تھا مگر آنکھوں کی معذوری کیوجہ سے معذرت نامہ ہی سردست لکھ بھیجا تھا۔ ابھی آنکھیں صاف تو نہیں ہیں کہ حسب معمول کچھ لکھ سکوں۔ پھر بھی کُل دو سطروں سے ابتدا کردی اتمام بالخیر کی دُعا آپ ہی خصوصیت سے فرمائیں۔ میری حالت اصل میں اب مجموعی طور پر ایسی ہو رہی ہے کہ خود لکھنا کیا معنی ایک کارڈ بھی لکھانا دشوار ہی ہوتا ہے۔ بس ایک بزرگ دوست کے صاحبزادے مل گئے ہیں انہیں کو تیسرے پہر تھوڑی دیر کے لئے

گرفتاری پر اللہ تعالیٰ نے آمادہ کردیا۔ مگر خط کی بات اور ہے کوئی خاص تحریر املا کرانے کا بالکل عادی نہیں رہا ہوں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے کل کی ابتدا کو اگر جاری رکھا تو انشاء اللہ کاتب مذکور سلمہ ہی سے صاف کرا کے حاضر خدمت کردونگا۔۔۔۔ سردست آنکھوں کی صحت کاملہ کے لئے خصوصاً دعا جو ہوں وہ بھی خصوصاً اس لئے کہ آپ کے حکم کی تعمیل ہو جاتے۔" (۸ مئی ۱۹۷۱ء)

" روھوں کی تکلیف نے لکھنے پڑھنے سے اور زیادہ معذور کردیا۔ پھر بھی ایک آدھ دن آنکھوں میں تکلیف کچھ کم رہی تو سب سے پہلے آپ ہی کے امتثال امر کیلئے بیٹھ گیا۔ مگر بس دو دن میں صرف آدھا صفحہ پورا ہوا تھا۔ کہ پھر آنکھوں کی تکلیف بڑھ گئی اور آگے بڑھنے سے معذور رہا۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ نے پورا کردیا تو کاتب رقیمہ ہذا سے صاف کرا کے بھیج سکونگا۔ تبھی آپ اسے پڑھ سکیں گے۔ باقی اپنا لکھا تو خود بھی نہیں پڑھا پاتا۔

ایک بات اور پھر عرض کرتا ہوں کہ مولانا دریابادی سلمہم کی تحسین کے بعد اب اس کس مپرس کی کچھ سطروں کی آمین بالجہر کی حد تک بھی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ باقی آپ کا حکم واپس نہ ہوگا۔ تو بس آپ ہی دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ کسی طرح اس قابل کردیں کہ آنکھوں کی تکلیف جلد دور ہو جائے تو پھر سردست امتثال امر کے علاوہ اور کچھ لکھنے کا ارادہ نہیں ہے۔ حالانکہ ابھی دو کتابیں ناتمام یا نیم تمام پڑی ہوئی ہیں۔ جن کے متعلق خواہش ہے

کہ اللہ تعالیٰ پورا فرمائیں اور قبول و مقبول فرمائیں۔ آپ بھی آمین فرمائیں" (۲۵ مئی ۱۷ء)

"آپ کو نواب ایک کارڈ لکھاتے بھی شرم آتی ہے کہ آپ کے حکم کی تعمیل ہنوز ناتمام ہی ہے۔ بلکہ ایک دن اور کچھ سطریں لکھنے کا موقعہ ملا۔ اس کے بعد اب پھر آنکھوں کی تکلیف کی وجہ سے جہانتک خود لکھنے کا تعلق ہے اس سے ایک آدھ ہفتہ کے لئے روک ہی دیا گیا ہوں البتہ معذرت نامہ کا ایک کارڈ لکھا دینے کا جی چاہا.....

.....دعا فرمائیں کہ سہولت ہو اور آپ کے امتثال امر میں بھی اب زیادہ شرمندگی نہ اُٹھانی پڑے۔" (۲ جون ۱۷ء)

"خیر سے میرے آنکھوں کے روہوں کی تکلیف دور ہو چکی ہے۔ شاہراہ معرفت (سلوک سلیمانی) کے امتثال امر کے سلسلہ میں دو چار سطریں لکھتا رہا لیکن چونکہ میرے پرانے کاتب عرصہ سے غائب ہیں۔ اس لئے اسکو صاف نہیں کرا سکا۔ البتہ ایک دوسرے کاتب کا انتظام انشاء اللہ ہفتہ عشرہ میں ہو جائے گا۔ تو انشاء اللہ سب سے پہلے آپ کا کام ہوگا۔" (۱۱ اکتوبر ۱۷ء)

"محبت نامہ نے نوازا اور غالباً آپ ہی کی دعاؤں کی شرکت سے ہمارے کاتب بھی مہینوں کے بعد آگئے ہیں۔ بلکہ اب پابندی سے اس بوڑھے کو مکاتبت کی زحمت سے ممنون کرتے رہتے ہیں۔ شاہراہ معرفت کے متعلق احقر۔ اپنے قلم سے دو دو چار چار جملے جب موقعہ ملا لکھتا رہا۔ اب انشاء اللہ اسی اتوار کو کاتب عزیز سے

اسکو پورا کرکے روانہ خدمت کرونگا۔ مگر یہ آپ ہی جانئے کہ وہ
پہنچے گا یا نہیں، اسلئے کہ بعض دوستوں کا مشورہ یہ ہے کہ بجز کارڈ کے
اور کوئی چیز نہیں پہنچتی ہے محفوظ۔

..... ابھی حال میں آپ کا صدق میں "رومی کا پیام" کے نام سے جو
مضمون نکل رہا ہے۔ وہ تو ماشاء اللہ صدق اور صاحبِ صدق کا ہم قلم
ہے۔ اور اس نالائق کو ایسا قلم کسی درجہ میں بھی نصیب نہیں.....
بہرحال خدا کرے کہ آپ کا حکم پورا ہو جائے۔ میرے لئے تو آپ جیسے کسی
محب فی اللہ کے حکم کا پورا ہو جانا ہی باعث سعادت ہے" (۲۵ نومبر ۷۱ء)

"خدا خدا کرکے آپ کے امر کے امتثال میں ٹوٹا پھوٹا مضمون کاتب رقیمہ ہذا
نے پورا تو کر دیا ہے۔ لیکن میں اس کو نہ شاہراہ معرفت کے لائق
سمجھتا ہوں اور نہ کہیں اور اشاعت کے لائق۔

اب فرمائیے کہ آپ کا مضمون بھیجا کس طریقے سے جائے یہاں تو
لوگ کارڈ کے علاوہ کسی لفافہ کا بھیجنا بھی محفوظ خیال نہیں کرتے،
کل شام ماجد میاں سے بھی اسکا ذکر رہا اور وہاں کے احبابِ اعزہ
نے تو کراچی اور لاہور دونوں جگہ سے یہ ہدایت ہی نہیں بلکہ تجربہ
کرا رکھا ہے کہ صرف کارڈ ہی لکھے جائیں۔ خواہ ایک نہیں دو چار۔ اور
آپ کے حکم کا جو امتثال ہوا ہے۔ وہ کارڈ سے بہرحال بہت زیادہ
ہے۔" (۲۹ نومبر ۷۱ء)

اس سلسلے کا آخری خط جو اپنے ایک غیر ملکی دوست کی وساطت سے

انقطاع ڈاک کے زمانے میں ملا ہے درج ذیل ہے۔

محب اشرف زادہ اللہ شرفا

السلام علیکم۔

محبت نامہ نے حب فی اللہ کی یادیں تازہ فرمائیں، اللہ تعالیٰ احقر اور آپ دونوں کو حب فی اللہ کی زیادتی سے مزید سعادت مند فرمائیں۔

شاہراہ معرفت پر جو کچھ لکھا لکھایا تھا۔ وہ تو آپکی خدمت میں پہلے ہی ارسال ہو چکا ہے۔ اور امید ہے کہ واصل خدمت بھی ہو چکا ہوگا۔ باقی اب تو میرے پاس اسکی کوئی نقل وغیرہ بھی موجود نہیں ہے۔ ورنہ دوبارہ تعمیل ارشاد ہوتی۔ والسلام

مکرر صلاح و فلاح دارین کا دعا گو و دعا جو

احقر العباد عبد الباری

شدید صدمہ و قلق اس بات کا رہا۔ کہ حضرت موصوفؒ کی اس بیماری کی حالت میں بڑی تکلیف سے لکھی ہوئی تحریر بندہ تک نہ پہنچ سکی، تقدیر الٰہی میں یہی مقدر تھا کہ وہ شائع نہ ہو۔ یوں حضرت دریابادیؒ کی تقریظ کا یہ جملہ حقیقت بن گیا کہ:۔

"مشیئت کے اس فیصلہ کو اب کیا کہیئے کہ شعر پر "سکوت" تو "ہنر شناس" مولانا عبد الباری ندوی کے حصہ میں آیا اور تحسین اس "ناشناس" عبد الماجد کے حصہ میں پڑی"۔

تاہم بندہ کی خوش نصیبی ہے کہ رسالہ معارف اعظم گڑھ میں جب "سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر" کے عنوان سے سلوک سلیمانی یا شاہراہ معرفت کا پہلا نقش

چھپا تھا حضرت ممدوح قدس سرہٗ نے ازرہ نوازی و قدر افزائی کا خط لکھا تھا۔ وہ رقیمۂ بندہ کیلئے سراپا سرمایہ سعادت و برکت ہے۔ سلوک سلیمانی کے اس نقش ثانی میں اس مکتوب کو حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی یادگار اور تبرک سمجھ کر من وعن شائع کر رہا ہوں۔

حضرت استاذی المخدوم علامہ سید محمد یوسف بنوری قدس سرہٗ کی محبت، عنایت و شفقت اس سیاہ کار پر بے حد و حساب تھی۔ اپنی نالائقی کہئے کہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کو اپنی کتاب کا مسودہ دکھلانے کی ہمت نہ ہوئی، وصال سے چند دن پیشتر جب آخری بار غریب خانہ پر تشریف لائے تو تقاضا فرما کر کتاب کے کچھ صفحات سُنے محظوظ ہوئے تحسین و ہمت افزائی فرمائی حضرت دریابادیؒ مخدومی حضرت علی میاں مدظلہم کی کتاب پر تقریظیں سُنیں، بہت مسرت کا اظہار فرمایا۔ خصوصاً مولانا دریابادیؒ کے ان الفاظ پر تو جھوم اُٹھے جو سلوک تھانویؒ اور سلوک سلیمانیؒ کے بارے میں لکھے تھے۔

"غرض ایک چھوٹا آئینہ ایک بڑے آئینہ کے مقابل آگیا اور کمال و جمال کے جو بھی نقش اس بڑے آئینہ میں اُبھرے ہوئے موجود تھے وہ سب اس چھوٹے آئینہ نے اپنے اندر جذب کر لئے سمیٹ لئے، دیکھنے والا نادان حیران کہ جیبی حمائل کو چوب قلم جہازی سائز والے مصحف کا ہمسر کیونکر ٹھہرائے۔ لیکن یہ نہ مانیئے تو آخر کیا کیجئے ــــ تصویر کی تصویر کی مثلیت اصل صورت سے کیونکر جھٹلائیے!"

حضرت بنوری نور اللہ مرقدہٗ سے تقریظ کے بارے میں عرض کیا۔ دوسرے دن کراچی کو روانگی تھی۔ اپنے رفیق سفر ڈاکٹر مولانا عبدالرزاق اسکندر سے کہا کراچی میں مجھے یاد دلائیے تاکہ ان کی کتاب پر اپنی رائے لکھ کر بھیج سکوں، ڈاکٹر موصوف کو یاد نہ رہا۔ اور بارہویں دن حضرت بنوریؒ کا اچانک وصال ہوگیا، اور حضرت قدس روحہ کے کلمات طیبات سے یہ کتاب محروم رہ گئی وللہ ما اخذ وما اعطی

بندہ کا معارف والا مضمون جب "سلوک سلیمانی" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا تھا۔ اس میں حضرت الشیخ علامہ سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہٗ اور ان کے سلوک کے بارے میں مقدمہ میں چند ضروری باتیں لکھنی مناسب سمجھی تھیں۔ موجودہ کتاب اسی مضمون کی تفصیل و تکمیل ہے اس لئے اس مقدمہ کو بھی اس اشاعت میں دوبارہ شائع کر رہا ہوں۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے تربیتی خطوط اور ملفوظات کے علاوہ حضرت والاؒ کے ہر دور کی تحریر سے اس کتاب میں استفادہ کیا گیا ہے، کہ فقیر سمجھتا ہے کہ حضرت الشیخ قدس سرہٗ حضرت اقدس مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے تعلق سے پیشتر ہی سلوک سلیمانی کی نامعلوم کتنی منازل علماً و عملاً طے کر چکے تھے[1]؟

کتاب ۱۹۷۰ء میں تیار ہو چکی تھی، "مقدمات" بھی آچکے تھے۔ لیکن بعض مجبوریاں

---

[1] اس بارے میں 'سلوک سلیمانی کی اجمالی اشاعت کے مقدمہ میں بھی کچھ عرض کر چکا ہوں غرض یہ ہے کہ "سلوک سلیمانی" کی پیشکش میں حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی ہر دور کی تحریر جو آپ کے آخری مسلک کے مطابق اور مضمون کے متعلق ہو، قابل استناد ہے (م-ا)

حائل تھیں۔ کتاب اب تک نہ چھپ سکی، ہر بات کا وقت معین ہوتا ہے۔ خدا کرے یہ تاخیر اسکی افادیت وقبولیت میں زیادت کا سبب ہو۔ بصمیم قلب دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو مقبولیت خاصہ سے نوازے۔ اور اسے مرشدی ومولائی حضرت الشیخ علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہٗ کے علوم وتعلیمات، فیوض وبرکات کے عام ہونے کا ذریعہ بنائے اور فقیر کی صلاح وفلاح ونجاح کا سبب نیز آخرت، رضا کا وسیلہ اور سرمایہ آخرت ونجات بنائے۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ اور دیگر بزرگوں کی برکت سے اس کا فائدہ عام وتام ہمہ گیر وعالم گیر ہو اور ہر پڑھنے اور سننے والا کما حقہ اس سے مستفید ہو کر دارین کی سعادتوں سے بہرہ مند ہو۔ آمین۔

کتاب کا پہلا حصہ مقاصد وغایات، ارشادات ومعالجات پر مشتمل ہے جو حجم کی ضخامت کی وجہ سے دو مجلدات میں بفضلہ تعالیٰ شائع کیا جا رہا ہے۔ دوسرے حصہ یا تیسری جلد میں انشاء اللہ تعالیٰ مکتوبات وملفوظات وغیرہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام مراحل کو بعافیت طے کرائے کہ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی امانت قارئین تک پہنچ سکے۔ اس بے مایہ کی یہ کوشش اگر حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے علوم وفیوض کا کسی درجہ میں بھی اشاعت کا سبب بن سکے تو سمجھوں گا۔ کہ زندگی ٹھکانے لگی۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

آخر میں اپنے ان تمام خواجہ تاش کرم فرماؤں کا دلی شکریہ ادا کرنا اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتا ہوں۔ جنھوں نے حضرۃ الشیخ رحمہ اللہ تعالیٰ سے اپنے مکاتبت کے مستور ذخائر راقم کو بھیج کر اس قابل بنایا کہ حضرت والا قدس سرہٗ کے سلوک پر استناد و وثوق سے کچھ لکھ سکوں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو اس کا دارین میں صلہ نیک عطا فرمائے۔ آمین۔ ان میں سرفہرست

جناب عبدالرؤف صاحب اورنگ آبادی، برادر مختار احمد خان صاحب، جناب عبدالرحمان صاحب ایم۔ اے، جناب غلام مرتضیٰ صاحب، جناب محی الدین صاحب ہیں۔ برادر مشفق ڈاکٹر غلام محمد صاحب مدظلّہ کی کتاب تذکرہ سلیمان سے استفادہ بھی خوب کیا۔ اللہ تعالیٰ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس مسترشد خاص کو مع ہمہ فیوض و برکات سلامت رکھے۔ آمین۔

مولوی فضل حق ترنگزئی، ڈاکٹر برہان الدین، راشد میاں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے پورے ذوق و شوق و انہماک سے پروف ریڈنگ کا کام انجام دیا۔ کاتب کتاب محمد نعیم صدیقی صاحب اور ان سب دوستوں کا ممنون ہوں جنہوں نے کسی صورت اس بارہ میں اعانت فرمائی، وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین

فقیر الی اللہ تعالیٰ
محمد اشرف سلیمانی
پشاور یونیورسٹی۔ پشاور

یکم جمادی الثانی ۱۴۰۱ھ
۷ ر اپریل ۱۹۸۱ء

نامہ مبارک

۱۲/ جمادی الثانی ۵ء | ہارڈنگ روڈ لکھنو
۳-۲-۵۶ء

محبی فی اللہ زادکم اللہ حبا فی اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

"سلوک سلیمانی" کا "سلسلہ معارف" پڑھ کر خود ہی خیال آتا رہا تھا کہ خاتمہ پر انشاء اللہ مبارکباد پیش کرونگا کہ آپنے "الشیخ السید" علیہ الرحمۃ کی شیخ شناسی کا حق خوب خوب ادا فرمایا۔ مگر سلسلہ کے آخر میں آپ کا خصوصی حکم پڑھ کر معلوم ہوا کہ یہ قلبی تقاضا آپ ہی کے امر کا پیشگی عکس تھا۔ بہر حال امتثالاً عرض ہے۔

یہ ناکارہ جس طرح حضرت اقدس و اعلی رحمۃ اللہ علیہ کی تجدیدی جامعیت کا حضرت کی وفات کے بعد حضرت کے ملفوظی و تحریری "باقیات صالحات" کے مطالعہ سے معتقد ہوا اسی طرح حضرت سید کے شیخ کامل ہونے کا ان کی وفات کے بعد "سلوک سلیمانی" سے فاحسن اللہ جزاک۔

بس کبھی یکجائی کی سعادت نصیب ہوتی اور کسی طالب کو کچھ تربیۃً تحریر فرماتے تو اس نالائق کی طرف بڑھا دیتے کہ ٹھیک ہے؟ اس سے زیادہ مربیانہ سیادت سے استفادہ کا موقع نہ ملا تھا۔ لیکن ماشاء اللہ سلوک سلیمانی نے شان تربیت کا پورا مرقع سامنے کردیا۔ ہمارے ماجد میاں نے بھی تحریر فرمایا ہے کہ لفظاً بہ لفظ ارشادات تھانوی کی ترجمانی ہے۔ بلکہ احقر کی نظر میں حرف اور نقطہ نقطہ

اس ترجمانی کا حق ادا فرمایا ہے، اور یہی سچ پوچھئے تو سلوک سلیمانی کا ہر طرح سب سے بڑا کمال و جمال ہے۔ ایک فنائیت فی الشیخ کے اعتبار ہی سے دیکھئے کہ یہ تربیتی و مرشدانہ کمال ہما شما کو حاصل ہو تو کیا کمال، کمال تو حضرت مرحوم جیسے علوم کتاب و سنت کے کامل النظر کا ہے، کہ ان کو ارشادات مرشد میں کسی حرف و نقطہ کی کمی و بیشی کی گنجائش نظر نہ آئی جو خود مرشد کے حق میں شریعت و طریقت کے کمال جامعیت کی سب سے بڑی سند ہے۔

ماشاء اللہ غیب سے آپ کے احکام کی پختگی تعمیل تو خوب ہی خوب کرائی جاتی ہے عریضہ پورا ہی ہو رہا تھا کہ گرامی نامہ منت بخش ہوا پتہ تک لفافہ پر لکھا جا چکا تھا۔ انشاء اللہ کالج کے پتہ سے بھی مل ہی جائیگا۔ سید صاحب کی سوانح و سیرت کی تکمیل کیلئے کچھ معمولی اضافہ کے ساتھ سلوک سلیمانی کا یہ معارفی سلسلہ بالکل کافی ہوگا۔ ان افادات کا ان کو موقع ہی کم اور آخر عمر میں ملا۔ اسکی بجائے اگر قلم "اشرف" سے "اشرفی سلوک" کا ایک مرقع تیار ہو جاتے تو انشاء اللہ اپنی جامعیت و احاطت کی بدولت نہ صرف اصطلاحی شیوخ و سالکین سب ہی کیلئے بے بہا دولت بلکہ آپ کے جدید قلم کی روشنی میں باقاعدہ تربیت سے بدکنے والوں کے ہاتھ میں ایسی چیز پہونچ جائے گی کہ پڑھنے والے بطور خود بھی اپنی اخلاقی و باطنی اصلاح میں بشرط طلب فائدہ اٹھا سکیں گے۔

اس پر غور فرمائیں۔ والسلام

دعاگو اور اپنے حق میں خصوصیت سے حسن خاتمہ کی
دعا کا محتاج و طالب

احقر العباد عبد الباری ندوی

تحسین ناشناس

حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادی رحمہ اللہ تعالیٰ

کہتے ہیں کہ کسی زمانہ میں ایک بزرگ تھے۔ انہوں نے علم فقہ کا نہ کبھی باقاعدہ مطالعہ کیا نہ کسی فقیہہ کے درس میں شریک و شامل ہوئے۔ لیکن اپنے منچلے پن کے زور سے ایک پوری کتاب فقہ پر لکھ ڈالی!۔

جگ بیتی سے آپ بیتی کی طرف آئیے تو یہ سن لیجئے کہ ان سطور کے راقم آثم نے جو فن سلوک و تصوف کی ابجد سے کورا ہے اور مجاہدات و ریاضیات صوفیہ کے مبادی سے بھی بے بہرہ۔ وقت کے ایک مسلّم شیخ بلکہ شیوخ کے امام و سرخیل حضرت اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات و شخصیت پر ایک خاص ضخیم کتاب "حکیم الامت نقوش و تأثرات" کے نام سے تیار کرلی۔ اور اس محترم شخصیت کی مقبولیت ہی کا کرشمہ دیکھئے کہ حضرت کے خدام و مسترشدین تک نے اس بے ہنر کی بے کمالی کو سراہا اور داد سے اسے نوازا۔ کتاب کی عزت اسکی بساط اور اوقات سے بڑھ کر علامہ سید سلیمان ندوی ہی نے بڑھائی۔ اور اپنے ایک مکتوب میں داد خصوصی کتاب نویس کو ارقام فرمائی۔ البتہ اتنی احتیاط اس کم سواد نے بھی اس مجموعہ اوراق میں ملحوظ رکھ لی تھی کہ سلوک و روحانیت

لے جوہر شناس حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ نے ازراہ تواضع اپنے مقدمہ کا عنوان "تحسین ناشناس" باندھا تھا "تقریظ ماجدی" کے ان الفاظ میں فقیر تصرف کا حق نہیں رکھتا۔ لیکن ان کی شان میں اس عنوان کو سوءِ ادب سمجھتا ہے۔ (م-ا)

کے کسی مسئلہ میں اپنی ٹانگ نہیں اڑائی تھی۔ اور طریقت و معرفت کے کسی سوال پر اپنی زبان کی کترنی نہیں چلائی تھی۔

تو جس شخص نے حضرت تھانوی (اعلی اللہ مقامہ) کے سے یگانہ عصر و استاد فن پر اپنی کمند ڈال دینے میں ذرا باک نہ کیا جو تمام تر اپنے بزرگ و مقتدا ہی تھے تو اسے اپنا دست طلب حضرت سلیمان کے دامن تک پہنچا دینے میں کیا تامل ہو سکتا تھا۔ جو بزرگ بننے سے پہلے اس کے جلیس، رفیق، مہربان و شفیق سالہا سال رہ چکے تھے اور جن سے محبت و یگانگت، اخلاص و بے تکلفی کے گوناگوں رابطے شروع جوانی ہی سے قائم ہو چکے تھے اور علمی و ادبی رفاقت کے مرحلے اس وقت طے ہو چکے تھے۔ ہاں ایک عالم و ادیب مورخ و خطیب بن رہا تھا۔ دوسرا تشکیک و ارتیاب کی وادیوں میں بھٹک رہا تھا۔

سید صاحب جب تک ادیب و مورخ اسلام رہے اپنے شفیق و قدر شناس استاد مولانا شبلی کے ایسے ہم رنگ رہے کہ انہیں کے ہم سر ہم وزن و ہم مرتبہ ہو کر چکے اور دیکھنے والوں کو یہ فیصلہ مشکل ہو گیا کہ دونوں میں بلند مرتبہ کون ہے۔ پھر ان کا رجحان جب تصوف و سلوک کی جانب ہوا اور انہوں نے حضرت تھانوی کا دامن تھاما تو دیکھتے ہی دیکھتے رنگ انہیں شیخ کے قلم کا اختیار کر لیا۔ اور اتباع و اقتداء شیخ میں نمبر اکثر قدیم اور مدت العمر کے متوسلین اور خدام سے بھی لے گئے "شاہراہ معرفت" اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ اپنے کو شیخ میں ایسا فنا کیا کہ گویا کوئی فرق ہی باقی نہ رکھا۔ وہی امراض کی تشریح وہی اسباب کی تشخیص وہی علاج

وہی پرہیز وہی نسخے وہی تدبیریں اور طریقے۔ پڑھنے والا دنگ کہ اسے سلوک سلیمانی کہئے یا سلوک اشرفی ! ـــ من تو شدم تو من شدی کا ایک طرفہ نقشہ۔

حضرت تھانوی کا اصل اور بلند ترین کمال یہ ہے کہ اختیاری اور غیر اختیاری کی تفریق قائم کرکے جو اُلجھنیں صدیوں سے چلی آتی تھیں ان کا حل بات کی بات میں کر دیا۔

وہی خلوت و جلوت کے مراتب وہی محمود و مقصود کے درمیان فرق وہی اتباع و تقلید کے قیود۔ وہی مخصوص حالات میں عزلت نشینی کی اجازت۔ وہی طریق کی نزاکتیں اور ان کے مطابق مخالطت کے شرائط و قیود۔ وہی احکام الٰہی کے ماتحت دنیا میں پڑنے اور دنیا کے برتنے کے حدود۔ وہی آداب شیخ اور مقاصد بیعت و معیار بیعت وہی خوف و شوق۔ عبادت و حسن معاملت پر زور۔ وہی اخلاص و حسن نیت کی تاکید۔ وہی طالبوں کی دلجوئی تسکین و تشفی۔ وہی احکام شریعت پر استقامت کیلئے اصرار وہی ہر حال میں مولیٰ کی رحمت و ربوبیت پر تکیہ۔ حقیقی تصوف (جو صرف اتباع کتاب و سنت کا نام ہے) اس کے اور مروّجہ اور اصطلاحی تصوف کے درمیان وہی فرق۔ غرض ایک چھوٹا آئینہ ایک بڑے آئینہ کے مقابل آگیا۔ اور کمال و جمال کے جو بھی نقش اس بڑے آئینہ میں اُبھرے ہوئے موجود تھے۔ وہ سب اس چھوٹے آئینہ نے اپنے اندر جذب کر لئے۔ سمیٹ لئے دیکھنے والا نادان حیران کہ جیبی حمائل کو چوب قلم جہازی سائز والے مصحف کے ہمسر کیونکر ٹھہرائیے لیکن یہ نہ مانئے تو آخر کیا کیجئے ! ـــ تصویر کی تصویر کی مثلیت اصل صورت سے کیونکر جھٹلائیے۔

اور یہی معاملہ جو سید والاصفات نے اپنے شیخ کے ساتھ کیا تھا۔ مشیت نے خود اسکے ساتھ ایک خوش نصیب مسترشد کے ہاتھوں کرادیا — یہ نام کے "اشرف" کام کے لحاظ سے بھی اشرف ہی نکلے۔ اور جو دولت انہیں اپنے شیخ سے نصیب ہوئی تھی وہ انہوں نے وقف عام کردی اور پہلی جلد تو شاہراہ معرفت کی تیارہی کردی (اور خوب ہو کہ اس کا ایک عرف اشرف المعارف رہے) دوسری جلدیں عجب نہیں کہ اس سے بھی مفید تر ہوں۔ اللہ ہم کو اور سب کو ان سے استفادہ کی توفیق دے — مشیت کے اس فیصلہ کو اب کیا کہیئے کہ شعر پر "سکوت" تو "ہنر شناس" مولانا عبدالباری ندوی کے حصے میں آیا اور "تحسین" اس "ناشناس" عبدالماجد کے حصے میں پڑی۔

تعارف عارفی

عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب عارفی مدظلہم خلیفہ مجاز حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ

مکتوب نمبر ۱

ٹیلیفون نمبر ۶۰۷۱۹

محمد عبدالحیؒ عفی عنہ

بیت الاشرف ۸-ای۔ ۵ کمرشل ایریا
ناظم آباد، کراچی نمبر ۱۸ (پاکستان)

عزیز محترم المقام زاد اللہ درجاتکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کتاب سلوک سلیمانی موصول ہوئی دل مسرور ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمادیں۔ آپ نے بڑا مبارک کام سرانجام دیا۔ انشاء اللہ اہل ذوق۔ اہل فہم حضرات کو اس کا مطالعہ بہت نافع ہوگا۔ میرے دل میں جو محبت کے نقوش سلیمانی عرصہ سے دبے ہوئے تھے دفعتہً اُبھر آئے اور میرے تخیل و تصور میں بڑا کیف و سرور پیدا ہو گیا۔ حضرت سید صاحب قدس سرہٗ العزیز کا تعلق محبت میرے ساتھ بڑا گہرا تھا۔ جو میرے لئے سرمایہ ناز و وسیلہ نجات ہے۔ انشاءاللہ۔

میری بینائی میں عرصہ سے موتیابند کا اثر ہے، بہت دھندلا پن ہے۔ پڑھنے لکھنے میں تکلف ہوتا ہے۔ با این ہمہ سلوک سلیمانی کے حرف حرف میں ایسی جاذبیت معلوم ہوتی ہے کہ کتاب چھوڑنے کو جی نہیں مانتا۔

آپ نے مجھے یاد فرمایا۔ اور ہدیہ محبت عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمادیں۔ آمین

مجھے خیال آتا ہے کہ جن رسالوں میں حضرت سید صاحب رحمہ اللہ کی حضرت شیخ قدس سرہ العزیز سے مکاتبت شائع ہوئی ہے۔ وہ یکجائی رسالے آپکی فرمائش پر میں نے روانہ کیئے ہیں۔ اگر ان سے فراغت ہوگئی ہو تو واپس کر دیتے جائیں

تقریظ کیلئے یہ کتاب ایسی ہے کہ جس کو بھی طریقت و تعلق مع اللہ کے حصول کا خیال ہو وہ لفظا لفظا اس کا مطالعہ کرے اور تجدد و استحضار کے لئے برابر مطالعہ کرتا رہے۔

احقر محمد عبدالحیٔ عفی عنہ

۲۶ ذی الحجہ ۸۹ھ

۵ مارچ ۱۹۷۰ء

مکتوب - ۲

۵-۶-۹۲ھ / ۱۹-۶-۷۲ء ۷۸۶

محب محترم المقام زید مجکم فی اللہ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ ملا۔ حاجی عبدالسمیع صاحب سلمہ کے پاس بھی آپ کا خط آیا تھا۔ بندہ نے توکلاً علی اللہ آپ کی دونوں جلدیں سلوک سلیمانی کی ان کے حوالے کردیں ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ کسی معتبر ذریعے سے آپ کو مل جائینگی۔

مجھے بہت شرمندگی ہے۔ کہ کتابوں کے مطالعہ میں بہت نامناسب تاخیر ہوئی مگر میں اس معاملہ میں آپ کے صبر وتحمل کا بہت ممنون ہوں۔ اور میرے قلب پر آپکے خلوص ومحبت کا بہت زیادہ اثر ہے۔ کہ آپ نے کنایتاً بھی کبھی اس کے متعلق یاد دہانی نہیں کی۔ اور میرا ذوق یہ تھا۔ کہ میں اس کتاب کا ایک ایک لفظ مطالعہ کروں۔ کسی طرح ناتمام مطالعہ پر دل راضی نہ ہوتا تھا۔ جتنا پڑھتا جاتا تھا۔ شوق اور زیادہ شدید ہوتا جاتا تھا۔ پھر یہ بھی

خیال تھا کہ ایسی نادر معلومات اور تحقیقات اور پھر حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کے ساتھ حضرت علامہ سید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے خصوصی تعلقات کے حالات اس وقت جو مطالعہ کرنے کا موقعہ مل رہا ہے۔ پھر ملے یا نہ ملے۔ اور نہ ملنے کا امکان زیادہ ہی تھا۔ اس لئے کہ صحت کی خرابی، مشاغل کی زیادتی، ضعف دل و دماغ، سب روز افزوں ہیں۔ اس لئے بہت اطمینان سے اور توجہ غائر سے مطالعہ لفظاً لفظاً جاری رکھا۔ اس میں بہت بہت وقفہ کیلئے ناغہ بھی ہوتا رہا۔ بہرحال جب ختم کر چکا تو پھر جی چاہا کہ ایک سرسری مطالعہ کر ڈالوں۔ مگر اس کیلئے خوف تھا کہ اس قدر تاخیر ہو چکی ہے کہ مزید تاخیر کہیں گرانی طبع آن محترم نہ ہو۔ اس لئے اس کو واپس کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ اور آپ کی ان مساعی کو مشکور و شرفِ قبولیت سے سرفراز فرمائیں۔ آمین

آپ نے جو کچھ لکھا ہے۔ بڑی کاوش و دماغ سوزی اور بہت ہی غائر مطالعہ اور دقیق نظری کے ساتھ لکھا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس کی قدر ان لوگوں کو ہوگی جن کو سلوک و طریقت کی تشنگی ہو۔ یا جن کو حقائق و معارف و تصوف کا ذوق صحیح ہو اس میں مضامین تصوف بڑی جامعیت اور نافعیت کے ساتھ جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اور پھر مکاتیب حضرت حکیم الامۃ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت علامہ سید صاحب رحمہ اللہ سے تمام باطنی مقامات اور احوال کی سیرِ حاصل تشریح و وضاحت کی گئی ہے جس سے کتاب کی افادیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ میں تو اپنے لئے اسی قدر عرض کر سکتا ہوں۔ کہ مجھے تو اس کے مطالعہ سے بے حد نفع ہوا۔ جی چاہتا تھا کہ تمام مضامین دل و دماغ میں جذب کر لوں۔ اور اپنی روح کو ان کے کیف سے

مسرور و مخمور کرلوں۔ کاش مجھ میں اسکی صلاحیت واستعداد ہوتی بہرحال اس کے مطالعہ کا اثر رگ و پے میں جاری و ساری محسوس کرتا ہوں۔ اور آپ کے اس کارنامہ پر جو میری نظر میں علوم و فنونِ تصوف کا ایک یادگار شاہکار ہے۔ دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ظاہر و باطن کو اس تالیف کی تجلیات و انوار روحانی سے مجلیٰ و منور فرماویں۔ آمین ثم آمین

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ میں اس تالیف کیلئے کوئی تقریظ لکھ دوں۔ اس ناکارہ کے ساتھ یہ آپ کا حسن ظن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تو اس قسم کی ہر استعداد سے بالکل عاری ہوں۔ اس مہتم بالشان تالیف کے لئے میں کچھ عرض کرنا بھی اس کے مرتبہ کے لئے سوءِ ادب سمجھتا ہوں پھر اب ضعف دل و دماغ کی وجہ سے اور فقدان جذبات کی وجہ سے قوت اظہار سے بھی محروم ہوں اگر کبھی کچھ توفیق ہوئی تو انشاء اللہ اس سعادت کے حاصل کرنے کی بھی کوشش کرونگا۔ ورنہ اپنی مجبوریوں اور نااہلیت کیلئے معذرت خواہ ہوں۔ اور دعائے خیر کیلئے عاجزانہ مستدعی ہوں۔ فقط والسلام

احقر محمد عبدالحئی عفی عنہ

لکھنؤ
۲۹ اپریل ۷۱ء

محب گرامی منزلت زید لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عنایت نامہ مورخہ ۱۸؍ صفر ایک سفر سے واپسی پر ملا۔ آپ کے بخیریت اپنے مستقر پر واپس آنے سے خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ حج وزیارت قبول فرمائے۔ اور جو دعائیں آپ نے اس ناچیز کے حق میں کی ہیں انکی بہترین جزا عطا فرماتے۔

کتاب کا پیش لفظ ارسال کر رہا ہوں۔ نقل کر کے رکھ لیا ہے

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

والسلام۔

ابوالحسن علی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

از فرید العصر و مونس ملت حضرت علامہ ابوالحسن علی الندوی دامت برکاتہ

ناچیز راقم سطور کیلئے محب گرامی مولانا محمد اشرف خان صاحب ایم ۔ اے (صدر شعبۂ عربی اسلامیہ کالج پشاور) کی گرانمایہ تصنیف " شاہراہ معرفت یا سلوک سلیمانی" کے متعلق اظہار خیال کرنا کئی طرح سے سعادت و مسرت کی بات ہے۔ ایک تو موضوع کی اہمیت اور مقصد کی عظمت کے لحاظ سے کہ اس میں قلیل سے قلیل اور برائے نام حصہ لینا بھی ایک ایسے شخص کیلئے سعادت کی بات ہے جو اس "طب نبوی" کو مسلمانوں کی موجودہ مریض نسل کے لئے آب حیات و دارو ئے شفا سمجھتا ہے، دوسرے اس لحاظ سے کہ یہ کتاب ایک ایسی ہستی کی تحقیقات، اصلاح و تربیت کے اصول اور تعلیم و افادہ کی روشنی میں مرتب ہوئی ہے۔ جس سے اسکی حقیر ذات اور اس ادارہ کا جس سے اس کا انتساب ہے نہایت گہرے مخلصانہ اور نیاز مندانہ تعلقات ہیں، میری مراد حضرۃ الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سے ہے جن کا تعلق ندوۃ العلماء اور اس کے فرزندوں سے مربیانہ اور سرپرستانہ رہا ہے۔ اور جو اسکے منتسبین کیلئے فخر و نازش کا سب سے بڑا سرمایہ اور عزت و توقیر کا باعث ہیں۔

راقم کے خیال میں دو علم ایسے ہیں جن کی تجدید ہر زمانہ میں اور ہر نسل کیلئے ضروری ہے، وہ کبھی نئے تجربوں، زمانہ اور ماحول کی رعایت، طبیعتوں اور مزاجوں کے تغیر کی دیکھ بھال اور لحاظ اور زندگی سے بار بار رشتہ قائم کرنے سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔ ایک طب اجسام کا علم اور ایک طب قلوب کا علم یا دوسرے لفظوں میں ایک معالجۂ جسمانی، دوسرے معالجۂ روحانی کا علم، پہلے علم کا عرفی اور مشہور نام طب و حکمت (میڈیسن) ہے۔ اور دوسرے کا عرصہ سے تصوف نام پڑ گیا ہے، حالانکہ اس کا قرآنی نام تزکیہ (ویزکیھم) اور حدیث و سنت کی اصطلاح "احسان" ہے (ما الاحسان قال، ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ) اور بہت اچھا ہوتا کہ یہ علم انہیں دو ناموں سے موسوم ہوتا کہ بہت سے تنازعے اور شکوک و شبہات اسی سے ختم ہو جاتے اور بہت سی صلاحیت اور وقت ضائع ہونے سے بچ جاتا، بہرحال جیسا کہ خود حضرت سید صاحب نے ایک گرامی نامہ میں تحریر فرمایا ہے۔

"اصطلاحات تنازعہ کی چیز نہیں، اور ناموں کے اختلاف سے حقیقت نہیں بدلتی"

چنانچہ ان دونوں علوم میں تجدید کا جو عمل جاری رہا اور جس طرح ان کے ماہرین نے زمانہ کے تغیرات، ملک و قوم کے تنوعات، موسموں اور آب و ہوا کی تبدیلی، طبیعتوں اور مزاجوں کے فرق کی رعایت کی وہ ان دونوں علوم کی عہد بعہد کی کتابوں اور ان کی تاریخ سے واضح ہوتا ہے۔ اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اور جب تک یہ علوم یکسر اپنی افادیت، اور ان کے حاملین اپنی صلاحیت نہیں کھو دیتے جاری رہے گا۔

اسی طرح سے ان دونوں علوم میں ایک اور حقیقت مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ان دونوں علوم میں اجتہاد سے چارہ نہیں، ہر جسمانی معالج اور ماہرِ فن کو کسی نہ کسی درجہ میں اجتہاد سے کام لینا اور اپنے فن کی شاہراہِ عام سے اور اُس کے عام ضوابط و کلیات سے آزاد ہونا پڑتا ہے۔ اور بعض مرتبہ "عام قانون" سے ہٹنے کا خطرہ تک مول لینا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر وہ بعض مزمن امراض کا علاج اور بعض جاں بلب مریضوں کی مسیحائی کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا۔ یہی حال اخلاقی و روحانی معالج کا ہے کہ وہ مقلدِ محض بن کر مختلف الطبائع اور متنوع اور مختلف المزاج مریضوں اور پیچیدہ امراض کا علاج نہیں کر سکتا اور اس کو بار بار اپنے فن اور اس کے پیشواؤں کی نپی تلی راہ سے اپنا اور اپنی خداداد ذہانت اور اس فراستِ ایمانی سے جس میں بصیرتِ احسانی بھی شامل ہو گئی ہے، نیا نسخہ تجویز کرنا اور نیا مرکب تیار کرنا پڑتا ہے۔ وہ بعض اوقات اس فن کے مبتدیوں اور سطحی النظر لوگوں کو علاج بالمثل یا علاج بالسمیات نظر آتا ہے۔ لیکن وہ اُن مریضوں کے حق میں نوشدارو اور آبِ حیات بن جاتا ہے۔

طبِ قلوب و ارواح یا "فقہ باطن" یا تزکیہ و احسان کا یہ علم جس کو ہم مجبوراً تصوف کہتے ہیں۔ تجدید و ارتقا کے منازل سے برابر گذرتا رہا اور ہر دور میں اس میں اجتہادی شان بلکہ انقلابی فکر نظر آتی رہی، سیدنا عبدالقادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بہاء الدین نقشبند اور شیخ شہاب الدین سہروردی اپنے اپنے دور کے امام اور اس فن کے مجتہد مطلق تھے۔ ان کے بعد ہر ایک کے سلسلہ میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مجدد و مجتہد پیدا ہوتے رہے۔

جن کے ناموں اور کارناموں کی تفصیل اس علم کی مفصل تاریخ کا موضوع ہے، اور اس مختصر مضمون میں اجمالی طور پر بھی اس کا تذکرہ ممکن نہیں، اس سلسلہ میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی، حضرت سید آدم بنوری، حضرت سید احمد شہید، حضرت شاہ غلام علی اور دور آخر میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کا نام اس حیثیت سے لینا ضروری ہے کہ انھوں نے اپنے اپنے دور میں مقاصد کیلئے وسائل کے انتخاب، اجزاء سلوک میں حذف و اختصار اور اُس کو موثر و سہل بنانے اور مختلف تجربات کو باہم ملانے میں نمایاں اجتہاد سے کام لیا،

اِسی سلسلۃ الذہب کی ایک طلائی کڑی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی ذات تھی، وہ ایک طرف علوم دینیہ کے ایک متبحر اور راسخ العلم عالم تھے، دوسری طرف اُن کو ایسا زمانہ ملا جو نئے نئے تمدنی مسائل و مشکلات سے گرانبار تھا، زندگی کی مصروفیتیں بہت بڑھ گئی تھیں، قوائے جسمانی اور طبیعتیں کمزور اور سہولت پسند واقع ہوئی تھیں اور اس سب پر مستزاد یہ کہ تصوف اور سلوک سے ایک طرح کی وحشت اور خوف اور بعض تعلیم یافتہ طبقوں میں انکار کا رجحان پایا جاتا تھا۔ اس سب کا تقاضہ تھا کہ جو شخص اس زمانہ میں اصلاح و تربیت اور اس "طب نبوی" کی اشاعت و حفاظت کیلئے منتخب ہو وہ ان تمام حقائق سے واقف اور اُس پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ وہ اپنی مجتہدانہ صلاحیت سے اس علاج و معالجہ کو سہل، عمومی، ہر طبقہ کیلئے قابل عمل اور باعث کشش بنا دے اور اس میں

ایک ایسی نئی روح پھونک دے کہ اسکا "مطب" مرجع خاص و عام بن جائے اور وہاں صرف دوا سے نہیں بلکہ غذا سے بھی، شدید پرہیز نہیں بلکہ وسعت و رعایت سے بھی اور قیمتی مرکبات سے نہیں بلکہ روزمرہ کے مفردات اور پیش پا افتادہ چیزوں سے بھی پیچیدہ امراض کا علاج ہوتا ہو، اس کو انسانی نفسیات و طبائع اور مرض و مریض کے تغیرات کا ایسا وسیع علم اور تشخیص و تجویز کا ایسا ملکۂ راسخہ عطا ہو کہ وہ چٹکلوں اور چٹکیوں میں بڑے بڑے مریضوں کا علاج کر دیتا ہو، یہ حکیم الامت کے مطب کی خصوصیات ہیں جن کی تصدیق تربیتہ السالک، امداد السلوک وغیرہ کے صفحات اور حکیم الامت کے مکتوبات سے بخوبی ہو سکتی ہے،

یہ بھی اللہ تعالٰی کی خاص حکمت و رحمت کا کرشمہ تھا کہ حضرت مرحوم کو اپنے آخری دور میں دو ایسے شارح و ترجمان اور اُن کے طریقۂ علاج اور اُن کے ذوق و مزاج کے دو ایسے رمز شناس ملے جنہوں نے حضرت کے مضامین عالیہ اور نکات و تحقیقات کو اس دور کی نئی زبان اور علمی و ادبی پیرایۂ بیان میں ادا کرنے کی خدمت انجام دی اور اسکو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کیلئے زیادہ قابل فہم اور قابل استفادہ بنا دیا اس حیثیت سے بھی مولانا مرحوم اپنے معاصرین میں امتیازی شان رکھتے ہیں کہ ان کو ایسے بنے بنائے، کہنہ مشق اور صاحب طرز مصنف و اہل قلم مل گئے جو قسمت ہی سے کسی کو ہاتھ آتے ہیں، میری مراد مولانا عبد الباری صاحب ندوی اور مولانا سید سلیمان صاحب ندوی سے ہے۔ اول الذکر نے تجدید تصوف و سلوک کی کتابیں لکھ کر اور ثانی الذکر نے اپنے مکاتیب اصلاح و تربیت

اور چند نہایت باصلاحیت صاحب قلم اور مخلص مریدوں کو تیار کر کے (جن میں مولوی غلام محمد صاحب حیدر آبادی بی۔ اے اور اس کتاب کے مصنف مولانا محمد اشرف خانصاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں)۔ مولانا کے اس طرز اصلاح اور تجدید تصوف وسلوک کو اور زیادہ مقبول و وسیع بنا دیا۔ نئی تعلیم یافتہ اور علمی و ادبی ذوق رکھنے والی نسل کو ان بلند و عمیق مضامین و مقاصد سے مانوس کرنے میں مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کے مضامین اور انکی کتاب "حکیم الامت" (نقوش و تاثرات) کا بھی بڑا حصہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا اپنے خاص بندوں کے ساتھ معاملہ عجیب و غریب ہے حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ بہت آخر میں اور جیسا کہ انھوں نے اپنے شعر میں کہا ہے کہ بہت دیر سے اور بہت دور سے حضرت تھانوی کی خدمت میں پہنچے تھے۔ لیکن یہ دوری اور دیر حاضری اُن کے حق میں ذریعہ بعد نہیں، بلکہ ذریعہ قرب اور وسیلۂ محبوبیت ثابت ہوئی وہ خلوص وطلب کی جو گرمی، طبیعت کی بے چینی اور روح وقلب کی تشنگی لیکر گئے تھے۔ اُس نے سالوں اور مہینوں کی مسافت ہفتوں اور دنوں میں طے کرادی اور انہوں نے صحبت شیخ میں محبت و فنائیت کے "رطل گراں" نوش کئے اور بہت جلد شیخ کی طرف سے اعتماد و استناد کا وہ تمغہ پایا جس کے انتظار میں لوگ مدتوں رہا کرتے ہیں اور بڑے بڑے ہفتخواں طے کرتے ہیں اور شیخ نے اُن کی مدح و توصیف اور تصدیق و توثیق میں ایسے اشعار کہے جو ہر مرید کے لئے قابل صد ہزار نازش و افتخار ہو سکتے ہیں، "وذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء" پھر یہ کہ ان کو اپنے شیخ کے بعد اُن کے علوم و افادات کی اشاعت

کے لئے جو زمانہ ملا وہ اُن کی عمر کے لحاظ سے بھی اور ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے بھی بہت نازک دور اور انتشار کا زمانہ تھا۔ وہ پاکستان پہنچے تو نہایت دل شکستہ اور افسردہ تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ اُن کو مولانا محمد اشرف خان صاحب کی صورت میں ایک ایسا مرید رشید اور عاشق صادق عطا فرمادیا جو اسی طرح سے اُن کے علوم و افاوات کا شارح اور اُن کے طریقۂ تربیت کا حامل بن گیا۔ جیسے وہ اپنے شیخ اشرف کے علوم و افادات کے شارح اور اُن کے طریقۂ اصلاح و تربیت کے حامل تھے اور اس کا نمونہ یہ کتاب ہے جو اپنے ابتداء و انتہا کے لحاظ سے "صحیفۂ اشرفی" اور اپنے وسط اور واسطہ کے لحاظ سے "صحیفہ سلیمانی" کہلانے کی مستحق ہے۔ اس کتاب کا تانا بانا حضرت سید صاحب کے خطوط کے اقتباسات اُن کی مجلس کے افادات اور اُن کی تصنیفات کے منتخب مضامین سے تیار ہوا ہے، اب وہ دورِ حاضر کے لئے تصوف کے تعارف کا ایک ایسا ذریعہ بن گئی ہے جس سے ان ذہنوں کی تشفی کی بھی اُمید ہے جن کو تصوف کے منہاج نبوی سے منحرف ہونے کا بار بار شبہ ہوتا ہے۔ اور وہ قدیم اصطلاحات اور تصوف و سلوک کی پرانی "ٹیکنک" سے متوحش ہیں، ساتھ ہی ساتھ اسکو مولانا اشرف خان صاحب کا فطری جوہر کہیے یا سید صاحب کی ارادت و صحبت کا فیض کہ تحریر کی شگفتگی اور شیرینی کہیں ساتھ نہیں چھوڑتی، یہ دراصل علامہ شبلی کی وہ میراث ہے جس سے نہ مولانا عبدالباری صاحب ندوی اپنی کامل اشرفیت و تقشف کے باوجود۔ آزاد ہوسکے اور نہ سید صاحب اپنی کامل فنائیت اور طبیعت کی افسردگی کے باوجود۔

۔ اس طرح اُمید ہے کہ یہ کتاب ایک بڑے طبقہ کیلئے قابلِ مطالعہ و استفادہ ہوگی اور وہ اسکو دلچسپی کے ساتھ پڑھے گا۔ جو تصوف و حقائق کی عام کتابوں کے پڑھنے سے گھبراتا ہے اور اُن کی زبان اور طرزِ بیان سے مانوس نہیں، اس کیلئے یہ بات بھی موجبِ اطمینان ہے کہ اس کتاب کا مصنف اسی نسل اُسی طبقہ اُسی ماحول سے تعلق رکھتا ہے جس سے اُس کا تعلق ہے اور نہ صرف تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ اپنی ممتاز علمی صلاحیتوں اپنے طویل تعلیمی تجربے اور علمی و تصنیفی ذوق کے لحاظ سے ایک بلند مقام پر فائز ہے، خدا سے دُعا ہے کہ اِس کتاب سے زیادہ سے زیادہ نفع پہنچائے اور اس کو حضرت سیّد صاحب رح کے باقیاتِ صالحات اور مصنف کے فضائل و قربات میں شامل فرمائے۔

ابوالحسن علی ندوی
دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
۲۹ اپریل ۱۹۷۱ء

مقدّمہ

محققِ شہیر، فاضلِ کبیر، متکلمِ عصر، شیخِ وقت حضرت سید الملۃ علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہٗ ان نادرۂ روزگار ہستیوں میں سے تھے، جو قرنوں میں پیدا ہوتی ہیں اور ان کی آمد عالم کے لیے بہارِ تازہ کا پیغام لاتی ہے۔

سالہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

ان کا وجود اپنے گوناگوں فضائل و کمالات، جامعیت و برکات، علوم و معارف، خدماتِ دینی و ملّی کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک مستقل نشانی، اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجازِ خاص تھا۔ آپ کی جلالتِ شان، عظمتِ دینی، فضیلتِ علمی، نزہتِ اخلاقی، رفعتِ عرفانی اور خدمتِ ملّی سے کون ناواقف ہے، عصرِ حاضر میں جامعیتِ علوم میں اپنی مثال آپ تھے۔

علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا یہ فرہاد[1]، نہ صرف خالص دینی علوم قرآن و تفسیر حدیث و فقہ تصوّف و کلام اور سیرت میں امامت و سیادت کا مقام رکھتا تھا بلکہ اس کی ہمہ گیری قدیم معقولات کے دفتر اور جدید معاشرتی و نظری علوم

---

[1] علامہ اقبال نے اپنے ایک مکتوب میں سید صاحب کو لکھا تھا علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے۔ اقبال نامہ ج ۱ ص ۱۲۰، ۱۲۷

کے معتدبہ حصہ کو اپنے پہلو میں سمیٹے ہوئے تھی ۔ وہ تاریخ اسلامی وعلوم ملی کے دقیقہ رس، باریک بیں، رمز آشنا اور وسیع النظر مورخ تھے، علوم وفنون اسلامیہ کے گوشے گوشے پر ان کی گہری نگاہ، اور ان کی ارتقائی منازل وتاریخی مدارج پر عمیق نظر تھی، مختلف ادیان وملل کی تاریخ پر ان کی محرمانہ نگاہ تھی، اسلامی تاریخ پر وہ حجت تھے، قرآنی علوم پر انکا مطالعہ انتہائی وسیع گہرا متنوع اور اچھوتا تھا۔ وہ ایک ناقد، بصیر اور متبحر محدث تھے، علوم حدیث کی جملہ شاخوں علل واسماء ورجال وغیرہ پر ان کی عمیق نظر تھی، فقہ اسلامی کے مختلف مسالک ومذاہب کا علم وفہم حیرت انگیز تھا۔

آپ بے مثل ویگانہ سیرت نگار تھے۔ فن سیرت نے ان سے جلا پائی، اور ان کے جواہر سیرت پاک سے چمکے۔ وہ اس فن کے مسلّم امام ومجتہد تھے، آپ نے سیرت کو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ، سوانح اور کام وپیام وتعلیمات اسلامی کا دائرۃ المعارف بنادیا۔ اور اس شرف میں پوری تاریخ اسلامی میں ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ

سید الملۃ متکلم وقت تھے۔ اور عصر حاضر کے پرشور وپرکار، دور رس وجہانگیر فتنہ مغرب کے دقیقہ رس ناقد، اور اس کے عمیق ودقیق علمی واستشراقی ذہنی وسیاسی، دجل وفریب کے رمز آشنا مبصر، دار المصنفین کے اس زاویہ نشین درویش نے اسلام پہ تاریخ کے سب سے زیادہ کاری وموثر حملوں کا جواب جس بے جگری، جرأت وہمت، دانشوری وحکمت، سنجیدگی ودانائی گہراؤ اور بصیرت کے ساتھ دیا: اور اسلام کے عقائد واقدار اور علوم کی حفاظت کی، اس کی نظیر پورے عالم اسلامی میں نہیں ملتی۔

سلیمانؒ وقت کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی وہ علمی و تحقیقی و نظری فتوحات ہیں، جس نے فریب دانشِ حاضر کے تار و پو کو بکھیر کر رکھ دیا اور مسلمانوں کی متزلزل علمی صفوں کو ثبات بخشا اور اسلام کے درخشندہ چہرہ سے گرد و غبار کے توبرتو پردوں کو ہٹا کر ان کی تابشوں سے زمان و مکان کے لیے روشنی کا سامان بہم پہنچایا. ایک دور افتادہ بستی کے ایک معمولی جھونپڑے (دار المصنفین) کو اسلامی علوم و معارف، فکر و دانش اور دین خالص کا مرکز اور سلف صالحین کے نظریات و مسلک کا اعظم گڈھ، مضبوط قلعہ (حصن حصین) بنا دیا جو سلیمانی عَلَم کے زیر سایہ اسلامی علوم و فنون کی برسہا برس تک بے لوث و متحیر کن خدمات بجا لاتا رہا، جس کی تحقیقی و علمی عظمت و شوکت کا اعتراف یگانوں اور بیگانوں نے برملا کیا،

سیّد صاحب زباندان تھے. عربی و فارسی کے وُہ متبحر عالم تھے، اُردُو کے بلند پایہ صاحب طرز ادیب اور سید المصنفین تھے. عبرانی انھوں نے سیکھی تھی، انگریزی وُہ اچھی طرح پڑھ اور سمجھ لیتے تھے. فرانسیسی سے (بقول مسعود عالم مرحوم) وُہ آشنا تھے، ان کی عربی سلاست، بے ساختگی و برنائی میں سہل ممتنع کا حکم رکھتی تھی.

وُہ شاعر تھے، اور اُردُو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں اچھے اشعار کہہ لیتے تھے. وُہ مدیر تھے اور ان کی ادارت نے مختلف ادوار میں الندوہ، الہلال، اور معارف جیسے بلند پایہ اور عہد آفریں رسائل کو علوم و معارف، تحقیق و دانش کے گوناگوں افادات سے منوّر کیا، اور بدر کامل و مہر منیر بنایا، جس کے اثرات

برصغیر ہند و پاک کی علمی و ادبی تاریخ پر انمٹ اور دائمی ہیں۔ ان کی پچاس سالہ تصنیفی زندگی نہ صرف بلند پایہ محققانہ مستقل تصانیف پر مشتمل ہے بلکہ انہوں نے پچاسوں علمی و تحقیقی، دینی و ادبی، لسانی و تاریخی مقالات لکھے، خطبات پڑھے مقدمات ترتیب دیے۔ جن میں سے ہر ایک مستقل علمی کارنامہ اور حکمت و دانش دقت نظری، دقیقہ رس، گہراؤ و گیراؤ اور معلومات کا بیش بہا گنجینہ ہے۔ وہ پیدائشی صوفی تھے، بچپن میں اپنے بڑے بھائی سے اکتساب فیض کیا اور آخری عمر میں شیخ الکل مجدد الملۃ حضرت اشرف علی تھانویؒ نور اللہ مرقدہٗ کے تعلق کے بعد یہ باطنی نور شعلۂ طور بن کر چمکا، اور اس کی ضیا پاشیوں سے بزم سلوک مطلع انوار تھی۔ (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے)

غرض سید الملۃ، علم و دانش کے اس مقام پر فائز تھے، جس کا تصوّر بھی بہت سے دانشوروں کی ذہنی دسترس سے بالا ہے، تحقیق و جامعیت اور وسعت و عمق علوم میں پورے عالم اسلامی میں ان کی نظیر نہیں تھی۔ وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے ہمہ جہتی عالم تھے۔ اس صدی کے عظیم مفکر و حکیم شاعر علامہ اقبال مرحوم نے سچ کہا ہے:

"آج سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں، وہ عالم ہی نہیں، امیر العلماء ہیں، مصنف ہی نہیں رئیس المصنفین ہیں، ان کا وجود علم و فضل کا ایک بہتا دریا ہے جس سے سینکڑوں نہریں نکلی ہیں، اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں۔"

ان کے محبوب شاگرد سید مسعود عالم ندوی مرحوم لکھتے ہیں :۔

" سید صاحب کا علمی مقام بلند تھا اتنا بلند کہ وہاں تک بہتوں کا طائر خیال بھی پرواز نہ کر سکے ۔ ان کی جامعیت تو اس دور میں اپنی نظیر نہیں رکھتی ۔ میری نگاہ میں اس دور کے تمام اہل علم و اہل نظر ہیں ۔ صرف ہندوستان کے نہیں بلکہ دوسرے مسلمان ملکوں کے بھی ، اگر یہ واقعہ ہے کہ کوئی شخصیت علم و فن کے گوناگوں شعبوں کی ایسی جامع نظر نہیں آتی " (ماہنامہ چراغ راہ اپریل ۱۹۵۴ء)

مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی اپنے فقید المثال استاذ کا تذکرہ کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں :۔

" اس دور میں وہ جامعیت علوم کی تنہا مثال تھے ، ان میں ابن رشد و ابن خلدون ، ابن تیمیہؒ ، ابن قیمؒ ، غزالیؒ و رومیؒ ، شاہ ولی اللہؒ و مجدد سرہندیؒ کے کے علمی جلووں کی جھلک یکجا نظر آتی تھی ، اس لیے ان کی تحریروں سے مسلمانوں کو جس قدر فیض پہنچا ، اس کی مثال اس زمانہ میں کمتر ملے گی " (معارف سلیمان نمبر)

پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں :۔

" حسب نسب ، علم و فضل ، اخلاق و عادات خدمتِ ملک و ملت کے اعتبار سے سید صاحب کا درجہ بہت اونچا اور پورے طور پر مسلم ہے ۔ جہاں تک میری معلومات ہیں ، سید صاحب کی تعلیم و تربیت پرانے استادوں اور بزرگوں کے سایۂ شفقت اور پرانی فضاؤں میں ہوئی تھی ۔ جدید علوم و فنون سے براہ راست انہوں نے کسی سے استفادہ نہیں کیا تھا ۔ لیکن نئے افکار اور نئے طور طریقوں سے انہوں نے اپنے آپ کو اس خوبی اور خاموشی سے آشنا کر لیا تھا کہ وہ کہیں اجنبی نہیں معلوم

ہوتے تھے. چاہے وہ اہل علم کا طبقہ ہو، چاہے ارباب سیاست کی مجلس، خواہ طالب علموں کی جماعت ہو، خواہ عامۃ الناس کا اجتماع جدید افکار و رجحانات سے کوئی کتنا ہی آشنا کیوں نہ ہوتا، سید صاحب سے تبادلۂ خیالات کرنے میں اسے کبھی یہ محسوس نہ ہوتا، کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہا ہے جس کی معلومات روائتی ہیں، یا جس کا ذہن بندھے ٹکے خانوں میں اسیر ہے یا جس کے فکر و نظر کا دائرہ تنگ ہے. علی گڑھ میں جدید ترین افکار و اطوار سے مسلح اور مرصع نوجوانوں کو میں نے دیکھا کہ خالص علمی اور ذہنی سطح پر مولانا کی ہم سری نہ کر سکتے تھے، اور ہمیشہ یہ ہوا کہ وہ سیدؒ صاحب سے کچھ سیکھ کر ہی واپس گئے۔" (معارف سلیمان نمبر)

اس علمی شغف و اشتغال اور عرفانی مزیت و کمال نے سید الملۃ کو ملی خدمات کے علمی میدان سے یکسو نہیں کر دیا تھا. بلکہ اس جواں ہمت اور نادرۂ روزگار بطل جلیل کا میدان تگ و تاز ہند سے برطانیہ و فرانس کے استعماری ایوانوں تک اور گنگا و جمنا تاپتی و کاویری کے کناروں سے رودِ قلزم بحیرہ روم اور بحر ظلمات کے ساحل تک محیط تھا.

مسجد کانپور کا خونچکاں، مشہد اکبر، اس کے اشہب قلم کا انتہائی کارنامہ نہ تھا بلکہ اس کا رہوار عزم مسجد اقصیٰ، بیت الحرام اور حرم نبوی کی حرمت کے لیے عرب و عجم، ہند و یورپ میں پیہم رواں دواں رہا. خلافت اسلامیہ کے سقوط و الغا سے عالم اسلام پر جو دور رس بپتا پڑی، اس کے مداوا کے لیے حضرت سلیمان ندویؒ کی علمی و عملی خدمات کسی سے کم نہیں، دینی تقاضوں اور ملی سرگرمیوں کے لیے ہمالیہ

کی ترائی اور بنگال و مدراس سے لے کر وہ افغانستان و حجاز، مصر و روم سوئزرلینڈ و اقصائے یورپ تک کے سفر کی صعوبتیں جھیلتے رہے۔ بیسویں صدی کے پہلے پچاس سالوں میں برصغیر ہند و پاک میں شاید ہی مسلمانوں کی کوئی مفید علمی و دینی، سیاسی و ملکی ادبی و ذہنی تحریک اٹھی ہو جس میں سید صاحبؒ کی رہنمائی و اشتراک کا حصہ کسی نہ کسی صورت میں نہ پایا جاتا ہو۔ اس وجہ سے بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی "ان کی علمی، مذہبی، قومی، تہذیبی خدمات اس صدی میں اتنی زیادہ اور اتنی گرانمایہ تھیں کہ کسی ایک شخص کی نہ تھیں" (معارف سلیمان نمبر)

حضرت سید الملۃ کی مختلف الجہات اور بوقلموں خدمات کا اندازہ ان کے چالیس سالہ صدیق حمیم و رفیق قدیم صاحب صدق مخدومی حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہ کی مندرجۂ ذیل عبارات سے کیجئے۔

"سید الملۃ محض ایک صوفی صافی اور مرشد طریقت کب تھے، دنیا کے سامنے تو وہ ۴۰، ۴۵ سال تک بیسیوں مختلف حیثیتوں سے پیش ہوتے رہے، ایک عالم دین، ایک مورخ، ایک مقرر و خطیب، ایک ادیب، ایک مناظر، ایک معلم و مدرس، ایک سیاسی و ملی کارکن، ایک معزز روزنامہ کے ایڈیٹر، ایک بڑی دینی درسگاہ کے ناظم، ایک بڑے تصنیفی ادارہ کے روح رواں، ایک شاعر، ایک ناقد یونیورسٹیوں کے ممتحن، فلاں فلاں کمیٹیوں کے ممبر، فلاں مجلس کے صدر، فلاں کے سیکرٹری وغیرہ وغیرہ، اور پبلک مسائل پر ہزارہا فقرے ان کے قلم و زبان سے ادا ہوئے ہیں" (صدق جدید لکھنؤ ۸ جولائی ۱۹۶۰ء)

"سید صاحبؒ نرے صوفی صافی اور مرشد طریقت نہ تھے، ادیب، انشاپرداز،

خطیب، مناظر، ایڈیٹر، مورخ، مدرس معتمد دارالعلوم ندوہ، ناظم دارالمصنفین اور کتنی ہی کمیٹیوں اور مجلسوں کے صدر، ناظم و رکن رہ چکے تھے، اور یہ سلسلہ آخر تک بالکل منقطع نہیں ہوا تھا" (صدق جدید لکھنؤ ج ۱۰ نمبر ۲۶)

غرض سید الملۃ اپنی ذات میں ایک دبستان، ایک انجمن، ایک امت اور ایک دور تھے، اور علم و عمل کے فضائل و کمالات کا حیرت انگیز و نادر مجموعہ اور نمونہ، وہ صرف مورّخ نہ تھے وہ خود تاریخ تھے، اور مسلمانان ہند و پاک کے پچھلے دور کی ایک عظیم ترین شخصیت —— ایک جامعہ علم، ایک دائرہ فضیلت، ایک مدرسۂ فکر ایک مرکز عرفان، ایک قندیلِ معرفت، ایک چراغ ہدایت، ایک مینار رشد و روحانیت

وَقَدْ جَمَعَ الرَّحْمٰنُ فِيْكَ الْمَعَانِيَا　　يُدِلُّ بِمَعْنًى وَّاحِدٍ كُلُّ فَاخِرٍ

اَنْ يَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِيْ وَاحِدٍ　　وَلَيْسَ عَلَى اللّٰهِ بِمُسْتَنْكَرٍ

دودمان نبوّت کے اس گوہر شب چراغ اور نابغہ وقت کے علوم ظاہری اور ملکی و ملّی خدمات اس قدر تابندہ اور پرشکوہ تھیں کہ ان کی جلوہ سامانیوں میں ان کی شخصیت کا باطنی و روحانی پہلو نگاہوں سے مدتوں پوشیدہ رہا، اور حضرت سید الملۃ کے جواہر باطنیہ کے جمال و کمال کو عام لوگ نہ پا سکے۔ لیکن جو حضرات حضرت والا رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ کی سیرت پاک اور بے داغ زندگی اور رجحان طبعی اور میلان قلبی سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اندر ہی اندر روحانیت کا شرارہ سلگ رہا ہے اور وہ عمر کی پختگی کے ساتھ روشن سے روشن تر ہوتا جاتا ہے، آخر وہ وقت آیا کہ ہر کہ و مہ نے دیکھا کہ عقل و دانش اور علم و حکمت کا امام عشق و محبت اور معرفت و عرفان کے مقامِ سیادت و قیادت

پر فائز تھا، اور بیک وقت علم و معرفت کی دونوں اقلیمیں اس کے زیرنگیں تھیں

بات یہ ہے کہ معرفت کا فطرتی جوہر جو ازل میں قلب سلیمانی میں ودیعت کردیا گیا تھا[1] اس کی حفاظت و نگہبانی اور اس کے ظہور کے سامان حکمت الٰہی بتدریج کرتی رہی، اور آخرش اس نور مبین نے عالم کو بقعۂ نور بنا دیا۔

دیدمش خرم و خنداں قدح بادہ بدست — واندراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد
گفتم ایں جام جہاں بیں بتو کدام داد حکیم — گفت آں روز کہ ایں گنبد مینا می کرد

حضرت الشیخ قدس سرہ کے "سیر سلوک" کا جو "راستہ" مربی حقیقی نے ازل میں مقدر فرمایا تھا، عالم ناسوت میں اس کے ظہور کے جو نشانات ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید الملۃؒ کے عارفانہ جوہر کی نگہبانی و حفاظت، تربیت و نشوونما ہر دور میں کرائی جاتی رہی۔ معرفت کا جوہر پاک اندر ہی اندر اپنی ارتقائی منازل طے کرتا رہا۔

شیخ الکل حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کا تعلق اس تدریجی ترقی کا منطقی اور فطرتی نکتۂ کمال تھا، جس نے اندرونی صلاحیتوں اور باطنی جواہر کو روز روشن

---

[1] ایمان و یقین کے خزینہ کا وہ جوہر پاک جسے توحید و معرفت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اس کا تخم روز الست میں ہی انسانی قلوب کی گہرائیوں کے سپرد کیا گیا تھا۔ "ان الامانۃ نزلت فی جذر قلوب الرجال" (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری و مسلم ص ۴۹۱) (توحید کی امانت لوگوں کے دلوں کی جڑ میں اتری ہے) اس حقیقت کی نبوی خبر ہے، یہی بیج بطن مادر میں سعادت کے نام سے جنین کی جبین کا نور بنتا ہے۔ اور عالم ناسوت میں اس کی روحانی استعدادوں کے فروغ کا ذریعہ ہوتا ہے حکمت الٰہی جب چاہتی ہے انسانی دل کی اس ایمانی استعداد کو سنوارتی، نکھارتی ابھارتی اور چمکاتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات یہ ذرۂ نور آفتاب کامل بن کر نگاہوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔ ——— (م-ا)

کی طرح سب پر ظاہر و نمایاں کر دیا ؎

بادِ صبا ز حالِ ما کہ نقاب بر داشت　　کَالشَّمْسِ فِیْ ضُحَاهَا تَطْلُعُ مِنَ الْغَمَامَ

(حافظؒ)

اس اجمال کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ حضرت سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جس خانوادہ کے چشم و چراغ تھے ، اس میں پشت ہا پشت سے علم و حکمت کی فراوانی اور عرفانی ذوق و مزایا کی ارزانی تھی آپ کے والد ماجد جناب حکیم سیّد ابوالحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور بڑے بھائی حکیم ابوحبیب صاحب دونوں صاحبِ نسبت صوفی تھے ، جن کا حلقہ ارشاد و تربیت قائم تھا ، ان دونوں بزرگوں کی توجہات بچپن اور ابتدائے جوانی میں سیّد صاحب کی ظاہری تعلیم و تربیت کے علاوہ قلبی و باطنی صفائی و تزکیہ اور اصلاح کی طرف مبذول رہتی تھیں ، سیّد الملّۃ اپنے آخری دور میں اپنے شیخ حضرت تھانویؒ کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"میرے والد صاحب مرحوم ابوالعلائی طریقہ کے شیخ تھے ، اور بھائی مرحوم مجدّدی حضرت شاہ ابواحمد صاحب بھوپالی کے مرید و خلیفہ تھے ، بچپن میں ان دونوں بزرگوں نے اپنے حلقہ میں شامل کیا ، والد صاحب ذکر جہری معروف کراتے تھے بھائی صاحب مرحوم توجہ دیتے تھے اور مراقبہ کراتے تھے ، مگر بچپن تھا قدر اس نعمت کی نہ ہوئی ."

لیکن واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی شفقت و توجہ نے جس تخم معرفت کی آبیاری کی تھی ، وہ ضائع نہیں ہوا اور اپنے وقت پر معرفت

کا یہ بیج شجر طیبہ بن کر اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ کا مصداق بنا، ابتدائی زندگی کا شرر نور آخر میں چراغ طور بن کر روشن ہوا۔

حکیم سید ابو حبیبؒ صاحب کی تربیتی توجہ کا ایک اور واقعہ قابلِ ذکر ہے حکیم صاحب اپنے گاؤں کی عورتوں کی اصلاح کی غرض سے ننھے سلیمانؒ سے تقویۃ الایمان کی قرأت کراتے اور پس پردہ خود بیٹھ کر اس کی تشریح و توضیح فرماتے جاتے اس طرح حضرت سیّد صاحب اپنے بھائی صاحب کی نقشبندی توجہات اور تقویۃ الایمان کی ایمانی قوّت سے فیض پاتے رہے اور بھائی کے اس حکیمانہ طرز نے سیّد صاحب کو عقائدِ حقہ اور ایمان کی وہ پختگی بخشی جسے خیالات و افکار کا کوئی سیلاب بہا نہ سکا۔ سیّد صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"یہ پہلی کتاب تھی جس نے مجھے دین حق کی باتیں سکھائیں اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسیوں آندھیاں آئیں، اور کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اُٹھے، مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں اُن میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی علم کلام کے مسائل، اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالیؒ و رازیؒ و ابن رشدؒ کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گزرے مگر اسمٰعیل شہیدؒ کی تلقین بہر حال اپنی جگہ پر رہی۔"

اسی طرح بچپن میں مکتبی زندگی کا تقریباً ایک سال پھلواڑی شریف کی خانقاہ مجیبی میں گزرا، خانقاہ کے بزرگوں کے عرفانی و علمی نقوش حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی اخّاذ طبیعت نے قبول کئے اور ان کا نقش انمٹ رہا حضرت سیّد صاحبؒ

اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :-

" پھلواڑی پٹنہ سے چند میل پچھم میں ایک مردم خیز قصبہ ہے، جو صدیوں سے اس صوبہ کا علمی و مذہبی مرکز ہے یہاں خانقاہ مجیبی قائم ہے، جہاں ظاہر و باطن اور علم و عمل دونوں کے سرچشمے آکر ملتے ہیں، اس خانقاہ کی خصوصیت یہ ہے کہ شروع سے اب تک اس کے سجادہ نشین علم شریعت و طریقت دونوں کے جامع رہے ہیں یعنی ہر صاحب سجادہ صوفی صافی ہونے کے ساتھ عالم دین بھی ہوتے آئے ہیں، دستار فضیلت اور خرقۂ مشیخت دونوں یہاں ایک جسم پر آراستہ رہے ہیں۔ اب دو پشتوں سے یہاں کے صاحب سجادہ صوبہ کے امیر شریعت بھی ہو رہے ہیں۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے ملفوظات میں اس خاندان کے معاصر شیخ کا تذکرہ مدح کے ساتھ آیا ہے، مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے اپنے سفر بہار و بنگال میں اس خانقاہ میں قدم رنجہ فرمایا، سجادہ نشین حال حضرت مولانا محی الدین رحمہ اللہ خلف حضرت مولانا شاہ بدر الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ...... (سے) مجھ ہیچمدان کو گوناگوں تعلقات حاصل تھے۔ میرے والد مرحوم نے ان کے والد مرحوم کے ساتھ ان کے نانا حضرت شاہ علی حبیب صاحب قدس سرہ سے فیض ارادت و تکمیل باطن حاصل کی تھی۔ میرے والد مرحوم کی پیدائش ۱۲۵۷ھ میں ہوئی تھی اور اخذ فیض و استفادہ جوانی میں شروع کیا۔ جس کے

معنی یہ ہیں کہ اس واقعہ پر اسّی نوے برس گزر چکے ہیں۔ میرے بڑے بھائی مرحوم کی تعلیم کی تکمیل اور دستار بندی شاہ محی الدین رحمہ اللہ تعالیٰ کے ماموں مولانا شاہ عین الحق صاحب مرحوم کے ساتھ اسی خانقاہ پھلواری میں ہوئی۔ میری عمر جب تیرہ چودہ برس کی تھی غالباً ۱۸۹۹ء میں والد مرحوم کے حسب الحکم بغرض تعلیم اسی خانقاہ میں طالب العلم رہا..... اس وقت میری عربی کی ابتدائی کتابیں تھیں، مجھے خانقاہ میں خاص حضرت شاہ صاحبؒ کے قریب قیام کی اور ایک ساتھ طعام اور زیر درس کتابوں میں شاگردی کی سعادت حاصل ہوئی، مجھے اس نسبت پر فخر اور انہیں اس پر مُسرّت تھی۔ انہیں جب دیکھتا تھا، عہد اوّل یاد آجاتا تھا، اور ان کو بھی خوشی ہوتی تھی۔ افسوس کہ اس بزرگانہ تبسّم کا منظر اب ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے پنہاں ہو گیا"۔ (یاد رفتگاں ۲۹۳-۲۹۴)

شاہ بدر الدین صاحب قدس سرہ کی وفات پر لکھا:۔

خاکسار کو آغاز عمر میں ۱۸۹۸ء میں پھلواری کی خانقاہ میں چند ماہ بسلسلۂ طلب علم والد ماجد مرحوم کے حسب ہدایت رہنے کا اتفاق ہوا تھا، اس وقت سے اخیر عمر تک اس ہیچمدان کے حال پر نظر عنایت تھی، کبھی کبھی مکرمت ناموں سے سرفراز فرماتے تھے تو اعزاخواں کے نام سے خطاب فرماتے"۔ (یاد رفتگاں صہ ۵۳)

حضرت سیّد سلیمان رحمۃ اللہ علیہ جب ندوہ اور اپنے استاذ شبلی مرحوم کی

خدمت میں پہنچے تو ظاہراً گویہ چنگاری چھپ گئی، لیکن افسردہ کبھی نہیں ہوئی، اور ہر زمانے میں سید صاحبؒ صحیح اسلامی تصوّف پر قائم رہے چنانچہ سید صاحبؒ کے رفیق قدیم حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی ایک خط میں ارقام فرماتے ہیں۔ "صحیح اسلامی مسلکِ تصوّف پر تو سیّد صاحبؒ شروع ہی سے قائم تھے" اور فقیر سمجھتا ہے کہ حضرت سیّد صاحبؒ کا اسلام کے دفاع میں برسہا برس تک مخلصانہ قلمی اور علمی جہاد خود ایک ایسا مجاہدہ تھا جو ان کے لیے "سیرِ سلوک" کی ایک معنیٰ میں صنف بن چکا تھا چنانچہ بہت سے وہ حقائق و مسائل جو بعد میں جا کر حضرت مرشد تھانویؒ کے ہاں ملے۔ ان پر آپ اپنی راہ سے پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ مرشد تھانویؒ کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"ان مواعظ (یعنی مواعظ اشرفیہ) میں عوام تو عوام اہل علم کے لیے بھی کیسی بصیرتیں ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے نکات علمی ملے جن تک اپنی راہ پہلے گو پہنچ چکا تھا مگر اُن کو اِن تصانیف میں پڑھکر ذوق تازہ بہم پہنچا۔" (النور نمبر ۱ ج ۲۲)

سیرت النبیؐ کی ترتیب و تالیف نے حضرت والاؒ کے جواہر باطنیہ کو مزید جلا بخشی۔ سیرت کو اگر بتعمق و غور پڑھا جائے تو صحیح اسلامی تصوّف کے علوم و معارف جگہ جگہ مل جائیں گے۔ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں مثلاً سیرت چہارم میں اللہ اور صفات باری تعالیٰ پر جو کچھ لکھا ہے اور جس تاثیر میں ڈوب کر لکھا ہے کوئی صوفی اس سے بہتر کیا لکھے گا۔ سیرت پنجم اور سیرت ششم تمامتر سلوک اسلامی کے علوم سے مملو ہیں۔

سلوک کے متعلق حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کا جو نظریہ ۱۹۲۳ء و ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۹ء میں تھا، وہی حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تعلق کے بعد ۱۹۴۴ء میں بھی تھا اور ۱۹۵۲ء میں بھی تھا۔

جون ۱۹۲۳ء کے ایک مضمون میں ثابت کرتے ہیں کہ "اسلامی تصوّف کا ماخذ قرآن وحدیث ہے۔" (رسالہ معارف ص ۴۰۵)

مئی ۱۹۲۵ء میں حضرت مولانا دریابادی کی کتاب تصوّفِ اسلام پر تبصرہ کرتے ہوئے سلوک پر ایک فاضلانہ اور محرمانہ مقالہ سپردِ قلم کرتے ہیں اور تحریر فرماتے ہیں:-

"تصوّف سراپا عمل ہے اور قلب و روح کے علم و عمل اور مغز شریعت کی اصل تعلیم و تکمیل ہے۔" معارف ۳۹۴ / نمبر ۵ ج ۱۵

۱۹۲۹ء میں لکھتے ہیں:-

"حقیقی تصوّف جس کی نسبت حضرت شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ اس کا نام احسان ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے وہ تو درحقیقت مذہب کی رُوح، اخلاق کی جان اور ایمان کا کمال ہے۔"

اس اقتباس سے ملتے جلتے الفاظ ۱۹۵۲ء میں ایک ناقد سائل کے جواب میں لکھتے ہیں

"..... حقیقی اور شرعی تصوّف جس کا صحیح نام احسان ہے روح دین اور جانِ ایمان ہے یہ اخلاص فی اللہ اور تزکیہ قلب اور علم حصولِ تقویٰ

کا نام ہے"۔

سنہ ۱۹۴۴ء میں لکھتے ہیں :۔

" علم سلوک و تصوّف روح شریعت کا نام ہے۔ جس میں اخلاص دین اور اعمال قلب کے احکام اور دقائق سے بحث کی جاتی ہے احکام الٰہی کی باخلاص تعمیل و تکمیل ہی کا نام طریقت ہے۔ دیگر ہیچ"

(معارف ج ۵۲ نمبر ۲ ۱۰۹ — ۱۰۷)

مقصد یہ ہے کہ حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ صحیح اسلامی تصوّف کے ہمیشہ قائل اور اس کی تعلیمات کی طرف مائل اور اس کی تاثیر کے گھائل رہے۔ لیکن اپنی ذات کے متعلق ان احوال و مسائل کا اظہار برملا نہ تھا بلکہ اخفا کو ترجیح دیتے تھے چنانچہ ۲ر مئی سنہ ۱۹۳۰ء کے ایک گرامی نامے میں اپنے راز داں اور محبّ چچا سیّد عبدالحکیم صاحب کو لکھتے ہیں :۔

" آپ بیتی کیفیّت کا ایک زیر پردہ نظارہ باقی رہ گیا ہے روز بروز طبیعت کا رخ دوسری طرف ہو رہا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے خط و کتابت جاری ہے۔ خدا جانے توفیق ملتی ہے یا نہیں۔ معیار اتنا بلند ہے کہ نظر کہیں کم جمتی ہے۔ بہر حال کچھ نہ کچھ راز و نیاز کا سلسلہ جاری ہے (یہ تمام راز ہے)"۔

حضرت سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سوزِ باطن تلاشِ شیخ میں برسوں مشغول رہا۔ آخر تقدیر الٰہی نے محقق عصر یگانہ روزگار سیرت نگار نبویؐ و جانشینِ شبلی کو جنیدِ وقت شیخ الکل حکیم الامت حضرت اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

کے آستانۂ معرفت پر پہنچا دیا۔ یہ قران السعدین اتفاقی نہ تھا بلکہ علم وعمل کے مہر و ماہ کا اقتران مناسبت و یگانگت کی پوشیدہ ازلی حقیقت کا فطری ظہور تھا ؎

درخرابات مغاں ما نیز ہم منزل شویم　　کاینچنین رفت در عہد ازل تدبیر ما

"عالم ارواح" کی شناسائی و محبت "عالم ناسوت" میں باہمی کشش و اتحاد مذاق کا سبب بنتی ہے [1]۔ اور پہلی ہی ملاقات میں انسان ایک دوسرے سے ایسی یگانگت، محسوس کرتا ہے گویا برسوں سے ملاقات ہو، باہمی انس و موافقت کا دروازہ کھل جاتا ہے　حکیم الامۃ حضرت تھانویؒ اور حضرت سید الملۃ سلیمان ندویؒ کی باہمی ملاقات و تعلق اس دعویٰ کی بین دلیل ہے۔ مرشد تھانویؒ کا پہلی ملاقات کا تاثر ان کے الفاظ میں سننے کے قابل ہے۔

حضرت مولانا دریابادی مدظلہ کو ارقام فرماتے ہیں :-

" مولانا سید سلیمان ندوی صاحب دفعۃً تشریف لے آئے میں مکان پر تھا۔ سنتے ہی حاضر ہوا۔ میرے ذہن میں ان کا جثہ طویل و عریض تھا۔ ملا تو معتدل الخلقت پاکر قلب کو بہت انس ہوا۔ پھر ملاقات

---

[1] حضرت والا قدس سرہٗ ایک گرامی نامے میں ارقام فرماتے ہیں "حدیث شریف میں آیا کہ روحیں ازل میں ایک صف میں مجتمع ہوئی ہیں۔ تو جن سے وہاں میل ہو گیا۔ یہاں میل ہو جاتا ہے اور جن سے وہاں ناآشنائی ہوتی ہے یہاں بھی ہوتی ہے یہ تو حدیث کا ترجمہ ہے۔ اب واقعات پر نظر کریں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مدتوں کے بعد کبھی کسی کو ایک جھلک دیکھ لیا۔ تو ایک کو دوسرے کی طرف کشش اور اتحاد مذاق معلوم ہوتا ہے۔ اور یوں خیال ہوتا ہے کہ ان سے زمانہ کی دوستی ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں میں جان پہچان مدت کی ہوتی ہے، مگر دل ان سے نہیں ملتا۔ اور ملاقات کے باوجود اجنبیت معلوم ہوتی ہے۔"

مکالمت سے ان کی تواضع و سادگی و رعایت جلیس دیکھ کر تو مسخر ہی ہوگیا. گیارہ بجے تشریف لائے تین بجے تشریف لے گئے. مجلس میں بہت دیر تک ثناخوانی کرتا رہا[1]۔"

مرشد تھانویؒ کے اس اظہار حقیقت کہ بعد مرید ندویؒ کا اعلانِ یگانگت سُنیئے اپنے ہمدم دیرینہ حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی مدظلہ کو لکھتے ہیں۔

" لکھنؤ میں چار ہی روز صحبت رہی. مگر مولانا کی شفقت میری عقیدت کو بڑھاتی رہی، اور آخر ان کی ہدایت کے بموجب، اور آپ کا مشورہ تو پہلے سے یہی تھا، باب مکاتبت وا ہے اور اب تو وہی وہ ہیں ع

آتے ہیں نگاہوں میں خیالوں میں دلوں میں

معائنے سے بڑھ کر تصوّر میں مکالمہ تک نوبت آتی ہے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مولانا کے مواعظ و رسائل پڑھتا ہوں. اکثر علمی مسائل بھی اپنے ہی مذاق کے پائے اور احوال و کیفیات میں اُن سے نئی نئی گرہیں کھلتی ہیں افسوس کے اتنے دنوں کیوں غافل رہا۔"

مرشد تھانویؒ اور مرید ندویؒ کا قران السعدین مفید و مستفید، مرید و مراد کی فطرتی صلاحیتوں کے بقدر رہا، چند دنوں میں حضرت سید صاحب قدس سرّہٗ روحانیت کی ان بلندیوں تک پہنچ گئے جن کا تصوّر بھی ہما شما کیلیے محال ہے تھوڑی سی مدّت میں خلافتِ اشرفیہؒ سے نواز دیے گئے اور علوم و معارف اشرفیہ

---

[1] حکیم الامت مرتبہ عبدالماجد دریابادی ص ۴۳۸

کا خزانہ ان کی طرف منتقل تھا۔ فقیر سمجھتا ہے کہ سلیمانی روح جس طرح مرشد کی تلاش میں تھی باطنِ اشرفؒ بھی کسی ایسے قلب کو ڈھونڈ رہا تھا جہاں ان کا فیضِ باطنی اپنی وسعتوں کے ساتھ سما سکے۔

حضرت سیّد صاحبؒ مولانا عبد الباری صاحب مدظلہ کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :-

"مولانا گیلانی نے مجھے لکھا ہے کہ سنا آپ نے بھی ایک دیوبندی کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے میں لکھنے والا تھا کہ ہاتھ گراب بھی دیا ہو یا نہ دیا ہو، مگر دل تو اس کو دس بارہ برس پہلے دے چکا تھا پھر مجھے فخر یہ ہے کہ آپ لوگوں نے مولانا تھانویؒ کو اپنی طرف کھینچا اور مجھے خود مولانا تھانویؒ نے بار بار اپنی طرف کھینچا (بعالم رویا)

بہرحال حضرت سیّد صاحب نور اللہ مرقدہ جب حضرت تھانویؒ کے آستاں پر پہنچے تو جانبین کی باہمی مناسبت و یگانگت نے من و تو کے پردے اٹھا دیے اور یگانگت کا وہ منظر پیش کیا جس کے متعلق خسرو نے کہا تھا

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری!

مرشد تھانویؒ نے انہیں کے لفظوں میں گویا اپنا کلیجہ نکال کر "مرید باصفا" کے سامنے رکھ دیا[1]۔ اور ان کے جمال و کمال روحانی کی داد دیتے ہوئے بے اختیار کہہ دیا۔

---

[1] جمیل الکلام از مولانا جمیل احمد تھانوی ص ۴۴

از سلیماں گیر اخلاص عمل — داں تو ندوی را منزّہ از دغل

اے دلت پر نور راز انوار حق — اے دلت مسرور از اخبار حق

اے دلت معمور از اسرار حق — اے دلت مخمور از آثار حق

حضرت سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ عالی مقام کے متعلق جو کہا اور لکھا، ان کے اشعار اور تحریریں اس پر شاہد ہیں، اور جس طرح شیخ کے علوم و احوال کو اپنایا اور اپنے جملہ کمالات و فضائل کے ساتھ جس طرح اشرفی حسن و جمال کو سمویا اس کی مثال کم ملے گی، مولانا دریابادی لکھتے ہیں

"(سیّد صاحبؒ پر) آخر آخر میں تصوّف بہت غالب آگیا تھا، حکیم الامت و امام طریقت تھانویؒ کا آخر زمانہ تھا۔ کہ ان سے عقیدت پیدا ہوئی اور والہانہ حد تک پہنچ گئی۔ بیعت ہوئے اور مرشد کے اندر ایسا جذب ہوئے کہ ایک لفظ فنا فی الشیخ جو مدت سے سننے میں آرہا تھا۔ اس کا ایک عملی نمونہ پیش کر دیا۔" (صدق جدید لکھنؤ ۲۸ دسمبر ۱۹۵۳ء)

سلوک کے متعلق حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تجدیدی مساعی نے سلوک کو جس طرح قرآن و سنت کے آئینہ میں پیش کیا تھا، وہی سلیمانیؒ ذوق و حال تھا اس اتحاد مذاق کی وجہ اور افادہ شیخؒ کے سیلان اور ظرف سلیمانیؒ کی وسعت استفادہ کی ہمہ گیر قوت کی بنا پر جو سینہ شیخؒ میں تھا، وہی قلب سلیمانیؒ میں منعکس تھا۔ چنانچہ سلوک سلیمانیؒ پر اس ہیچمیرز کے خطا کار قلم سے معارف میں جب وہ مقالہ شائع ہوا۔ جو آئندہ پیش ہو رہا ہے۔ تو حضرت سیّد الملۃ کے خواجہ تاش اور پرانے رفیق مخدومی حضرت مولانا شاہ عبد الباری صاحب ندوی نے راقم کو تحریر فرمایا:۔

ہمارے ماجد میاں نے بھی تحریر فرمایا، کہ لفظ بہ لفظ ارشادات تھانویؒ کی ترجمانی ہے۔ بلکہ احقر کی نظر میں تو حرف حرف اور نقطہ نقطہ اسی ترجمانی کا حق ادا فرمایا ہے۔ یہی سچ پوچھیے تو "سلوک سلیمانی" کا ہر طرح سب سے بڑا کمال و جمال ہے، ایک فنائیت فی الشیخ کے اعتبار سے دیکھیے کہ یہ تربیتی و مرشدانہ کمال ہما شما کو حاصل ہو تو کیا کمال، کمال تو حضرت مرحوم جیسے علوم کتاب و سنت کے کامل النظر کا ہے کہ ان کو ارشادات مرشد" میں کسی حرف و نقطہ کی کمی و بیشی کی گنجائش نظر نہ آئی جو خود مرشد کے حق میں شریعت و طریقت کے کمالِ جامعیت کی سب سے بڑی دلیل ہے"۔

حضرت مولانا دریا بادی مدظلہ نے فقیر کو اس بارے میں ارقام فرمایا۔

" سید صاحب کی جتنی تحریریں اس مقالہ میں نظر سے گزریں وہ کہنا چاہیے کہ لفظ بلفظ حضرت تھانوی سے منقول ہیں یہ خالص صوفیانہ اعتبار سے ایک فضیلت کی چیز ہے۔ یعنی فنائیت فی الشیخ کا اعلیٰ مرتبہ"۔

کہ مرید کو جب شیخ سے مناسبت تامہ نصیب ہو جاتی ہے تو مفیضِ حقیقی مفید کے علوم و فیوض کو خود مستفید کے قلب پر اسی طرح افادہ و القا فرماتے ہیں۔ گویا مستفید مفید کی زبان بن کر اسی کی ترجمانی کرنے لگ جاتا ہے اور ظاہراً مرید و مراد کے علوم میں التباس پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ علوم مرید کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، اس لیے ان کی نسبت مرید سے اگر نہ کی جائے تو فرق اعتباری بھی جاتا رہتا ہے اس لیے

"سلوک سلیمانی" گو حقیقۃً "سلوک اشرفی" اور اس کی ترجمانی ہی ہے۔ تاہم اس کی نسبت حضرت سیّد الملۃ قدس سرہ سے کیے بغیر چارہ نہیں۔ حکمتِ حکیم الامتؒ کے شارح مخدومی حضرت مولانا عبدالباری ندوی مدظلہ (جنہیں بقول علامہ محمد یوسف البنوری مدظلہ اللہ تعالیٰ نے حضرت تھانویؒ کے علوم کی اشاعت کے لیے مسخر کر دیا ہے) نے "سلوک اشرفی" اور "سلوک سلیمانی" کی اسی یگانگت کی بنا پر فقیر کو ایک خط میں لکھا تھا۔

"آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سیّد صاحب سے ماشاء اللہ مناسبت تامہ تھی۔ ایسی (تربیتی و دینی مسائل میں) تسلی تو کہیں اور سے دشوار ہی ہے تاہم ممدوح کی تعلیمات چونکہ اپنے شیخ ہی کی تعلیمات کی (مناسبِ طالب و وقت تعبیرات کے قالب) میں آئینہ دار تھیں۔ اس لئے آپ بھی اگر اپنے شیخ الشیخ علیہ الرحمۃ کی چیزوں خصوصاً تربیت السالک کو مطالعہ میں رکھیں تو ماشاء اللہ ذہین و فہیم ہیں اکثر الجھنوں میں تسلی پاتے رہیں گے"

اور اس ذرّہ بے مقدار سے اسی حسن ظن کی بنا پر تقاضا فرمایا کہ :-

"سیّد صاحب کی سوانح و سیرت کی تکمیل کے لیے تو کچھ معمولی اضافہ کے ساتھ "سلوک سلیمانی" کا یہ معارفی سلسلہ بالکل کافی ہو گا۔ ان افادات کا ان کو موقع ہی کم اور آخر عمر میں ملا۔ اس کے بجائے اگر "قلم اشرف" سے "اشرفی سلوک" کا ایک مرقع تیار ہو جائے تو انشاء اللہ وُہ اپنی جامعیت و احاطت کی بدولت نہ صرف اصطلاحی شیوخ و سالکین سب ہی کے لیے بے بہا دولت، بلکہ آپ کے جدید قلم کی روشنی میں باقاعدہ تربیت سے بدکنے والوں کے ہاتھ ایک ایسی چیز پہنچ

جائے گی کہ پڑھنے والے بطور خود بھی اپنی اخلاقی و باطنی اصلاح میں بشرط طلب فائدہ اٹھا سکیں گے"

اور فقیر کے عذر پر دوبارہ ارقام فرمایا:-

ماشاءاللہ "سلوک سلیمانی" کا قلم ہر طرح "سلوک اشرفی" کے قابل ہے کہ وہ "سلوک سلیمانی" ہی کا زیادہ جامع و مفصل ایڈیشن ہوگا"

غرض حضرت سید صاحب قدس سرّہ جب اپنے شیخ باکمال کی صحبت میں پہنچے تو اپنی خداداد صلاحیتوں سے شیخؒ کے علوم کو نہ صرف اپنے میں جذب کر لیا بلکہ جب شیخ کے علوم کا افادہ آپ کی ذات سے ہوا، تو یہ فیضان اشرفؒ سلیمانی رنگ میں مزید نکھر گیا۔ اور اپنی تابناکیوں سے دنیا کو روشن کر دیا اور سلیمانیؒ شیشہ میں جب معارفِ اشرفیہ کی پری اتری۔ تو اس نے حضرت سید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے فضائل و مزایا سے حسن و جمال تازہ پایا۔ سید المحققینؒ علامہ ندویؒ کی نگاہ شیخ کے علوم پر محرمانہ و عاشقانہ ہونے کے باوجود محققانہ اور مبصرانہ تھی اور ان کا تشخص بہرحال قائم تھا۔ جیسے علومِ شبلیؒ کی تمام عمر ترویج و اشاعت نے سید صاحب کے مستقل حیثیت و مقام کو باقی رکھا اسی طرح فنائیتِ شیخ نے سلیمانیؒ شخصیت کو بالکل گم نہیں کر دیا۔ وہ اشرفیؒ ہونے کے باوجود سلیمان ندویؒ تھے، اور اپنے علوم و معارف ذاتیہ کے امین و داعی "سلوک سلیمانی پر اجمالی نظر" کے عنوان سے اس ظلوم و جہول نے جب حضرتؒ کی تعلیمات کو پیش کیا تو گو آپ کی علوم کی پیشکش ایک شکستہ قلم کج مج رقم کے ہاتھوں سے تھی تاہم علوم و معارفِ سلیمانیہ کا سورج فقیر کی بے علمی اور بے بصیرتی کے بادلوں میں چھپ نہ سکا

اور حضرت کی تعلیمات کی برکت سے سب حلقوں میں پسند کیا گیا فَلِلّٰہِ الْحَمْد!

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے خصوصی تعلق رکھنے والوں نے خلافِ توقع اس عاجز کی بے حد حوصلہ افزائی فرمائی، اور میری تعبیراتِ قلم کی تمام کوتاہیوں کو نظر انداز فرما کر حضرت کی تعلیمات کے حُسن و خوبی کو سامنے رکھا، اور مقالہ کے مندرجات کی تصویب و مدح فرمائی۔

بزرگوں کی اس تصویب و تصدیق کو اپنے لیے سرمایہ آخرت سمجھتا ہوں، اور ان کے حسنِ ظن کو قارئین کے سامنے پیش کرنے کی جرات اس لیے کرتا ہوں کہ محولہ بالا مقالہ کی تعلیمات سلیمانیہؒ کی قدر کر سکیں اور ان سے استفادہ کر سکیں اور فقیر کی نسبت سے یہ موتی بے قیمت و بے آب نہ ہو جائیں۔

مخدومی حضرت مولانا عبدالباری صاحب مدظلہٗ نے اس سلسلۂ مضامین کو پڑھ کر ان الفاظ میں ذرہ نوازی فرمائی:-

"سلوکِ سلیمانی" کا سلسلہ معارف پڑھ کر خود ہی خیال آ رہا تھا، کہ خاتمہ پر انشاء اللہ مبارکباد پیش کروں گا، کہ آپ نے اپنے "الشیخ السید" علیہ الرحمۃ کی شیخ شناسی کا حق خوب خوب ادا فرمایا، مگر سلسلہ کے آخر میں[1] آپ کا حکم پڑھ کر معلوم ہوا کہ یہ قلبی تقاضا آپ ہی کے امر کا پیشگی عکس تھا۔ بہرحال امتثالاً عرض ہے

یہ ناکارہ جس طرح حضرت اقدس[2] و اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی تجدیدی جامعیت کا حضرتؒ کی وفات کے بعد حضرتؒ کے ملفوظی و تحریری باقیات

---

[1] مقالہ کے آخر میں حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی اور حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی سے مقالہ کے متعلق اظہار رائے کی درخواست کی گئی تھی۔ [2] حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ۔

صالحات کے مطالعہ سے معتقد ہوا، اسی طرح حضرت سیدؒ کے شیخ کامل ہونے کا ان کی وفات کے بعد "سلوک سلیمانی" سے فاحسن اللہ جزاءک بس کبھی یکجائی کی سعادت نصیب ہوتی اور کسی طالب کو کچھ تربیۃً تحریر فرماتے تو اس نالائق کی طرف بڑھا دیتے کہ ٹھیک ہے

اس سے زیادہ مربیانہ "سیادت" کے استفادہ کا موقع نہ ملا تھا، لیکن ماشاء اللہ "سلوک سلیمانی" نے شان تربیت کا مرقع پورا سامنے کر دیا۔"

مخدومی حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہ نے ارقام فرمایا:

" سید صاحبؒ کے ہر عزیز و متوسل کو اپنا ہی عزیز سمجھتا ہوں۔ قدرتاً خط پاکر بڑی مسرت ہوئی۔ معارف میں سلسلۂ مضامین (سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر) کو لفظ لفظ پڑھا۔ ماشاء اللہ، سبحان اللہ، بڑے سلیقے اور رکھ رکھاؤ سے لکھا ہے کوئی مسترشد اس سے بہتر طریقے پر اپنے مرشد کے کمالات و فضائل کو ظاہر نہیں کر سکتا۔

"سلوک سلیمانی" کو کتابی صورت میں ضرور لایئے، انشاء اللہ بہتوں کو اس سے نفع ہوگا۔"[1]

---

[1] اسی مقالہ کے تعارف کی بنا پر صدق جدید میں اپنے "سفر لاہور" کے مشاہدات و تاثرات میں اس بے مایہ کے متعلق تحریر فرمایا: "مولوی محمد اشرف خاں ایم اے (استاد پشاور یونیورسٹی) سے ناظرین صدق کچھ واقف ہو چکے ہیں۔ بیچارے غایت محبت و اخلاص سے سفر کر کے پشاور سے آئے۔ دن میں ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ ہمارے معظم و مکرم مولانا سید سلیمان ندوی مرحومؒ کے مرید خاص و مسترشد با اختصاص ہیں اور ان کے صوفیانہ معارف کے شاید سب سے بڑے حامل ...."

(صدق جدید ۱۷ جون ۱۹۵۸ء صفحہ ۵ کالم ۱)

محترمی حضرت ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ نے تحریر فرمایا:۔

"سلوک سلیمانیؒ بالاستیعاب تو نہیں پڑھ سکا، نظر ڈالی اور آپ کی ہمت اور علوم سلیمانیؒ کے جذب کرنے کی صلاحیت پر آفرین کہی! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ باتوفیق و چشمہ فیض رکھے۔ سید صاحب کی یادگار رہیں۔"

حضرت شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی مدیر معارف نے لکھا:۔

"آپ کا خط ملا حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کے تعلق کی تفصیل معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی۔ میرے لئے ہر وہ چیز محبوب ہے جس کو حضرتؒ سے کوئی نسبت ہو۔ حضرتؒ سے میری ملازمت کی مدت تقریباً چوتھائی صدی ہے میرے شعور کی آنکھیں انہیں کے دامن تربیت میں کھلیں اور جو کچھ بھی حاصل ہوا سب انہیں کے طفیل ہے ..... آپ کا مضمون (سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر) مختلف حیثیتوں سے نہایت مفید اور قابل قدر ہے۔ اپنی اپنی قسمت ہے، دوری و بعد کے باوجود حضرت کی روحانی دولت آپ کے حصہ میں آئی اور میں چشمۂ حیواں کے قرب کے باوجود اس سے محروم رہا....... پھر ان کے فیوض و برکات کو عام کرنے کی سعادت بھی آپ ہی کے حصہ میں آئی ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ"

حضرت الشیخ قدس سرہ کے مایہ ناز محب و محبوب شاگرد مولانا محمد ادریس صاحب ندوی نگرامی استاذ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے تحریر فرمایا:۔

"سلوکِ سلیمانیؒ پر خلوصِ دل سے آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں....
حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے علوم کے ایک حصّے کی خدمت
جس ذوق و شوق کے ساتھ آپ کر رہے ہیں وہ آپ ہی کا
حصّہ ہے۔ اور ہم وابستگانِ دامنِ سلیمانی اس کے لیے ممنون
ہیں۔"

حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ مسترشد خاص اور معارف کے قدیم مقالہ نگار مولانا عبد الرؤف صاحب اورنگ آبادی نے ارقام فرمایا:۔

"آپ کے مضامین "سلوکِ سلیمانی" پر ایک طرف بصیرت افروز ہیں
تو دوسری طرف بے حد وجد آفریں، بار بار پڑھنے سے بھی سیری نہیں
ہوتی، جی چاہتا تھا کہ لوحِ دل پر نقش کر لوں۔"

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص احباب کی یہ قدر افزائی اور ذرہ نوازی محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ان علوم کی برکت تھی، جن کی اشاعت اس رُوسیاہ و نابکار کے پیشِ نظر تھی۔ ان کی اس حوصلہ افزائی سے ہمت بڑھی، اور سلوکِ سلیمانیؒ کا ایک تفصیلی خاکہ پیش کرنے کا ارادہ ہوا خیال یہی تھا کہ کتابی صورت میں یہ تفصیلی خاکہ (جس کے تقریباً فل سکیپ کے پانچ سو صفحات لکھے جا چکے ہیں) ہی شائع کیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو فقیر کی اس پہلی کوشش ہی کو پہلے کتابی صورت میں منظرِ عام پر لانا منظور تھا، عزیزی نسیم اختر شیخ سلمہ (انجنیئر لاہور) کے دل میں اس کی اشاعت کا شدید داعیہ و تقاضا پیدا ہوا اور وہ اس مقالہ کو چھاپنے کی غرض سے لاہور لے گئے، اور عزیز سعید جناب

سرمد الحسینی صاحب (ول وشرز پریس لاہور) کے تعاون وکوشش سے بفضلہ تعالیٰ اس کا سامان کردیا۔ ان دونوں نے جس ذوق وشوق سے اس مقالہ کو شائع کیا، اللہ تعالیٰ انہیں اس کی جزائے خیر دے اور انہیں علوم ومعارف سلیمانیہ کا حامل و عامل بنائے۔ پوری ملت کو اس فیض سلیمانی سے بہرہ مند فرمائے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ اور فقیر کے لیے اسے اپنے قرب ورضا اور نجات کا ذریعہ بنائے آمین

شروع میں تعارف اشرف، کے نام سے اخی الاعز جناب ڈاکٹر مولوی غلام محمد صاحب دام فیضہ کا مضمون شائع کیا جارہا ہے۔ ہمارے خواجہ تاشوں میں حضرت ممدوح کا جو مقام ہے۔ وہ اہل نظر سے مخفی نہیں، تعارف درحقیقت اشرف کی حقیقت نہیں، بلکہ ان کے اخلاق کریمانہ کا عکس ہے۔

فجزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء

مورخہ ۳۰ ج ۲ سنہ ۱۳۸۶ھ
۲۵ ستمبر سنہ ۱۹۶۶ء

فقیر
محمد اشرف خان
صدر شعبہ عربی، اسلامیہ کالج پشاور

إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد للّٰہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ علی خیر خلقہ محمد المزکیّ الامین وعلی الہ واصحابہ واتباعہ اجمعین

امابعد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ (الجمعہ-۱)

"مقاصد وغایات"

پہلا باب

حقیقتِ تصوّف وسلوک

فنِ سلوک

علمِ سلوک وتصوّف اس فن کا نام ہے جس میں شریعت مطہّرہ کی کامل متابعت اور سیّدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بکمال اخلاص ظاہری وباطنی مکمل پیروی کی طرف رہنمائی کی جاتی ہے۔ اور خصوصاً ان احکام الٰہیہ سے بحث کی جاتی ہے اور ان پر عمل کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔ جو اعمال ظاہری (عبادات،

معاملات و معاشرت، کے باطنی پہلو، عقائدِ حقہ کی تحسین، اخلاصِ دین، تزکیۂ قلب، اخلاقِ باطن، تہذیبِ نفس، صفائیٔ روح اور تعلق مع اللہ تعالیٰ کے متعلق ہیں۔

امام قشیریؒ لکھتے ہیں:۔

التصوف هو علم تعرف به احوال تزكية النفوس وتصفية الاخلاق وتعمير الظاهر والباطن ونيل السعادة الابدية وموضوعه التزكية والتصفية والتعمير المذكور وغايته نيل السعادة الابدية ومسائله ما يذكر في كتبه من المقاصد (رسالة القشيرية)	تصوف وہ علم ہے۔ جس کے ذریعہ نفوس کی پاکیزگی، اخلاق کی صفائی اور ظاہر و باطن کے (احکام الٰہی کے مطابق) بنانے کے احوال پہچانے جاتے ہیں اور ابدی سعادت تک پہنچا جاتا ہے۔ اور اس کا موضوع تزکیہ، صفائی (باطن) اور (ظاہر و باطن کی) تعمیر ہے۔ اور اس کی غایت ابدی سعادت کا پانا ہے۔ اور اس کے مسائل فن کی کتابوں میں مقاصد کے طور پر ذکر کئے گئے ہیں

گویا سلوک و طریقت روحِ شریعت، اعلیٰ دین، جانِ ایمان اور علمِ حصولِ تقویٰ و احسان کا نام ہے جس کا خاص موضوع اعمالِ قلب کے احکام و دقائق، تزکیۂ باطن اور روحانی حقائق ہیں۔ یہ امور بھی شریعت کے ظاہری اوامر کی طرح کتاب و سنت سے ثابت، منصوص اور مامور بہا ہیں۔ شریعت کے ظاہری احکام کی پابندی کے بغیر طریقت گمراہی، الحاد و زندقہ ہے۔ اور طریقت (یعنی باطنی شرعی احکام) کو چھوڑ دیا جائے تو شریعت جسد بے روح اور قالب بے جان ہے۔ شریعت ہی سے طریقت کی بناء وجود باقی و قائم اور طریقت ہی سے شریعت کی رونق و نکھار ہے یا یوں کہئے کہ طریقت شریعت سے علیحدہ اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی۔ شریعت ہی کے باطنی احکام سلوک و تصوف کہلائے اور جملہ احکام الٰہی کی باخلاص تمام تعمیل و تکمیل ہی نے طریقت کا نام پایا۔ گویا طریقت عین

شریعت ہے اور یہی خواص امت کا مذہب ہے اور جس نے اس کے سوا کہا وہ دین کی حقیقت سے جاہل اور فنِ سلوک سے ناآشنا ہے ؎

اب تو مے نوشی ہے عین شرع بر فتوائے شیخ
اب ہوگا وہی فقیہہ شہر جو مے نوش ہے

قلب وقالب کی اصلاح کے دو گونہ احکام ایک ہی بارگاہ قدس جل جلالہ سے صادر ہوئے ہیں اور سینۂ نبوتؐ ہی سے ظاہری و باطنی احکام کے کوثر وتسنیم کے چشمے جاری کئے گئے ہیں۔ جو جسد وروح۔ ظاہر و باطن اور قلب وجسم کی ہدایت اور قوام وحیات کا سبب ہیں۔ کتاب وسنت کے ظاہری احکام فقہ کے نام سے مدوّن ہوئے اور باطنی اور قلبی اوامر کی فقہ، سلوک و تصوّف کے نام سے ترتیب پائی۔ دونوں سوتے ایک ہی سرچشمۂ ہدایت سے پھوٹے ہیں اور دونوں ایک ہی شجرِ طوبیٰ کی شاخیں ہیں۔ ایک فن کے ماہرین فقہا کہلائے تو دوسرے کے رمز آشنا صوفیہ، اور بارہا دونوں نبوی فنون نے ایسی قدسی الصفات ہستیوں سے جلوہ پایا۔ جو ظاہر و باطن کے جامع اور وراثتِ نبوت کی کامل و مکمل حامل تھیں ——
"مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ"

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے تھے۔ وہ ظاہر و باطن، جسد وروح اور جسم وقلب کے جملہ احوال ومعاملات کی اصلاح وتربیت کا جامع و مانع دستور العمل تھا۔ اگر تلاوت کتاب تعلیم قرآن وحکمتِ نبوی طریقِ تربیت کا ایک پہلو تھا تو دوسرا اہم پہلو تزکیۂ قلوب و صفائی نفوس بھی تھا۔ کہ انبیاء علیہم السلام کے طریقِ دعوتؐ تربیت میں قلوب کی اصلاح، روح کے تزکیہ اور نفس کی تطہیر کی اہمیت ظاہری اعمال کی پابندی سے کسی طرح کم نہیں، باطن ہی وہ سرچشمہ ہے، جو اگر پاک وصاف ہو جائے تو رگ رگ

ایمان ویقین اور اعمال صالحہ کے آب حیات سے زندہ اور توحید وتقویٰ کے نور سے معمور ہوجاتی ہے۔ اور اگر یہ سرچشمہ عقائدِ باطلہ وخیالاتِ فاسدہ سے گدلا رہے تو اعمالِ ظاہرہ کی بھی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ اسی لئے انبیاء علیہم السلام اپنی دعوت میں

تربیت و اصلاح کی بنیاد بقول حضرۃ الشیخ علامہ سید سلیمان ندوی قدّس سرہ "صرف قلب کی اصلاح پر رکھتے ہیں۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہی اصلی چیز ہے اور اسی کے بدلنے سے سب کچھ بدل سکتا ہے۔ ان کی غرض خدا کی اطاعت، خدا کی محبت اور خدا کی معرفت ہوتی ہے اور تمام دوسری ترقیوں اور اصلاحوں کو وہ یکسر اسی ایک اصل کی فروع اور اسی ایک جڑ کی شاخیں جانتے ہیں۔" (سیرت النبی ج۴ ص۳۹)

کہ اختیار اور ارادہ کے مرکز کا نام مذاہب کی زبان میں "دل" ہے۔ جو انسان کے سر سے لے کر پاؤں تک کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ کی ایک ایک جنبش وحرکت پر حکمراں ہے۔ اور اسی کے حکم سے اس جسم کے اندرونی عالم میں سب کچھ ہوتا اور سرانجام پاتا ہے۔ انبیاء اسی دل کے نظام کو درست کرنے کے لئے آتے ہیں۔ (سیرت النبی ج۴ ص۲۹)

یہی وجہ ہے کہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی، قلبی احوال و اعمال اور باطنی معمولات و معاملات کی تصریحات واشارات سے مملو ہیں۔

اسی بناء پر حضور انور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ خلفائے راشدہ جو آپ کے بعد مسند ارشاد پر متمکن ہوئے، تعلیم کتاب وسنت کی دولت کے ساتھ تزکیۂ روح و اصلاح قلب، پاکیزگیٔ نفس وصلاحیتِ باطن کی نعمت سے بھی نوازے جاتے رہے۔ کہ اس کے بغیر نبوت کی نیابت کا فریضہ انجام نہیں پاسکتا۔ اور ظاہر وباطن کی جامعیت کے بغیر انسان کی کامل اصلاح محال ہے۔ بقول سیّد الملۃ نور اللہ مرقدہ " باطن کی صفائی

اور قلب کی تابانی کے بغیر محض زبان کی روانی اور قلم کی جولانی سراب کے نمو سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی"

قلب و باطن کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر وہ قدسی الصفات ہستیاں جن کے ذریعہ سے انبیاء علیہم السلام کی دعوت و پیغام کو عالم میں پھیلایا گیا۔ زندہ اور روشن دلوں کی حامل رہی ہیں۔ ان کے قلوب تقویٰ کے نور اور حضور و معیت کے استحضار سے چمکتے رہے ہیں ۔

سننِ نبویہ کا کامل اتباع ان کے ظاہر و باطن اور خلوت و جلوت کا معمول رہا اور کتاب و سنت ہی کے نور سے وہ اپنے دیدۂ و دل کو منور کرتے اور اپنی زندگی اسوہ نبویؐ کا نمونہ بنا کر پیش کرتے رہے۔

حضرۃ الشیخ علامہ سید سلیمان ندوی

سیدی و مولائی حضرۃ الشیخ علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہٗ ان زندہ دل ہستیوں میں تھے۔ جنہیں تقدیرِ الٰہی انسانوں کی اصلاح و فلاح تربیت و تزکیہ اور دعوت و ارشاد کے نبویؐ فریضہ کی نیابت کے لئے چنتی ہے۔ اس لئے تربیت علی منہاج النبوۃ سے آپ کو حصہ وافر ملا تھا اور روشن دل اور نورانی سینہ عطا ہوا تھا۔ جیسا کہ خود شیخ وقت مولانا تھانویؒ کا حضرت والاؒ کے بارے میں ارشاد ہے۔

اے دلت پر نور از انوارِ حق　　　اے دلت مسرور از اخبارِ حق

اے دلت معمور از اسرارِ حق　　　اے دلت مخمور از آثارِ حق

آستانۂ سلیمانی رح

اس لئے حدیث دل کے طلبگاروں کے لئے اس درویشِ بے گلیم کا آستانہ سکون و طمانیت کا مرجع تھا، جہاں قال

اللہ و قال الرسول ؐ کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ جہاں علوم رحمانی اور حکمت نبوی ؐ کے خزانے لٹائے جاتے تھے۔ جہاں قلوب کا تزکیہ اور نفوس کا تصفیہ کیا جاتا تھا۔ جہاں نبوی ؐ صحبت کا پرتو محسوس ہوتا تھا۔ جہاں حقائق ربانی اور دقائق احسانی کو برملا فاش کیا جاتا تھا۔ جہاں الٰہی اسرار و رموز سے پردے اٹھائے جاتے تھے۔ جہاں حقیقت و مجاز، حق و باطل، سنت و بدعت میں بے محابا تفریق کی لکیر کھینچی جاتی تھی۔ جہاں سلوک نبوی ؐ کو مروّجہ غیر شرعی طرق سے علانیہ ممتاز کیا جاتا تھا جہاں طریق کتاب و سنت کی روشنی میں نکھر کر عقائد حقہ، اعمال صالحہ، اخلاق فاضلہ، صفائی معاملات، حسن معاشرت، پاک باطنی، درستگی قلب، اخلاص فی الدین تقویٰ و احسان، کمال دین اور اعلیٰ یقین و ایمان کا مجموعہ نظر آتا تھا۔ جہاں طریقت و شریعت کی دوئی کا فسانہ حرف غلط، جہالت، کم نگہی اور ناواقفیت کا فسوں تھا۔ جہاں اس چیز کی پیہم اور متواتر تعلیم و تلقین تھی کہ طریقت عین شریعت اور شریعت عین طریقت ہے جہاں بار بار یہ ذہن نشین کرایا جاتا تھا کہ اسلامی جادۂ معرفت میں کسی رہبانیت، تجرّد، عزلت نشینی خلق سے گوشہ گیری، قطع علائق و ترک خلائق کی گنجائش نہیں۔ جہاں عملاً و قولاً یہ بتایا جاتا تھا کہ دین و دنیا کی تفریق ایک جاہلی تصوّر، غیر دینی نظریہ اور رزم گاہِ حیات سے فرار اور حقائقِ زندگی سے گریز پر فریب سراب ہے۔ جہاں پورے اذعان و یقین سے یہ حقیقت منکشف ہوجاتی تھی کہ نفس کشی، جسمانی اذیتیں، آزارِ نفس، ترکِ لذائذ سلوک کا مقصد نہیں۔ جہاں انفرادی و اجتماعی حقوق کی ادائیگی کی یکساں تلقین تھی۔ جہاں معاشرے کے تقاضوں اور ملی فرائض و واجبات کا پورا کرنا طریق ہی کا اہم جزو بتایا جاتا تھا۔ جہاں فرد و جماعت میں جدائی، ظاہری و باطنی اعمال میں تضاد، اور امورِ معاش و معاد میں کوئی غیریت نظر نہیں آتی تھی۔ جہاں ایک ایک لفظ و جملہ، ایک ایک تصریح و اشارہ اسلام کی جامعیت ،

وسعت ہمہ گیری، سہولت و آسانی، نورانیت و پاکیزگی، نرمی و لطافت، سلیقہ و حکمت ربط و ضبط، انضباط و ترتیب، تدریج و تبشیر کے الٰہی اصولوں کی تفسیر و تعبیر تھا۔ جہاں کی صحبت اور طریق کی جامع اور دلنشین تشریح ہر عامی و عالم پر سلوک کی اہمیت و ضرورت کو ثابت کردیتی تھی۔ جہاں فلسفیانہ موشگافی متصوفانہ تعلی، مغلوبانہ شطح اور غلط رسوم و قیود کا گذر نہ تھا

سلوکِ سلیمانیؒ

سلوکِ سلیمانیؒ کی روشنی تمامتر مشکوٰۃِ نبوتؐ سے مقتبس تھی۔ بیرونی اثرات اسے بالکل دھندلا نہ کرسکے کہ ہمارے سیرت نگارؒ نبوئی کو سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیتِ کبریٰ سے پورا فیض پہنچا تھا۔ اور دین کامل کا مرقع ہر آن ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ نبوتؐ کے ظاہری و باطنی جمال و کمال کا پرتو ان کے چہرے کا نور اور ان کے قلبِ مطہر کی روشنی تھا ان نے اپنی زندگی کا حاصل اس وجودِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خد و خال، شمائل و اعمال، کلام و پیام کے پیش کرنے کو سمجھا تھا۔ جو صفاتِ الٰہیہ کا مظہرِ کامل، بشریت کا معراج عبدیت کا اوجِ کمال اور باعثِ تخلیقِ کائنات تھا۔ اس لئے سلوکِ سلیمانی کی تمامتر ضیا پاشیاں اسی ذاتِ جمیل صلی اللہ علیہ وسلم کی جلوہ سامانیوں سے تھیں اور اس آئینہ کی کلی جلا اسی شبیہہ قدس کے سینہ باصفا کے انوارات سے تھی۔ چنانچہ حضرۃ الشیخ الامام قدس سرہ کے نزدیک شریعت و طریقت کا حاصل صرف رضائے حق کی طلب میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ظاہری و باطنی کامل اتباع و متابعت ہی تھا۔ اسی سبب سے سلوک سلیمانیؒ کا کمال اس کی جامعیت، ہمہ گیری، ظاہر و باطن کی یکجائی، دین و دنیا کی وحدت، انفرادی و اجتماعی احکام کا اجتماع اور شریعت و طریقت کی عینیت تھا۔

• حضرت سید الملۃ رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم وفیوض کو عصر حاضر میں پیش کرنے کا جو سلیقہ وشرف حاصل ہوا تھا۔ وہ محض موہبت الٰہی اور عطیہ ربانی تھا۔ سلوک کو جس سلجھے ہوئے نبوی رنگ میں حضرت والا نور اللہ مرقدہ نے پیش کیا، یہ انہیں کا حصہ تھا۔ یہاں سلوک کا ایک ایک حرف ونقطہ کتاب وسنت کی روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ انوار ربانی اور فیوض نبوتؐ کی تابانی سے طریق کا ایک ایک گوشہ وادیِ طور اور دشتِ ایمن ہے۔ جہاں دن کی پوری روشنی ہے اور کسی قسم کا ابہام والتباس نہیں۔ ہر راہی سلوک کے اس آسان وسادہ "صراطِ مستقیم" پر چل کر بغیر کسی فسادِ قلب ونظر اور خوف وخطر کے منزل پر پہنچ سکتا ہے کہ مقاصد واضح ہیں۔ طریق متعین ہے۔ راہ کھلی اور کشادہ ہے۔ اب ہر سالک حدود کی رعایت کرتے ہوئے اختیاری امور پر عمل پیرا ہو کر بآسانی سنتِ نبوی کے ظاہری وباطنی اتباع سے اپنی زندگی کو سنوار سکتا ہے اور رضائے الٰہی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ کہ سلوک کا مقصد صرف شریعت مطہرہ کے ظاہری وباطنی جملہ احکام کے امتثال ومتابعت سے اللہ تعالیٰ کی رضائے تامہ اور قرب خاص حاصل کرنا ہے کہ رضائے حق سے بڑھ کر کوئی دولت اور اعلیٰ مقصد نہیں ہو سکتا (وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہی سب سے بڑی چیز ونعمت ہے) اور یہ رضا حبیبِ خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل ومکمل (ظاہری وباطنی) اتباع میں منحصر کر دی گئی ہے (اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ) وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ" ارشادات ربانی ہیں۔ یعنی حب الٰہی کا اگر دعویٰ ہے اور محبوبیت الٰہی کے طلبگار ہو تو

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کامل اتباع اختیار کرو۔ خدا تمہیں اپنا پیارا بنا لے گا۔ کہ اطاعتِ رسول خدا تعالیٰ کے حکم ہی کا ماننا ہے)

"رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ" کا مژدہ جانفزا انہیں خوش نصیبوں کے لئے ہے جو کامل اخلاص سے سیّد عالم (روحی فداہ) صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر و باطن کو اپنا سکے اور اس جمال جہاں فروز سے اپنی خلوت و جلوت، عقائد و اعمال، اخلاق و کردار، معاملات و معاشرت کو زینت بخش سکے۔ جن کی جملہ نسبتوں پر نسبت محمدیہ اسی طرح غالب آگئی کہ ان کی ہر ادا عکسِ جانانہ بن گئی۔ "اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ" کی شانِ حقیقت ان کے ہر عقیدہ و نظریہ کا حاصل، ان کے ہر حال و عمل سے ہویدا و نمایاں اور پرتوِ نبوی سے ان کا ظاہر و باطن جگمگا اٹھا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا قرب و رضا اور محبوبیت اسی قدر حاصل ہوتی ہے۔ جس قدر اخلاص سے حبیب خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع (ظاہری و باطنی) نصیب ہو جائے۔

حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ نے سلوک کی جو تشریح فرمائی ہے۔ اس میں یہ حقیقت کلیۃً واضح اور مبرہن فرما دی ہے۔ کہ سلوک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جملہ ہدایات و تعلیمات اوامر و احکام کی بکمال اخلاص اور بدرجۂ احسن تعمیل و تکمیل کا نام ہے جو انسانی زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی، ظاہری و باطنی، روحانی و جسمانی اعمال و افعال، کوائف و احوال کو گھیرے ہوتے ہے، اخلاص و تقویٰ والا ہر عمل سالک کو رضائے الٰہی سے مشرف کر دے گا۔ خواہ یہ عمل حقوق اللہ۔ ایمانیات و عبادات کی قبیل سے ہو یا حقوق العباد اخلاق و معاملات و معاشرت و سیاست وغیرہ سے تعلق رکھتا ہو۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندگی کا کامل و مکمل، جامع و مانع دستور العمل لے کر تشریف لائے تھے

جس کا جزو کل رضائے الٰہی کا مورد اور محبوبیت ربانی کا سبب ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کبریٰ اور تکمیلی شان کا تقاضا ہی یہ تھا اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کا سلوک زندگی کے ہر گوشہ میں طے ہوا تھا۔ وہ جس طرح رات کے راہب اور دن کے شاہسوار تھے اسی طرح صفہ کا چبوترہ تجارت کی منڈیاں، زراعت کے کھیت ان کی سیر سلوک کا جادۂ پا افتادہ تھے۔ گھریلو تعلقات (ازدواجی زندگی) اور قیصر و کسریٰ سے آویزشیں دونوں سے طریق کے مراحل طے ہوتے تھے۔ ان کے لئے علم و ذکر کے حلقے، مسجد کی زندگی، ہجرت و نصرت و انفاق، قتال و جہاد جس طرح قرب و رضائے الٰہی کا زینہ تھا۔ اسی طرح باہمی معاملات و معاشرت، اخلاق و تعلقات، مزدوری و تجارت، زراعت و صنعت، سیاست و جہانگیری، جہانداری و جہانبانی ہر چیز امر الٰہی کی اطاعت و حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری و سنت کے اتباع کی بنا پر الٰہی فوز و فلاح اور ربانی انعام و رضوان کا ذریعہ تھی۔ ان کے ہاں دین و دنیا ظاہر و باطن کی تفریق نہ تھی۔ بلکہ زندگی کا ہر عمل الٰہی رنگ میں رنگین اور سنت نبوی کے مطابق تھا۔ اسی وجہ سے مالک کی خوشنودی کا سبب اور اجر و ثواب کا دلانے والا تھا کہ اسلام رہبانیت لے کر نہیں آیا تھا۔ وہ تعطل، تجرد، ترک دنیا اور کشمکش حیات سے گریز و فرار کا نام نہیں، بلکہ وہ انسان کو مصاف زندگی کا جوانمرد سپاہی دیکھنا چاہتا ہے اور دنیاوی تقاضوں میں الجھ کر دلدار ازل سے دائمی تعلق، اوامر ربانی کی کامل پابندی اور سنتِ نبویہ کے اتباع کا داعی ہے کہ انسانی راہ معرفت مجاہدہ کی اُس گھاٹی سے ہو کر نکلی ہے۔ جہاں نفسانی خواہشات کے علی الرغم پابندی احکام لازم کر دی گئی ہے۔

انسانی شاہراہِ معرفت اللہ تبارک و تعالیٰ کی حکمت نے ازل ہی میں یہ طے

فرما دیا تھا کہ انسان کا عرفانِ الٰہی کا راستہ اور قرب و رضوانِ ربانی کے حصول کا طریقہ فرشتوں اور دگر مخلوقات سے جداگانہ اور علیحدہ ہوگا۔ فرشتوں کی طرح موانع کے بغیر مشاہدہ حق اور غیر اختیاری احکامِ الٰہی کی تابعداری اس کی خوبی و کمال نہ ہوگا۔ نہ ہی وہ فطرتاً اوامرِ الٰہیہ کی پابندی پر مجبور و مجبول ہوگا۔ بلکہ بنی آدم کا شرف و مجد موانع اور علائق کی موجودگی میں ذاتِ حق میں اشتغال ہوگا۔ اور وہ اپنے ذہنی اختیار، تمیزِ خیر و شر کو استعمال کر کے اپنی نفسانی خواہش کو روک کر احکامِ الٰہیہ کا اتباع اور نواہی سے اجتناب کرنے والا ہوگا۔ اس کی راہ سلوک مجاہدات کی گھاٹیوں میں سے ہو کر گذرے گی۔ بنی آدم کے لئے رضائے الٰہی کا حصول، جنت کا داخلہ، اس کی فطرتی اور باطنی صلاحیتوں اور استعدادوں کی جلا و ترقی سب اسی "مجاہدہ" کی راہ سے مقدّر فرمائی گئی۔ "حُفّت الجنّۃ" بالمکارہ وحُفّت النار بالشھوات" (جنت کو نفس پر) گراں اعمال سے ڈھانک دیا گیا اور دوزخ پر خواہشاتِ نفسانی کا پردہ ڈال دیا گیا) اسی حقیقت کی نبوی خبر ہے۔

حکمت الٰہی نے انسان کے لئے مجاہدہ کی گھاٹی، دنیاوی زندگی کو بنایا۔ کہ دنیا اور اس کی جملہ اشیاء کو زیب و زینت سے ڈھانک دیا۔ اور انسان میں ان چیزوں کی طلب اور تمتع کی لامحدود خواہش رکھ کر اس کے لئے دنیا اور اشیائے دنیوی میں کشش و دلربائی رکھدی۔ لیکن بنی آدم کے دائمی فائدہ، اس کے باطنی اور اخلاقی جواہر کی حفاظت و ترقی، اس کی اعلیٰ استعداد کے بچاؤ اور نمو کے لئے انسانی خواہش نفس کے مطابق دنیا اور دنیوی اشیاء سے لامحدود استفادہ اور تمتع کی اجازت نہیں دی۔ کہ اگر بنی آدم کو اس کی لامحدود خواہش نفس (ہوئی) کے مطابق اس محدود دنیا اور

اس کی اشیاء کے حصول و استعمال کی اجازت دے دی جاتی۔ تو انسانی حرص و آز کا شکار ہو کر یہ معمورۂ ارضی دائمی فساد و بربادی کا گہوارہ بن جاتا۔ کہ انسانی حرص کی آگ اتنی شدید ہے کہ اگر ایک شخص بھی پوری دنیا اور اس کی جملہ اشیاء کا مالک بن جائے تو اس کی خواہشِ نفس "ھل مِن مزید" پکارتی رہے اور اس کا نفس پیہم یہی صدا لگاتا رہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں ولیکن پھر بھی کم نکلے[1] (غالبؔ)

اس لئے اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ نے اس محدود اور ختم ہو جانے والے عالم میں انسان کی خواہشات کو نہ تو بالکل مٹانے کا حکم دیا۔ اور نہ ہی اسے دنیاوی چیزوں کے جائز تمتع اور استعمال سے روکا۔ بلکہ اس کی خواہشِ نفس کو حدود و احکام الٰہی کا پابند کر دیا۔ کہ وہ رزمگاہِ حیات کی پیہم کشاکش میں خواہشات و نفسانی تقاضوں کے

---

[1] یہ محدود عالم انسانی خواہشاتِ لامتناہی کے پورا کرنے کی صلاحیت اپنے اندر نہیں رکھتا۔ بلکہ انسانی خواہشات کے پورا ہونے کا مقام جنت ہے۔ جو اپنے لامحدود انعامات اور مبدم کن فیکونی موجودات سے انسان کی کامل تسلی و تشفی کر دے گا۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ (جنت میں تمہارے لئے ہر وہ چیز ہو گی جسے تمہارے نفس چاہیں گے اور جنت میں جو کچھ تم مانگو گے تمہیں ملے گا مغفرت والے بار بار رحم کرنے والے (اللہ) کی طرف سے یہ مہمانی کے طور پر ہو گا۔

انسانی نفسانی اشتہاء (چاہت) کی سیری بس جنت ہی میں ہو گی، اور اس دنیا میں اسکی طمانیت لامتناہی اور لامحدود صفات والی ذات عالی اللہ سبحانہٗ و تقدس کے تعلق و قرب و رضا کے بقدر ہو گی ؎

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست ، جز بخلوت گاہ حق آرام نیست
(اشرفؔ)

علی الرّغم احکامِ الٰہی کی پابندی، حدود اللہ کی حفاظت، حق و باطل کی تمیز و جائز و ناجائز کا فرق برتتا رہے اور اپنی طبیعت کے غلط میلان کو روک کر اوامر الٰہیہ پر چلنے والا بنے۔ اس کشمکش میں انسانی نفس و طبیعت پر جو گرانی و کلفت آتی ہے۔ اس کا اختیاری طور پر" برداشت" کرنا ہی وہ "تکلیف" و "مجاہدہ" ہے جو بنی آدم کا شرف و امتیاز ہے اور اس کی راہ معرفت کو فرشتوں اور دوسری مخلوقات سے ممیّز و ممتاز کرتا ہے اور اسی مُجاہدہ کا اختیار و عمل بنی آدم کی جملہ" انسانی ترقیات" کا ذریعہ ہے۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ دنیا اور اشیائے دنیوی کی زیب و زینت، ان کی دلکشی و دلفریبی کو انسانی آزمائش و ابتلا بنا دیا گیا ہے اور دنیاوی حیات کو اس کی امتحان گاہ قرار دیا گیا ہے۔ جہاں ہر قدم پر یہی صدا آتی ہے ؎

ہشدار کہ رہ بردمِ تیغ است قدم را

ہر رہگذار پر لغزشِ پا کا اندیشہ ہے۔ اور کسی آبلہ پا کا اس خارزار سے صحیح و سلامت گذر جانا محض توفیق الٰہی کا کرشمہ ہے۔ یہی وہ گھاٹی ہے۔ جس کا خیریت و سلامتی سے پار کر لینا انسان کو الٰہی فوز و کامرانی اور دائمی نجات و کامیابی سے ہمکنار کر دیتا ہے کہ فریبکدۂ عالم کی جملہ زیبائشوں اور بوقلموں رنگینیوں کے باوجود ان میں نہ اُلجھنا اور دلدارِ ازل کی رضا و احکام کو ہر آن پیش نظر رکھنا باہمت انسان ہی کا کام ہو سکتا تھا۔ جس میں کوئی دوسری مخلوق اس کی شریک و سہیم نہیں۔ بقول اقبال ؎

نہ کر جبرئیل تو تقلید میکہ جذب ومستی کی
تن آساں قدسیوں کو ذکر وتسبیح وطوافِ اولیٰ

اور موت وحیات کے نظام کے قیام کا سبب اور دنیوی زینت بخشی کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کو آزمایا جائے کہ کون ان گوناگوں رکاوٹوں کے باوجود حسن عمل کا نمونہ پیش کرکے "ابتلاء و آزمائش میں کامیاب ہوتا ہے" ارشاد ربّانی ہے

اَلَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ (وہ ذات) جس نے زندگی اور موت کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا شخص عمل میں اچھا ہے۔ (الملک-۱۱)

اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَی الۡاَرۡضِ زِیۡنَۃً تحقیق ہم نے زمین کی چیزوں کو اس کیلئے باعث لَّہَا لِنَبۡلُوَہُمۡ اَیُّہُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا رونق بنایا تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں سے کون زیادہ اچھا عمل کرتا ہے (الکہف-۱)

متعدد قرآنی آیتیں اسی حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہیں۔

غرض انسانی کامیابی کا مدار اور اس کی روحانی، باطنی اور جملہ ترقیات کا انحصار کارگہِ حیات کی کشاکش سے دوچار ہوکر اور دنیاوی مشاغل میں پھنس کر خواہی سے پرہیز اور احکامِ الٰہی کے اختیار میں ہے۔ اس لئے اسلام دنیاوی زندگی کے جملہ شعبوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ حیات اور سنت مطہرہ کے اپنانے کا داعی ہے کہ رضائے الٰہی کی طلب، حق کے اتباع، ایمان وتقویٰ کے حصول اور سنت نبویؐ پر چلنے کے لئے کیسے ہی دشوار مراحل

ناموافق حالات، ناسازگار ماحول سے گذرنا پڑے، نفس کو کلفتیں، طبیعت کو ناگواریاں برداشت کرنی پڑیں۔ دنیا کی باطل دلفریبیاں اور جھوٹی تابناکیاں دعوت نظارہ دیتی رہیں۔ بلوغ سے لے کر آخری سانس تک مرضیات الٰہی کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے اور احکام ربّانی کی "صراط مستقیم" سے لغزش نہ ہو

کہ موانع و علائق کی موجودگی میں حجلہ نشین ازل کے ساتھ ہر آن مشغولیّت، دائمی دھن اور دھیان اور احکام الٰہی کی پابندی ہی وہ مُجاھدہ ہے جو آزمائش کدۂ عالم میں انسان کی کامیابی اور سرفرازی کا باعث ہے اور یہی اس کی شاہراہِ معرفت اور جادۂ سلوک ہے، ظاہر ہے کہ جو راہ عالم کے جھمیلوں میں سے ہو کر گذرے گی۔ اس کے راہی کے لئے گوشہ گیری، ترک علائق، عزلت نشینی دنیوی تقاضوں سے کلی فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ اسی بنا پر اسلام میں ترکِ دنیا اور رہبانیت کی اجازت نہیں اور اسلام کے صحیفۂ آسمانی نے رہبانیت کو 'بدعت' قرار دیا ہے اور اسلام میں رہبانیت، و ترک دنیا و قطع علائق نہ ہونے کا بڑا سبب یہی ہے کہ زندگی کا یہ طریقہ مجاہدات کے ان مواقع ہی کو کھو دیتا ہے۔ جو انسانی سلوک و طریق کا سرا امتیاز ہے۔

حضرت سید الملۃ قدس سرہ نے طریق کی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے ہمیشہ اسی نکتہ پر زور دیا کہ دین دنیا سے الگ کوئی چیز نہیں بلکہ باخلاص تمام احکام الٰہی کے مطابق دنیا کا استعمال دنیا کو دین بنا دیتا ہے اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

در کف جام شریعت در کف سندان عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سندان باختن

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے شاہکار خُطبہ راندیر میں 'اسلامی شاہراہ معرفت' کی اچھوتی توضیح وتفسیر بیان فرمائی ہے۔ یہ خطبہ سلیمانی علم ودانش، حکمت ومعرفت کا ایک دلچسپ نمونہ اور سلوک کا ایک البیلا اور درخشندہ نشان ہے۔ یہ خُطبہ "الجھد والجھاد لعلمی المعاش والمعاد" مسلمانان راندیر (گجرات) کی درخواست پر حضرت نے راندیر میں دیا تھا۔ آخری دور کی تقریر ہونے کی بنا پر پختگیٔ افکار، شریعت وطریقت کی جامعیت اور اعماق نظر کی ایک عجیب دستاویز ہے۔" انسانی شاہراہِ معرفت" اور اسلامی سلوک کی وضاحت کیلئے اس خطبہ کا بغور مطالعہ سرمہ سلیمانیؒ کا حکم رکھتا ہے۔ تمہید اور علم معاش و معاد کے متعلق دقیق ومحققانہ مباحث کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

"ہم نے تقریر کے شروع میں دو آیتیں پڑھی تھیں

۱ :۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

۲ :۔ وَعَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ

ایک کا تعلق اس علم سے ہے جو شروع آفرینش میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو سکھایا تھا۔ اور جس کو تعلیم اسماء فرمایا ہے۔ اور جسکی تشریح ہم نے علم آثار واوصاف وصفات وخواص اشیاء سے کی ہے اور انہیں چیزوں کی تحقیق اور علم پر دنیا میں بقائے انسانی اور اس کیلئے غذائے انسانی اور سامانِ ضروریاتِ انسانی موقوف ہے۔ اسلئے میرا ذوق ادھر جاتا ہے کہ یہ تعلیم ان علوم کی تھی جن کا تعلق 'علم معاش' سے ہے۔ وہ علم معاش، جو حق تعالیٰ کی معرفت اور اطاعت اور شکر نعمت کی طرف لے جائے۔

وَاشْكُرُوا اللهَ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ۔ — یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر کرو. اگر تم اسکی عبودیت اور بندگی کرتے ہو

انسان کی وہ ساری عبادتیں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ۔ دراصل وہ شکر ہی کی صورتیں ہیں۔ ملائکہ کی پیدائش تو طاعت واطاعت ہی کیلئے ہوئی ہے ۔ لَا يَعْصُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ ۔ ان کی شان ہے اور تسبیح وتقدیس ان کی غذا ہے۔ لیکن یہ اطاعت ان کے قصد واختیار سے نہیں۔ اسلئے موجبِ ثمراتِ قصد و ارادہ نہیں۔ اور پھر وہ طاعت واطاعت مشاغلِ دنیا اور افکار ومساعی خورد ونوش ودفع مضرات ورفع موانع اور مواقع صبر وشکر وقطع حرص وطمع وغیرہ رذائل فضائل اور انہماک حیاتِ دنیا کے لذائذ وآلام سے تمام تر خالی ہے۔ ملائکہ نے حضرت آدم کی غرض وغایت، اطاعت وطاعت کی وہ صورت سمجھی تھی۔ جو ان کیلئے اللہ تعالیٰ نے بتائی تھی۔ کہ دن رات وہ اس طاعت وعبادت میں مصروف رہیں۔ اور ان کا دوسرا کوئی شغل ہی نہیں ہے۔ جو اس طاعت وعبادت سے مانع ہو۔ اور نہ ان میں جذبات بہیمیہ اور ہوائے نفس ہے۔ جو ان کو بے قابو کرے۔ اِس لئے انہوں نے جب عرض کی :-

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (بقرہ ۴) — ہم تو آپ کی حمد وثنا میں لگے رہتے ہیں۔

تو ارشاد ہوا :-

اِنِّيْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (بقرہ ۴) — یعنی میں وہ جانتا ہوں۔ جو تم نہیں جانتے۔

اور وہ یہ تھا۔ کہ آدم کو طاعت و عبادت کی وہ راہ بتانی مقصود تھی جو مادیات و جذبات و خواہشوں کے بیچ سے ہو کر نکلی ہو۔

اس کیلئے ان کو آثار و صفات و خواص اشیاء کی تعلیم ہوئی جو فرشتوں کو نہیں ملی تھی کیونکہ ان کے کاموں کیلئے ان کی ضرورت نہ تھی۔ انہوں نے کہا

سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ۔ (بقرہ)

پاک ہے پروردگار تیرا ہر کام ہر اعتراض سے پاک ہے۔ ہم کو وہی معلوم ہے جو تو نے سکھایا۔ اصلی علم و حکمت تو تیرے ہی پاس ہے۔

غرض یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس وقت آدم کی صورت میں ایسی مخلوق بنا رہا تھا۔ اور اس کو اپنے اخلاق و صفات کی امانت سپرد کر رہا تھا۔ جو دنیا کو برت کر دین کو حاصل کرے۔ جو پیٹ کے جھگڑے میں پھنس کر قلب سے غفلت نہ برتے۔ جو دنیا کے لذائذ و نعم سے گزر کر لذت ابدی کی طالب ہو۔ جو ضلالت و غفلت کے ہر تماشہ سے دلیرانہ گذرے مگر اس میں پھنس کر خالق سے بے نیاز نہ ہو۔ جو دنیا کے مشاغل میں الجھ کر یاد الٰہی سے غافل نہ ہو۔ جس کی شان یہ ہو۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ (نور-۵)

ایسے لوگ جن کو دنیا کے کاروبار اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔

ہمارے حضرت والا (مولانا تھانوی) رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں ملائکہ کی راہ مشاہدہ کی اور انسان کی راہ مجاہدہ کی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ خالص طاعت و اطاعت اور تسبیح و تقدیس کی وہ شکل جو ملائکہ کو عنایت ہوئی ہے۔ اور جس کا ان کو دعویٰ تھا اس طاعت و اطاعت اور تسبیح و تقدیس کی شکل سے الگ ہے۔ جو بنی آدم کیلئے

مقدر فرمائی گئی۔ اِس لئے آدمؑ کو جو تعلیم فرمائی گئی۔ اِیس کا تعلق انہی علوم سے ہو سکتا تھا جس کی ضرورت ملائکہ کو نہ تھی .... غرض آغاز عالم میں تعلیم فطری کے گر بتا کر جو علم بخشا گیا ان کا تعلق ان علوم سے ہے جو انسانوں میں بغرضِ کسب معاش ودیعت رکھے گئے ہیں۔ اور جن کو ہم تجربہ اور عقل وقیاس سے معلوم کرتے ہیں۔ اور دوسرا علم، علمِ شریعت ہے۔ جو انسان کی مادی بقا کی اصلی مقصد و غایت ہے۔ اور جس کا ماخذ محض وحی الہی ہے۔ پہلے علوم پیٹ کے علاج ہیں۔ اور دوسرا علم قلب کی صلاح کی تدبیر ہے۔ اور انہیں دونوں پر عالم کی بقا و صلاح کا مدار ہے۔ علوم معاش پر بقا کا اور علوم قلب پر صلاح کا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کھانے کے بعد یہ دعا تعلیم فرمائی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ وَ سَقَانِیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

شکر ہے اِس اللہ کا جس نے مجھے کھلایا اور پلایا اور مجھے مسلمان بنایا۔

درحقیقت اِس دُعا میں ان دونوں نعمتوں کو یکجا کیا گیا۔ پیٹ کو جس کا متکفل علم معاش ہے۔ اور دل کو جو مسلم سے عبارت ہے۔ جس کی ضمانت علم معاد اور شرع کے ذریعہ سے فرمائی گئی ہے۔ اس موقع پر غذائے جسمانی کے ساتھ غذائے روحانی بھی یاد فرمائی گئی۔ اور پیٹ کے بھرنے کیساتھ قلب کے سنورنے پر بھی انسان نے اس مالک کی حمد ادا کی، جو اس پیٹ سے اصل مقصود ہے۔ پیٹ بھرنا نفس کی شرارت کیلئے نہیں جیسا کفار و فساق نے سمجھا ہے۔ بلکہ پیٹ بھرنا قلب کی صلاح کیلئے ہے کہ وہ دلجمعی سے حق تعالیٰ کی یاد میں مصروف اور اس کی طاعت و اطاعت میں مشغول رہے۔

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است
تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

دین اسلام میں بندہ پر طلب رزق حلال واجب ہے اور قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اُس کو وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ سے تعبیر فرمایا، یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت کی تلاش، تاجر صدوق کے بڑے بڑے مراتب ظاہر فرمائے ہیں۔ اور ان تاجروں کو جو جھوٹی قسموں اور جھوٹی تفاظیوں سے اپنی تجارت کو فروغ دیں۔ سخت وعید فرمائی گئی ہے۔ اسی طرح زراعت اور باغبانی کو بھی ایک نوع کی عبادت بتایا گیا ہے۔ کیونکہ ہر دانہ جو اس محنت سے نکلتا ہے۔ اور ہر پھل جو اس سے پیدا ہوتا ہے انسان تو انسان پرندے بھی اس کو کھاتے ہیں۔ وہ انسان کے ثواب کو بڑھاتے ہیں اسی طرح اہل و عیال کیلئے جو کوشش کی جاتی ہے۔ اور ان کے منہ میں جو لقمہ بھی جاتا ہے وہ مرد مومن کیلئے اجر کا باعث ہوتا ہے۔ اسی طرح معاملات داد و ستد میں حسن سلوک قرضہ حسنہ صدقات و خیرات و تبرعات غرض جملہ مالی معاملات جو لوجہ اللہ اور تحتِ حکم الٰہی ہوں رضائے الٰہی کا موجب ہیں۔ علیٰ ہذا سلطان عادل بھی زمین پر خدا کی رحمت کا سایہ ہے، سلطنت و حکومت، نظم و نسق، عدل و انصاف، جہاد و غزا، فصلِ قضا اور وہ تمام امور جو سیاست سے متعلق ہیں وہ تحتِ احکام الٰہی عبادات میں داخل ہیں پھر مصائب پر صبر، مشکلات میں توکل علی اللہ، استقامت فی الدین اور اسی قسم کے دوسرے اخلاق و فضائل بھی قرب الٰہی کے ذرائع ہیں۔ میرا مقصود اس بیان سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازل ہی میں جب آدم کو مسجودِ ملائک بنایا تو یہ طے فرما دیا تھا کہ نسلِ آدم کیلئے معرفت و عبادت اور قرب الٰہی کے راستے اور وسیلے اور ذریعے فرشتوں کی خاص تسبیح و تقدیس کے ذریعوں سے جن کو وہ قرب و رضائے الٰہی کا تنہا ذریعہ سمجھتے تھے، الگ ہیں اور اس نے مجاہدہ کی اس دشوار گذار گھاٹی سے نکال کر بنی آدم کیلئے

اپنی معرفت و اطاعت کی شاہراہ الگ مقرر فرمادی تھی۔ سورہ بلد میں اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ اَيَحْسَبُ	ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے
اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ يَقُوْلُ	کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس پر کوئی قابو نہیں
اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا اَيَحْسَبُ اَنْ	پا سکتا، کہتا ہے کہ ہم نے بڑا مال اپنا برباد
لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ	کیا، کیا اس کا یہ گمان ہے کہ اس کو کوئی نہیں
عَيْنَيْنِ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ	دیکھتا۔ کیا ہم نے اسکی دو آنکھیں، ایک
النَّجْدَيْنِ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَ	زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے۔ اور اسکو
مَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ	(خیر و شر) کے دونوں راستے سوجھائے،
رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ يَوْمٍ ذِیْ	وہ گھاٹی میں سے ہو کر نہیں نکلا اتمہیں
مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْنًا	کس نے بتایا کہ وہ گھاٹی کیا ہے (غلامی
ذَا مَتْرَبَةٍ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ	یا قرض سے دبی ہوئی) گردن (کی بندش کو)
اٰمَنُوْا وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا	کھولنا یا بھوک کے دن میں کسی قرابت دار
بِالْمَرْحَمَةِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ	یتیم یا خاک میں پڑے ہوئے محتاج کو کھانا
الْمَيْمَنَةِ ط	کھلانا پھر یہ کہ وہ ایمان والوں میں سے ہو

اور مجاہدات میں برداشت کی اور آپس میں مہر و شفقت کی ایک دوسرے کو نصیحت کریں۔ یہی لوگ داہنے ہاتھ والے ہیں۔

اب اجمال کے طور پر یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں مشقت اور محنت اور مجاہدہ ہی کیلئے پیدا ہوا ہے۔ اس کو دین یا دنیا میں جو کچھ ملے گا

اِس کی محنت و مشقت ہی سے مل سکے گا جیسے دوسری جگہ فرمایا ہے۔

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی اور نہیں انسان کیلئے لیکن وہی جس کی اس نے کوشش کی۔ (نجم - ۲)

اِسی لئے اس کو دولت عطا فرمائی۔ اِسی لئے آنکھیں، زبان اور ہونٹ اور دوسرے اعضاء اس کو عنایت ہوئے کہ ان سب کو حکم الٰہی کے ماتحت کام میں لاکر دنیا اور آخرت کے مدارج حاصل کرے اس کو خیر و شر کی دونوں راہیں بتادی گئیں

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا اِس کو گناہ گاری اور پرہیز گاری دونوں کا الہام کر دیا گیا۔ (شمس - ۱)

اب اس کا فرض ہے کہ وہ اس گھاٹی میں سے ہو کر پار نکلے۔ اور منزل مقصود تک پہنچے۔ یہ گھاٹی کیا ہے۔ وہ ایمان و عمل صالح کا حصول اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پوری طرح ادا کرنا۔ غرض یہ ساری آتیں " بنی آدم کی شاہراہ معرفت " کی نشاندہی کررہی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تسبیح و تقدیس کے ملکوتی طریق معرفت کے ساتھ ساتھ اِس کے علاوہ بنی آدم کے لئے مزید ذریعے اور طریقے جو خاص انہیں کیلئے مخصوص تھے مقدر فرمائے اور

اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

کا ارشادِ الٰہی پورا ہوا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ فرشتوں سے الگ انسانوں کیلئے اور نسل بنی آدم کیلئے جو امور و معاملات ان کی زندگی کے مقررہ اوقات کے بخوبی بسر کرنے کیلئے مقدر فرمائے ہیں وہ معرفت الٰہی اور طاعتِ الٰہی کے ذرائع اور وسائل ہیں۔ اور یہی نسل بنی آدم کی قربت و فضیلت ہے

کہ وہ معاشی ومعادی دونوں مجاہدات سے گزر کر اللہ تعالیٰ تک پہونچ سکتی ہے۔

اس تشریح سے یہ واضح ہے کہ انسانی "راہ معرفت" زندگی کی دنیاوی مشغولیتوں معاشرتی تقاضوں، معاشی مصروفیات اور جسمانی ضروریات کے حصول کی کوششوں کے بیچ میں سے ہوکر نکلی ہے۔ اس لئے انسان کا کمال ترکِ معاش، گوشہ گیری، رہبانیت اور دنیاوی تعلقات سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں۔ بلکہ دنیا میں رہ کر ایک طرف بندوں کے حقوق ادا کرنا، حسن معاشرت، خوبیٔ معاملات، اخلاقِ فاضلہ، عدل وانصاف کی نظریں قائم کرنا ہے۔ اور دوسری طرف مخلوق میں رہتے ہوئے دنیاوی اشیاء کو جائز طریقہ سے استعمال کرتے ہوئے اپنے قلب کو اپنے خالق کیلئے فارغ، اسی میں شاغل، اسی کی یاد میں مست، اسکی عبادت میں مشغول رکھنا ہے اور ہر حال میں اس کے احکام کا پابند رہنا ہے کہ علوی اور سفلی کوئی چیز ذات حق کے سوا اسکے نہاں خانہ دل میں بار وقرار نہ پا سکے۔ زندگی کے ہنگامے اس کے قلبی سکون کو تہ وبالا، اور مخلوق کا استعمال اسے خالق سے بے فکر نہ کرسکے۔ یہ عالم اس کیلئے مرآۃِ جمال حق ہو اور معرفت وکمالِ الٰہی کا آئینہ، وہ ہر چیز کو برتے لیکن اسکا آبگینۂ قلب اشیاء کی کثافتوں سے گدلا ہوکر نہ رہ جائے اس کی نگاہیں زمین وآسمان کی دلفریب وسعتوں میں گم نہ ہوسکیں۔ اور سرابِ حیات اسے آخرت کی زندگی سے غافل نہ کردے۔ غرض اپنے جسد و روح، دل ونظر کی کامل حفاظت کرتے ہوئے اس آزمائش کدۂ عالم سے گذرنا ہے۔ تاکہ اسکی صلاحیتیں اور استعدادیں روبکار آسکیں۔ اور وہ اس 'ابتلا' میں کامیاب ہوسکے جو اس کا منشائے تخلیق ہے۔ اور جس کیلئے اسے فریب کدہ عالم میں بھیجا گیا ہے ؎

دل ونظر کا سفینہ سنبھال کر لیجا   مہ وستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب

سلوک رہبانیت کا نام نہیں

مرورِ ایام سے حقیقی تصوّف و سلوک پر جو توبرتو پردے پڑ گئے اور ان کی وجہ سے جو عظیم الشان غلطیاں شائع ہو گئیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سلوک کا نام لیتے ہی ترکِ دنیا، عزلت نشینی، گوشہ گیری، نفس کشی، قطع علائق اور رہبانیت کا نقشہ نگاہوں میں آجاتا ہے۔ انہیں تصوّرات کی وجہ سے دین و دنیا کی دوئی کا افسانہ تراشا گیا۔ اور یہ سمجھا جانے لگا کہ دنیا کے ہوتے آخرت کا ملنا محال ہے۔ بیوی بچوں کی موجودگی میں ذات باری کا تعلق واہمہ اور زمینی بادشاہت کے ساتھ آسمانی جنت و بادشاہی میں داخلہ خام خیالی ہے۔ اپنے جسم کو اذیت دینا بندگی قرار دیا گیا اور اس کا نام 'مجاہدہ' قرار پایا۔ قطع علائق کو قرب الٰہی کا ذریعہ اور ترکِ دنیا کو حصولِ آخرت کا سبب گردانا گیا۔ عزلت نشینی، خلق سے گوشہ گیری، تقدس اور پرہیزگاری کی علامت ٹھہری۔ اور تعطّل کا نام "توکل" رکھ دیا گیا۔ غرض دین و دنیا میں تفرقہ کی ایسی پائیدار اور نمایاں لکیر کھینچ دی گئی کہ دنیا دار اور دین دار، اللہ والے اور دنیا کے طالب دو ممیّز اور علیحدہ گروہ قرار پا گئے۔ جن کے دائرے قطعاً جداگانہ ہیں۔ اور ہر ایک اپنی اپنی حدود پر قائم ہے اور دونوں فریق ایک دوسرے سے بیگانہ اور ناآشنا ہیں۔ دیندار طبقہ

دنیا میں اُلجھنا گناہ سمجھتا ہے اور اہلِ دُنیا سلوک کی راہ پر چلنا اور دینی فضائل و مزایا کے حصول کو اپنی استعداد و معیار سے بلند سمجھتا ہے۔ غرض دونوں طبقات میں تفریق و جدائی کی غیر فطری اور غیر اسلامی تقسیم ہو چکی ہے۔

ہمارے حضرت والا قدس سرہ نے ہمیشہ اس غلط تقسیم، اور جاہلی نظریہ کی تردید فرمائی اور ہمیشہ دین و دنیا کی وحدت، عبادات کی وسعت، مجاھدات میں سہولت، جائز تعلقات کی بقا اور اس کے نبھاؤ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا درس دیتے رہے اور ان غلطیوں اور گمراہیوں کا ازالہ فرماتے رہے جس نے سلوک کی افادیت کو ایک دائرہ میں محدود اور طریق کی ضرورت و اہمیت کو انتہائی گھٹا کر رکھ دیا ہے کیا عجیب ہے کہ طریق جو شریعت مطہرہ ہی کا ایک اہم جزو ہے۔ اس کی اہمیت اپنوں کی مشکل پسندیوں اور غلط کوشیوں کی بناء پر اُمت کے ایک کثیر طبقے کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ اسلامی سلوک کے منور چہرے سے پیہم ان سیاہ پردوں کو دور فرماتے رہے۔ چنانچہ آئندہ اوراق سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے

دین و دنیا کی وحدت

حضرت سید الملت رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

" ان عظیم الشان غلطیوں میں جن میں لوگ ہمیشہ مبتلا تھے۔ ایک یہ تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ دین و دنیا دو مختلف چیزیں ہیں۔ دونوں کا دائرہ الگ الگ ہے جو دین کو اختیار کرتا ہے، دنیا سے علیٰحدہ ہو جاتا ہے اور جو دنیا اور زخارفِ دُنیا پر نظر ڈالتا ہے۔ اس کے ہاتھ سے دین کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔ اس خیال نے اگرچہ

ایران، ہندوستان، چین اور دیگر ممالکِ مشرقیہ میں عملی شکل اختیار کر لی تھی۔ اور راہبانِ صومعہ نشین اور بادشاہانِ لشکر شکن کے حدودِ زندگی اور دائرہ عمل میں ایسی حدِ فاصل قائم کر دی تھی۔ کہ دونوں کا اجتماع و تعاون تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ تاہم اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ وہ قومیں تھیں جو اپنے کو صحائفِ آسمانی کا پیرو اور سفیرانِ الٰہی کا مخاطبِ اول سمجھتی تھیں۔ ہندو بدھ، کنفوشی اور زردشتی نقطۂ نظر سے زیادہ قابلِ غور وہ تخیل تھا جس میں انسانوں کی تقسیمیں کر دی گئی تھیں کہ ان میں کچھ دین کے کارکن تھے اور کچھ دنیا کے، ہندوؤں میں خلقتہً برہمن دین کے لئے اور راجپوت بادشاہی کے لئے اور ویش تجارت اور کاشتکاری کے لئے اور شودر محنت اور مزدوری کے لئے تھے اور ان کی عمروں کی بھی تقسیمیں کر دی گئی تھیں۔ کہ تیس برس تعلیم کے لئے، تیس برس دنیا کمانے کے لئے اور تیس برس عبادت کے لئے، بودھوں میں بھکشو الگ کر دیئے گئے تھے۔ جن کا کام صرف دھرم سیوا تھا۔ اور دنیادار الگ تھے۔ جو دنیا کا کاروبار کرتے تھے۔ اور جن پر بھکشوؤں کے تمام اخراجات کا بار تھا۔

یہودیوں میں لاوی دین کے کاہن تھے۔ وہ دنیا کے کاموں سے الگ رکھے گئے تھے۔ وہ خاندانی ترکہ و وراثت سے بھی محروم تھے۔ کہ یہ دنیا کی چیزیں تھیں اور باقی لوگ دنیادار تھے۔ عیسائیوں نے اس انقسام کی دیوار کو اور زیادہ بلند کر دیا تھا۔ انہوں نے تو خدا اور قیصر اپنے دو حکمراں فرض کئے تھے۔ اور یہ تعلیم پائی تھی کہ جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو۔ اور جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو۔ یہود و نصاریٰ نے اس غلط خیال کے مطابق اپنے کو ڈھالنے کی جس طرح کوشش کی، اس کی عملی

شکل دو متضاد طریقوں سے ظاہر ہوئی۔ یعنی یہود نے دنیا و عقبیٰ کا حاصل دنیا کو سمجھا، اور نصاریٰ نے عقبیٰ کو۔ یہود کی حکومت و سلطنت، مال و دولت اور تمام سودی کاروبار کا مبنی صرف یہ خیال تھا۔ کہ انسان کے اعمال و افعال کا مرجع دنیا ہے اس لئے انہوں نے دین کو بالائے طاق رکھ کر اپنی توجہ تمام تر دنیاوی چیزوں تک محدود رکھی، اور ہر نیکی کا معاوضہ اسی دنیا کو سمجھا۔ اور اسی لئے ان میں ایک بڑا فرقہ وہ تھا۔ جو صرف دنیاوی انعامات پر اعتقاد رکھتا تھا۔ اور آخرت کا قطعاً منکر تھا۔ بخلاف اس کے اگلے نصاریٰ نے زخارفِ دنیوی کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ وہ ہر نعمت کو آسمانی بادشاہت میں تلاش کرتے رہے۔ اس لئے راہبانہ طریقۂ زندگی اور زاہدانہ طرزِ معیشت اختیار کیا۔

لیکن پیغمبر اسلام علیہ السلام کے ذریعے سے جب اسلام آیا۔ تو اس نے دنیا کی اس قدیم غلط فہمی کو دور کیا اور بتایا۔ کہ یہ دونوں چیزیں دو نہیں، بلکہ ایک ہیں دین دنیا ہے اور دنیا دین ہے۔ دین میں جب خواہشاتِ نفسانی شامل ہوں تو دنیا ہو جاتا ہے۔ اور دنیا میں احکام الٰہی کا تتبع پیشِ نظر ہو تو دین ہو جاتی ہے۔ اس طرح جو چیز ان دونوں کے درمیان حدِّ فاصل قائم کرتی ہے۔ وہ انسان کا نقطۂ نظر ہے۔ اگر وہ صحیح ہو تو پھر یہ حد بھی قائم نہیں رہتی اور دونوں چیزیں ایک ہو جاتی ہیں۔ وہی حکومت و سلطنت جس کو دنیا سمجھا جاتا ہے اگر وہ خدا کی مرضی کے لئے کی جائے تو دین ہو جاتی ہے۔ مال و دولت جمع کرنا دنیا ہے۔ لیکن رضائے الٰہی پیشِ نظر ہو۔ تو دین ہو جاتا ہے۔ خودکشی دنیا ہے۔ لیکن اگر فرائضِ خداوندی کی تعمیل میں اس کو اختیار کیا جائے۔ تو شہادت کی شکل پاکر دین ہو جاتی ہے پیغمبر

اسلام (فداہ ابی وامی) صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی تشکل میں ہم کو یہ صورت بتلائی آپ ہی کی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قیام لیل، عبادتِ شبانہ، تلاوتِ قرآن، تبلیغ احکام، غزوات وفتوحات، مہمات سلطنت کی مصروفیات، غرض آپ کی سیرت کا ایک ایک واقعہ دین بھی تھا۔ اور دنیا بھی، عین اس وقت جب آپ پر سکندر و قیصر ہونے کا دھوکہ ہوتا تھا۔ آپ سفیرِ الٰہی اور فرشتۂ یزدانی نظر آتے تھے۔ آپ کے بعد آپ کے خلفاء اور صحابہ رضوان اللہ علیہم نے بھی اس نکتہ کو واضح کیا۔ اور ان کے تمام کارنامہائے زرّیں کے اندر وہی روح نظر آتی، جو دین اور دنیا کی ترکیب و امتزاج سے پیدا ہوئی تھی۔ اور جو قرآن پاک کے منشاء کے عین مطابق تھی۔ قرآنِ مجید نے متعدد آیاتِ شریفہ میں انسانی اعمال کی جزاء کو دنیا اور دین دونوں سے متعلق فرمایا ہے یعنی یہ بتایا ہے کہ انسان کی نیکی کا پھل دنیا میں بھی ملتا ہے اور عقبیٰ میں بھی ملے گا۔ یہ نکتہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد عرصہ تک مسلمانوں کے پیش نظر رہا اور جب تک وہ اس کو سمجھتے رہے ان کے تمام اعمال و افعال میں تکمیلی رنگ نمایاں رہا۔ ان کی دنیا عین دین رہی اور دین عین دُنیا،

لیکن جب سے اس نقطۂ نظر میں تبدیلی واقعہ ہوئی، ان کے کام ابتر ہو گئے، اور ان میں اسلام کی بجائے یہودیت اور نصرانیت کا رنگ جھلکنے لگا۔ ان میں اہلِ کتاب کی طرح دین و دنیا دو مستقل اور جداگانہ چیزیں قرار پائیں، بعض علانیہ دنیا کو اختیار کر کے دین سے غافل ہو گئے اور یہود کے خیال کو زندہ کر دیا، بعض نے ترک دنیا کر کے گوشہ نشینی کو ترجیح دی اور عیسائیوں کی راہبانہ زندگی کی یاد تازہ کر دی، اس کی ایک محسوس اور بیّن مثال خلافت کے حدود میں ملتی ہے۔ پہلے

خیال کے تسلط کے زمانہ میں خلیفہ دینی مقتدا اور دنیاوی سردار کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا تھا۔ لیکن جب دوسرا خیال مستولی ہوا۔ تو ملوکیت اور پاپائیت کی ثنوئت پیدا ہو گئی۔ یعنی مذہبی پیشوا الگ ہو گئے اور دنیاوی حکومت سلاطین کے قبضۂ و اقتدار میں چلی گئی۔ اس تفریق نے مسلمانوں کی قومی قوت اور اجتماعی شیرازہ کو جس طرح توڑا۔ اور منتشر کیا۔ اس کے شواہد دفاترِ تاریخی سے باہر ان کی موجودہ حالت کے اندر آج بھی ملتے ہیں۔ جن کو ماہرینِ فلسفۂ تاریخ کے علاوہ امراضِ قومی کا ہر نبض شناس آج بھی سمجھ سکتا ہے۔ اندریں حالات ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ہم اپنی موجودہ ابتری و پستی کا احساس کر کے اس مرکزی خیال کی طرف عود کریں۔ جو ہماری ترقی، سربزی اور تفوق کا ضامن تھا۔ جس کے اندر اسلام کی روح جلوہ گر تھی۔ اور جو یہودیت و عیسویت سے بالکل علیحدہ تھا۔

آج اقوامِ اسلامی یا تو یہودی تخیل کا شکار ہیں یا عیسوی تخیل کا، محمدی دعوت آج اکثر ان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ آج منبر اور تخت دو سمجھے جاتے ہیں اور سپہ سالار اور امام دو گروہ ٹھہرائے جاتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا منبر اور تخت ایک تھا اور ہمارے سپہ سالار ہی ہماری نماز کے امام ہوتے تھے۔ مسلمانوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم کو ایک مدت سے فراموش کر دیا ہے اور خدا اور قیصر دو بادشاہوں کی رعایا بن گئے ہیں۔ وہ سلطنت و حکومت و تجارت و خدمت کسب زر اور تعلّم ہنر کو دنیا کا کام اور صرف نماز و روزہ اور تسبیح و وظیفہ خوانی کو دین کا کام سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حسنِ نیت ہو تو ہر دنیاوی جدوجہد، ہر سیاسی سعی و فکر، ہر تعلیمی عمل و خدمت، ہر تجارتی شغل و کاروبار، ہر صنعتی ترقی و اقدام اور ہر ایجاد و اختراع سراسر دین ہے اور اگر

حسن نیت نہ ہو تو رات بھر کا قیام نماز اور دن بھر کا روزہ بھی دُنیا ہے

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس مذہب کو پیش کیا ہے۔ اس میں دنیا و دین کی تفریق اگر کسی معنیٰ میں ہے بھی تو کاموں کے امتیاز کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ نیتوں کے فرق کی وجہ سے ہے اور یہی وہ راز ہے جس کی بناء پر اسلام جب دین بن کر آیا، تو ساتھ ہی ساتھ سلطنت و حکومت کا پیام بھی لایا۔ بدھ مذہب میں دین الگ سے آیا۔ دنیا الگ سے، بنی اسرائیل کو دین ملنے کے چار سو برس کے بعد سلطنت ملی۔ عیسائیت کو حضرت عیسیٰؑ کے صدیوں بعد تخت کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت مدینہ منورہ میں اپنے دین کا منبر نصب کیا۔ اس وقت دنیا کا تخت بھی بچھ گیا اور اسی وقت عظیم الشان اخلاقی و روحانی و تجارتی و سیاسی علمی و تعلیمی غرض تہذیب و تمدن کے تمام شعبے اپنی اپنی جگہ پر قائم ہو گئے۔ تیس برس کے اندر خلیج فارس سے لے کر بحر ظلمات تک دین و اخلاق، علم و عمل، عدل و انصاف اخوت و مساوات اور تہذیب و تمدن کی ایک نئی دنیا پیدا ہو گئی۔ عرب و عجم، ترک و چین، ہند و روم اور بربر و حبش نے مل کر لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عَلَم اتحاد کے زیر سایہ ایسی اخوت عامہ کی بنیاد ڈال دی، جس کے مناظر اس دور ترقی میں بھی نظر نہیں آتے۔

اس سریع و عظیم انقلاب کا سب سے بڑا سبب یہ تھا۔ کہ دین و دنیا کے کاموں کی تفریق کی دیوار اس نے ڈھا دی تھی۔ رہبانیت اور گوشہ نشینی کا نام اس نے عبادت نہیں رکھا تھا۔ بلکہ ممالک کی فتوحات ہوں، مدارس کی تاسیس ہو، تجارت کے بری و بحری سفر ہوں۔ جنگی مشاغل ہوں، یا امن و صلح کی کوششیں ہوں۔ حصول رزق اور کسب

دولت کی صحیح مساعی ہوں، یا غریبوں، بیکسوں اور مسافروں کی امداد کے کام ہوں۔ آلِ اولاد اور زن و فرزند کی مخلصانہ خواہش ہو۔ یا خدا کے لئے تن تنہا جد و جہد اور جہاد ہو۔ ان میں سے ہر کام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذہب میں دین تھا۔ اس لئے ایک مسلمان کی زندگی کا ہر شعبہ، ہر سعی و محنت اور ہر جد و جہد جو خدا کی مرضی کے حصول کی خاطر ہو۔ سراسر دین تھی۔ مسلمانوں کی گذشتہ تباہی و بربادی کا اصلی سبب یہی ہوا۔ کہ انہوں نے دین و دنیا کی اس وحدت کے نکتہ کو فراموش کر دیا۔ بادشاہ دنیاوی کاروبار کا۔ اور شیخ الاسلام دینی معاملات کا ذمہ دار بنا۔ اور نصاریٰ کی طرح دین الگ اور دنیا الگ، قیصر الگ اور خدا الگ قرار دیا گیا، دینی کاموں کی فہرست الگ بنائی گئی اور دنیاوی کاموں کی فہرست الگ تیار کی گئی۔ کچھ لوگوں نے اپنے کو خانقاہوں مسجدوں اور حجروں میں بند کر کے اپنے کو دین کا خادم کہلایا۔ اور کچھ لوگوں نے دنیا کے بازاروں اور جد و جہد کی صفوں میں پہنچ کر اپنے کو دنیا دار قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اہلِ دین ہوتے کے مدعی دنیا کے کاموں کے لائق نہ رہے اور کھلم کھلا اہلِ دنیا کہلانے والے خدا کی خوف و خشیت کو بھلا، اور اس کی رضا کی دولت کو کھو بیٹھے۔

اب امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ پر فرض ہے۔ کہ وہ دین و دنیا کی وحدت کے اس راز کو سمجھے۔ اور اپنی نجات و فلاح کی تدبیر اسی وحدت کے اندر تلاش کرے۔ وہ بازاروں میں خدا کے لئے دولت پیدا کرے۔ لڑائیوں میں خدا کے لئے اپنی جانیں فدا کرے۔ مدرسوں اور جامعوں میں خدا کے لئے مفید، نافع علوم و فنون کی تعلیم حاصل کرے۔ تجربہ گاہوں میں خدا کے لئے ایجاد و اختراع کرے۔ دنیا کے ساتھ دین کی دولت بھی حاصل کرے۔ اور زمین کی حکومت اور آسمان کی بادشاہی

دونوں کو ایک دوسرے کا سایہ سمجھے۔

(خطبہ رسول وحدت)

ص ۲۴ - ۲۰

"خطبات مدراس" میں اسی حقیقت کا اظہار ان واشگاف الفاظ میں فرمایا:-

دُنیا میں جس چیز نے سب سے زیادہ گمراہی پھیلائی۔ وہ دین و دُنیا کا فرق ہے۔ دین کا کام الگ کیا گیا۔ اور دُنیا کا الگ، خُدا کا حکم الگ ٹھہرایا گیا۔ اور قیصر کا حکم الگ۔ یہ سب سے بڑی غلطی تھی۔ جو دُنیا میں پھیلی تھی۔ اس غلطی کا پردہ پیغامِ محمدیؐ کی نور افگن شعاعوں نے چاک کر دیا۔ اس نے بتایا۔ کہ اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ اس دنیا کے کاموں کو خدا کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق انجام دینا دین ہے یعنی خدا کے اصول کے مطابق دنیاداری ہی دینداری ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ ذکر و فکر گوشہ نشینی و عزلت گیری، کسی غار اور پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھ کر خدا کو یاد کرنا دینداری ہے۔ اور دوست و احباب، آل و اولاد، ماں باپ، قوم و ملک اور خود اپنی آپ مدد فکر معاش اور پرورش اولاد دنیا داری ہے۔ اسلام نے اس غلطی کو مٹایا۔ اور بتایا کہ خُدا کے حکم کے مطابق ان حقوق اور فرائض کو ادا کرنا بھی دینداری ہے ......

مجھے صفائی سے کہنے دو۔ کہ خاموشی، سکون، خلوت نشینی اور منفردانہ زندگی اسلام نہیں ہے۔ اسلام جد و جہد، سعی و عمل اور سرگرمی ہے۔ وہ موت نہیں حیات ہے۔ اس کا فرمان یہ ہے۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (نجم-۲) انسان کیلئے وہی ہے، جو وہ کوشش کرے اور کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَھِیْنَۃٌ (مدثر-۱) ہر جان اپنے کام کے ہاتھ گروی ہے

اسلام سرتاپا جہاد و مجاہدہ ہے۔ لیکن خلوت میں بیٹھ کر نہیں۔ بلکہ میدان میں نکل کر، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تمہارے سامنے ہے۔ عام صحابہ کی زندگی تمہارے سامنے ہے۔ وہی تمہارے لئے نمونہ ہے اور اسی میں تمہاری نجات ہے اور وہی تمہارا ذریعہ فلاح ہے اور وہی ترقی و سعادت کی راہ ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام بدھ کے پیغام کی طرح ترک خواہش نہیں۔ بلکہ تصحیح خواہش ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام حضرت مسیح (علیہ السلام) کے پیغام کی طرح دولت وقوت کی تحقیر اور ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ ان کے حصول اور صرف کے طریقوں کی درستی اور اس کے صحیح استعمال اور مصرف کی تعین ہے۔

ایمان اور اس کے مطابق عمل یہی اسلام ہے۔ اسلام عمل ہے۔ ترک عمل نہیں ادائے واجبات ہے۔ عدم واجبات نہیں۔ ادائے فرض ہے۔ ترک فرض نہیں۔ اس عمل اور ان واجبات اور فرائض کی تشریح تمہارے پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اور ان کے یاران باصفا کی زندگیوں اور سیرتوں میں ملے گی۔ جن کا نقشہ یہ ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗۤ — محمدؐ خدا کے رسول اور جو لوگ ان کے ساتھ
اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ — ہیں وہ کافروں پر بھاری آپس میں رحم دل
تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا — ہیں۔ ان کو دیکھو گے۔ کہ وہ رکوع اور سجدہ
مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا — میں ہیں۔ وہ خدا کی مہربانی اور خوشنودی
(فتح - ۴) — کو ڈھونڈ رہے ہیں۔

کافران حق کے ساتھ جہاد بھی قائم ہے۔ آپس میں برادرانہ اُلفت کے جذبات بھی ہیں۔ خدا کے سامنے رکوع میں جھکے اور سجدہ میں گرے بھی ہیں اور پھر دنیا میں خدا

کی مہربانی اور رضا کے طالب بھی ہیں ۔ خدا کی مہربانی، قرآن پاک کی اصطلاح میں روزی اور معاش کو کہتے ہیں۔ اس روزی و معاش میں بھی دین کی طلب جاری ہے

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور۔ ۵)
یہ وہ لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی

تجارت، خرید و فروخت اور کاروبار بھی جاری ہے اور خدا کی یاد بھی قائم ہے۔ وہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو نہیں ڈھونڈھتے، بلکہ دونوں کو ساتھ ساتھ ع

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق

مسلمانوں اور رومیوں میں جنگ ہے۔ صحابہ فوج کے سپاہی ہیں۔ کفار کا سپہ سالار ان مسلمان سپاہیوں کی حالت دیکھنے کے لئے اسلامی کیمپ میں چند جاسوس بھیجتا ہے وہ یہاں آکر اور مسلمانوں کو دیکھ کر واپس جاتے ہیں تو سرتاپا اثر میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ وہ جاکر رومی سپہ سالار کو بتاتے ہیں۔ کہ مسلمان کیسے سپاہی ہیں هُمْ بالليل رهبان وبالنهار فرسان "وہ راتوں کے راہب ہیں اور دن کے شاہسوار یہی اسلام کی اصلی زندگی ہے"۔

(خطبات مدراس ص۱۹۷ ۔ ص۲۰۰ ملخصاً)

حضرت سیدی الشیخ قدس سرہ نے دین و دنیا کی اسی یکجائی کا اظہار و تشریح فقیر سے فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

" جب دل میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہ ہو۔ تو پھر ساز و سامان، تاج و تخت وغیرہ تمام دنیا موجود ہو تو مضر نہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ تخت و سامان میں بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور اگر دل میں غیر اللہ سمایا ہو، غیر کی محبت ہو۔ تو ایک کملی

بھی نقصان دے سکتی ہے۔ میں نے بزرگوں سے سنا ہے۔ کہ ایک کملی پوش شخص شیخ کی تلاش میں تھے۔ جہاں جاتے شیوخ میں کچھ ایسی چیز پاتے، جو ان کی دانست میں کمال کے منافی ہوتی تھی۔ ایک بزرگ کے پاس پہنچے۔ وہاں چاندی، سونا اور دوسرے نہایت قیمتی سامان پائے۔ دل میں کہا، یہ کیسا درویش ہے۔ کہ اتنی دنیا اکھٹی کر رکھی ہے۔ شیخ نماز میں تھے۔ اس شخص کے خطرہ پر انہیں نماز میں وقوف ہوا۔ نماز کے بعد فرمایا۔ آؤ! حج کے لئے چلیں۔ وہ شخص بھی تیار ہو گیا اور شیخ، اپنا کل سامان چھوڑ کر اسی وقت سفر پر روانہ ہو گئے۔ کچھ راستہ طے کیا تھا کہ وہی شخص کہنے لگا۔ حضرت ٹھہرئیے۔ میں اپنی کملی آپ کی جگہ پر بھول آیا ہوں۔ اسے لیتا آؤں "شیخ نے ارشاد فرمایا۔

"آپ اپنی ایک کملی کو نہ چھوڑ سکے۔ اور ہم اپنا سارا مال و متاع چھوڑ آئے اور اس کا احساس تک نہ ہوا" پھر شیخ نے فرمایا:۔

"ما ایں ذرہ در گِل انداختہ ایم نہ در دل"

ہمارے حضرت والا سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا" اگر کملی میں دل اٹک رہا ہو۔ تو مانع ہے اور تخت میں دل نہ الجھا ہو۔ تو وہ مانع نہیں۔ مولانا روم ؒ نے فرمایا ہے۔ ؎

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں　　ایں خیال است و محال است و جنوں

عام طور سے اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ دنیاوی مال و متاع کے ساتھ اللہ تعالیٰ نہیں مل سکتے۔ مگر مولانا ؒ نے دنیا کا جو مطلب لیا ہے۔ وہ اس سے اگلے شعر میں بیان فرمایا ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل شدن — نے قماش و نقرہ و فرزند و زن،

یہاں " دنیا " سے مراد " خدا سے غافل ہونا " ہے " قماش و نقرہ و فرزند و زن " دنیا نہیں - اگر وہ اللہ تعالیٰ سے غافل کرانے والے نہ ہوں

ہمارا ریاض یہ نہیں ، کہ بارہ سال جنگل میں بھوکا رہا جائے - یا الٹا لٹک کر عبادت کی جائے (راقم نے عرض کیا " صلوٰۃِ معکوس " پڑھتے ہیں - فرمایا " صلوٰۃ معکوس " نہیں " تصوف معکوس " ہے - یہ چیزیں جوگیوں سے لی ہیں) ...... ہمارا ریاض یہ ہے کہ باطن میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہو - دل سے غیر کی محبتیں خارج ہو کر اللہ تعالیٰ کی محبت آ چکی ہو - اور ظاہر میں اعمالِ صالح کی ہر حالت میں پابندی ہو - محبت کا یہ مطلب نہیں ، کہ نام لے تو رونا آ جائے - بلکہ محبت کا مطلب یہ ہے کہ جتنی محبت بڑھتی جائے ، اتنا ہی اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کامل ہوتا جائے - اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کی یہی پہچان بتائی ہے - اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ ، لوگ سمجھتے ہیں ، کہ اتباعِ نبویؐ میں صرف ظاہری اتباع کافی ہے - سیاہ پگڑی باندھ لی ، سرمہ لگا لیا - تہبند نصف ساقین تک اونچا کر لیا - اور اتباع نبوی مکمل ہو گیا - ظاہری اتباع کی نفی نہیں کرتا - وہ بھی ضروری ہے - لیکن باطنی اتباع اس سے بھی زیادہ ضروری ہے - احوال میں اتباع ہو - فکر و کیفیاتِ قلبی میں اتباع ہو - اس کی طرف توجہ نہیں جاتی - صَابِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ - ہر حال میں سختی میں بیماری میں لڑائی کے وقت غرض ہر حالت میں اور ہر وقت اپنی خواہشات کو روک کر اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق عمل کرنا اپنا ریاض ہے - ضابطِ نفس ہو - اللہ تعالیٰ کے اوامر کا

ہر حال میں پابند ہو۔ یہی اصل مقصد اور یہی تصوف ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارا ریاض تو بس یہی ہے۔ کہ سونے چاندی، زر و جواہر کے ڈھیر اور ھتیلیاں پڑی ہوں اور ادھر (بغیر حق) نگاہ تک نہ ڈالی جائے۔ کمالِ حسن و جمال ہو۔ تنہائی ہو۔ قدرت ہو۔ لیکن ادھر اللہ تعالےٰ کے تعلق کی بنا، پر قطعاً توجہ نہ کی جاتے۔ یہ کیا ہے کہ بارہ سال جنگل میں روٹی نہیں کھاتی۔ الٹے ٹنگے رہے۔ یہ تو جوگی بھی کر لیتے ہیں"

اسلامی نظریۂ عبادت کی وسعت

دین و دنیا کی اس غلط تقسیم و دوئی کے نظریہ نے عبادت الٰہی کے مفہوم کو بھی انتہائی ناقص، محدود اور تنگ بنا دیا تھا۔ چند تعبدی اعمال و مذہبی رسوم کو تو دین اور بندگی سمجھا جاتا تھا۔ باقی جملہ انسانی حقوق و فرائض، معاملات و اخلاق اور حقوق العباد دنیا بن کر عبادت، کے دائرے سے خارج ہو چکے تھے۔ یہ اسلام کا کمال و جامعیت ہے۔ جس نے انسان کو اس تنگ نظری، و تحدید کے گرداب سے نکالا۔ دین و دنیا کی غلط تقسیم کے بت کو توڑا اور جملہ انسانی افکار و اعمال کو ایمان اور تصحیح عمل کے طریقے عطا فرما کر عبادت بنا دیا۔ کہ انسان اب اخلاص و عمل کی اللہ کی بتائی ہوئی صورتوں کو اختیار کر کے زندگی کے ہر شعبہ میں رضائے حق اور قرب ربانی سے سرفراز ہو سکتا ہے۔

عبادت کے بارے میں دوسرا مہلک نظریہ یہ تھا۔ کہ عبادت کا مفہوم جسم انسانی کو تکلیف دینا ہے اس تخیل نے انسان کو تکلیف و آزار دینے والے طرح طرح کے اعمال پیدا کر دیے تھے جنہیں عبادت و تقرب الٰہی کا ذریعہ گردانا جاتا تھا۔ اسلام نے اس غلط عقیدہ کی نہ صرف تردید کی۔ بلکہ اس کا قطعاً قلع قمع کر دیا۔ اور انسانوں کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ انسان کو آزار میں مبتلا دیکھ کر خوش نہیں ہوتا۔ نہ ہی اسے جسم کی یہ مشقتیں

مطلوب ہیں۔ اسے تو ایسا پاکیزہ دل، جو مخلوق کا طالب نہ ہو۔ اور ایسے اچھے اعمال مقصود ہیں جو اس کے بتائے ہوئے طریقے اور اس کے برگزیدہ انبیاء علیہم السلام کے نمونہ کے مطابق ہوں۔

سلوک کیونکہ عبادات کی باخلاص تعمیل و تکمیل ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے عبادت کے اس غلط اور تنگ مفہوم نے سلوک کی ہمہ گیری کو بھی محدود کر دیا۔ اور اگر ایک طرف چند مخصوص عبادات و اذکار، اوراد و وظائف کو سلوک سمجھا جانے لگا تو دوسری طرف "جسمانی آزار" کے تقرب الٰہی سمجھے جانے کے عقیدہ نے سلوک میں "تکلیف دہ" مجاہدات کی بنا پر درکش کے سامان فراہم کر دیئے۔ جس کی وجہ سے "شرعی تکلیفات" یعنی احکام الٰہیہ کے اختیار و امتثال کے مجاہدات کو کافی نہ سمجھ کر نام نہاد متصوفین نے سالکین کے لئے "غیر شرعی مجاہدات" کو مقصود گردانا اور ان کی پابندی کو ضروری سمجھا۔ جس کی وجہ سے سلوک میں طرح طرح کی قباحتیں در آئیں اس غلط طرز فکر اور طریقہ عمل کی اصلاح اور صحیح اسلامی سلوک کے جاننے کے لئے اسلامی عبادات کی وسعت اور عبادات کا اصل مقصد جاننا ضروری ہے۔ حضرت سید الملت قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں۔

"عبادات کے معنی عام طور سے وہ چند مخصوص اعمال سمجھے جاتے ہیں۔ جن کو انسان خدا کی عظمت اور کبریائی کی بارگاہ میں بجا لاتا ہے۔ لیکن یہ عبادات کا نہایت تنگ مفہوم ہے۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالےٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے انسانوں پر جو حقیقت ظاہر فرمائی۔ اس کا اصل جوہر یہ نہیں ہے کہ گزشتہ مذاہب کی عبادت کے طریقوں کی بجائے اسلام میں عبادت کے دوسرے طریقے مقرر ہوئے

بلکہ یہ ہے۔ کہ انسانوں کو یہ بتایا گیا۔ کہ عبادت کی حقیقت اور غایت کیا ہے۔ ساتھ ہی عبادات کے گذشتہ ناقص طریقوں کی تکمیل، مبہم بیانات کی تشریح، اور مجمل تعلیمات کی تفصیل کی گئی اہل عرب جہاں آسمانی مذہب کی دوسری حقیقتوں سے بے خبر تھے، وہاں عبادت کے مفہوم و معنیٰ اور اس کے صحیح طریقوں سے بھی ناواقف تھے۔ عرب میں جو یہود اور عیسائی تھے وہ بھی اس کے متعلق اپنے عمل اور تعلیم سے کوئی واضح حقیقت اُن کے سامنے پیش نہ کر سکے تھے۔ اس عہد میں جو عیسائی فرقے عرب میں تھے۔ عقائد میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا۔ کہ وہ حضرت مسیحؑ کی الوہیت کو تسلیم کرتے تھے اور عبادات میں یہ تھا۔ کہ تمام دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر کے عرب کے سنسان بیابانوں اور پہاڑوں میں انہوں نے اپنی عبادت گاہیں اور خانقاہیں بنالی تھیں اور ان میں بیٹھ کر تمام دنیا کی جدوجہد اور سعی و کوشش کے میدانوں سے ہٹ کر مجرّد اور متقشفانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اسی لئے عربوں کی شاعری میں عیسائیت کا تخیّل ایک "راہب متبتّل" کی صورت میں تھا۔ عرب کا سب سے بڑا شاعر امراء القیس کہتا ہے۔

منارۃ ممسیٰ راھب متبتّل ۔ دنیا سے الگ تھلگ زندگی بسر کرنے والے راہب کا شام کا چراغ۔

عرب میں یہود اپنی اخلاقی اور مذہبی بدعملیوں کے سبب سے سخت بدنام تھے ان میں روحانی خلوص و ایثار اور خدا پرستی نام کو نہ تھی۔ اور صرف سبت (سنیچر) کے دن تورات کے حکم کے مطابق تعطیل منانا اور اس دن کوئی کام نہ کرنا بڑی عبادت سمجھتے تھے۔ قرآن پاک نے ان دونوں فرقوں کی اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہودیوں

پر اس نے بے حکمی، نافرمانی، اکل حرام اور طاغوت کی پرستش کا اور عیسائیوں پر غلو فی الدّین کا صحیح الزام قائم کیا ہے (دیکھو سورۂ مائدہ رکوع ۹، ۱۱ سورۂ حدید رکوع ۴)

یہودی جادو۔ ٹوٹکا اور عملیّات کے توہمات میں گرفتار تھے۔ اور جب کبھی موقع ملتا۔ غیر قوموں کے بتوں کے سامنے بھی سر جھکا لیتے تھے۔ عیسائی حضرت مریم اور حضرت عیسیٰؑ اور مسیحی اولیاء اور شہیدوں کی تصویروں، مجسموں، یادگاروں اور مقبروں کو پوجتے تھے۔ انہوں نے راہبانہ عبادت کے نئے نئے اور جسم کو سخت تکلیف اور آزار پہنچانے والے طریقے ایجاد کئے تھے۔ اور ان کا نام انہوں نے دینداری رکھا تھا۔ سورۂ حدید میں قرآن پاک نے یہود و نصاریٰ دونوں کو فاسق کہا ہے۔ لیکن ان دونوں کے فسق میں نہایت نازک فرق ہے۔ یہود کا فسق دین میں کمی اور سستی کرنا، اور نصاریٰ کا فسق دین میں زیادتی اور غلو کرنا تھا۔ اور خدا کے مشروع دین میں کمی اور زیادتی دونوں گناہ ہیں۔ اس لئے قرآن نے دونوں کو برابر کا فسق قرار دیا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِیْمَ	اور ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو بھیجا اور
وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ	اُن کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھی
فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ	تو ان میں سے کچھ راہ پر ہیں۔ اور اکثر
ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا	نافرمان ہیں، پھر اُن کے بعد اُن کے
وَقَفَّیْنَا بِعِیْسَى	پیچھے ہم نے اپنے اور پیغمبر بھیجے۔ اور
ابْنِ مَرْیَمَ وَاٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ وَجَعَلْنَا	مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا اور ان کو انجیل
فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ	عنایت فرمائی اور جنہوں نے عیسیٰ کی

وَرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَٰهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ

(حدید - ۴)

پیروی کی ۔اُن کے دل میں نرمی اور رحم دلی بنائی ۔ اور ایک رہبانیت انہوں نے نئی چیز نکالی ۔ جو ہم نے ان پر نہیں لکھی تھی ۔ لیکن خدا کی خوشنودی حاصل کرنا تو انہوں نے اس رہبانیت کو بھی جیسا نباہنا چاہیئے تھا نہیں نباہا ۔ تو ان میں جو ایماندار تھے ۔ ہم نے ان کی مزدوری دی ۔ اور اُن میں بہت سے نافرمان ہیں ۔"

(سیرت النبی ج ۵ ص ۱۹۱ تا ۱۹۷)

جسمانی آزار و تکلیف مقصد عبادت نہیں

سید الملۃ رحمۃ اللہ علیہ اسی عنوان کے ماتحت کچھ اور آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں ۔

" عام خیال یہ تھا کہ بندہ جس قدر اپنے اوپر تکلیف اٹھاتا ہے ۔ اس قدر خدا خوش ہوتا ہے اور وہ اس کی بڑی عبادت شمار ہوتی ہے اس لئے لوگ اپنے جسم کو بڑی بڑی تکلیفیں دیتے تھے اور سمجھتے تھے ۔ کہ جس قدر جسم کو آزار زیادہ دیا جائے گا ۔ اسی قدر روح میں زیادہ صفائی اور پاکیزگی آئے گی ۔ چنانچہ یونانی فلسفیوں میں اشراقیت، عیسائیوں میں رہبانیت اور ہندوؤں میں جوگ اسی اعتقاد کا نتیجہ تھا ۔ کوئی گوشت نہ کھانے کا عہد کر لیتا ، کوئی ہفتہ میں یا چالیس دن میں ایک دفعہ غذا کرتا تھا ۔ کوئی سرتا پا برہنہ رہتا ۔ اور ہر قسم کے لباس کو تقدس کا

ننگ سمجھتا تھا۔ کوئی چلّہ کی سردی میں اپنے بدن کو ننگا رکھتا تھا۔ کوئی عمر بھر یا سالہا سال تک اپنے کو کھڑا رکھتا تھا۔ یا بیٹھا رہتا تھا اور سونے اور لیٹنے سے قطعاً پرہیز کرتا تھا۔ کوئی اپنا ایک ہاتھ کھڑا رکھتا تھا کہ سوکھ جاتے۔ کوئی عمر بھر تاریک تہہ خانوں اور غاروں میں چھپ کر خدا کی روشنی تلاش کرتا تھا۔ کوئی تجرّد اور ترک دنیا کر کے اہل عیال اور زن و فرزند کے تعلق سے نفرت رکھ کر خدا کی محبت کا غلط مدعی بنتا تھا، لیکن نبوت محمدیؐ نے یہ راز آشکارا کیا۔ کہ ان میں سے کوئی چیز عبادت نہیں۔ نہ ترکِ لذائذ سے حق کی لذّت ملتی ہے۔ نہ ہماری غمگینی خدا کی خوشنودی کا باعث ہے۔ اور نہ بندوں کی اس غیر معمولی تکلیف سے خدا کو آرام ملتا ہے، نہ زن و فرزند کی نفرت سے خدا کی محبت نصیب ہوتی ہے۔ نہ ترکِ دنیا سے دین کی دولت ملتی ہے۔ خدا کا دین اتنا ہی ہے جو بندہ کی استطاعت کے اندر ہے۔

اس نے کہا۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ ـ آخر) خدا کسی کو اس کی گنجائش سے زیادہ کی تکلیف (حکم) نہیں دیتا۔

.... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

انّ ھذا الدّین یسرٌ ولن یشادّ الدین احدٌ الّا غلبہٗ (جمع الفوائد ص۲ باب الاقتصاد فی الاعمال بحوالہ صحیح بخاری وسنن نسائی) یہ دین آسان ہے جو کوئی شخص دین سے سختی میں مقابلہ کریگا تو دین اس کو مغلوب کر دے گا۔

اور فرمایا۔

انما انا بعثت بالملۃ السمحۃ او میں تو سہل اور آسان روشن حنیفی دین

السھلة الحنیفیة البیضاء   دے کر بھیجا گیا ہوں

(مسند ابن حنبل صفحہ ۲۶۶ ج ۵)

مذہب میں رہبانیت اور جوگ کا جو طریقہ ایجاد کیا گیا خواہ وہ کتنی ہی خوش نیتی سے کیا گیا ہو۔ تاہم وہ دین حق کی اصلی تعلیم نہ تھی ۔ اس لئے اسلام کے صحیفہ نے اس کو بدعت سے تعبیر کیا، اور کہا

وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا۔ (حدید - ۴)	اور عیسائیوں نے ایک رہبانیت کی بدعت نکالی۔ اور ہم نے اُن کو خوشنودی حاصل کرنے کے سوا اس کا حکم نہیں دیا تھا. تو جیسا چاہیئے اس رہبانیت کا حق ادا نہ کیا

ان لوگوں سے جنہوں نے اچھے کھانوں اور زیب و زینت کی جائز چیزوں کو بھی اس لئے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ کہ اس سے خدا خوش ہو گا، یہ سوال کیا۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (اعراف ۴)	پوچھ اے پیغمبر کہ اس زیب و زینت اور رزق کی اچھی چیزوں کو جن کو خدا نے اپنے بندوں کے لئے بنایا، کس نے حرام کیا

اسلام نے اس مسئلہ میں یہاں تک سختی کی کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بیبیوں کی خوشنودیٔ مزاج کے لئے شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی ۔ اس پر عتاب آیا، خدا نے فرمایا:۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ	اے پیغمبر! خدا نے جس چیز کو تیرے لئے حلال کیا تو اس کو اپنی بیبیوں کی

غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (تحریم - ۱) خوشی کی خاطر اپنے اوپر حرام کیوں کرتا ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے

صحابہ میں بعض ایسے لوگ تھے۔ جو عیسائی راہبوں کے اثر یا ذاتی میلان طبع کے سبب سے تجرّد، ترکِ لذائذ اور ریاضاتِ شاقہ کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اس سے باز رکھا اور فرمایا کہ میں یہ شریعت لے کر نہیں آیا۔

قدامہ ابن مظعون اور اُن کے ایک رفیق نے دربارِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی یا رسول اللہ! ہم میں سے ایک نے عمر بھر مجرد رہنے اور شادی نہ کرنے کا، اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا "میں تو دونوں باتیں کرتا ہوں" یہ سن کر دونوں صاحب اپنے ارادے سے باز رہے۔

(صحیح بخاری کتاب الصوم)

.... ایک دفعہ چند صحابہ نے ازواجِ مطہراتؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کی دن رات کی عبادت و ریاضت کا حال دریافت کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو دن رات سوا عبادت کے اور کوئی کام نہ ہوگا۔ انہوں نے آپ کی عبادت کا حال سنا تو بولے ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا نسبت؟ آپ تو معصوم ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب نے کہا میں تو رات بھر نمازیں پڑھوں گا۔ دوسرے صاحب بولے میں عمر بھر روزے رکھوں گا تیسرے صاحب نے اپنا ارادہ یہ ظاہر کیا کہ میں عمر بھر مجرّد رہوں گا۔ کبھی نکاح نہ کروں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی یہ گفتگو سُن رہے تھے ان کو

خطاب کر کے فرمایا "خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں تاہم میں روزہ رکھتا ہوں۔ افطار بھی کرتا ہوں۔ راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں، اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جو میرے طریقہ پر نہیں چلتا وہ میری جماعت میں نہیں۔ (صحیح بخاری کتاب النکاح)

بعض صحابہ نے جو افلاس اور غربت کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے تھے اور ضبط نفس پر بھی قادر نہ تھے۔ چاہا کہ اپنا عضو قطع کرا دیں۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس رہبانیت کی اجازت چاہی تو آپ نے سخت برہمی ظاہر فرمائی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص وغیرہ صحابہ کہتے ہیں اگر حضورؐ اس کی اجازت دیتے تو بہت سے لوگ اس پر عمل کرنے کے لئے تیار تھے۔
(صحیح بخاری وابو داؤد کتاب النکاح)

ان واقعات سے اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ آپ نے کس اہتمام کے ساتھ لوگوں کو عبادت کا صحیح مفہوم و مقصود تعلیم فرمایا

...... ایک دفعہ آپؐ خطبہ دے رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک شخص چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ننگے سر کھڑا ہے۔ آپ نے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے اور اس کی یہ کیا حالت ہے لوگوں نے بتایا کہ اس کا نام ابو اسرائیل ہے۔ اس نے نذر مانی ہے کہ وہ کھڑا رہے گا۔ بیٹھے گا نہیں، اور نہ سایہ میں آرام کرے گا۔ اور نہ بات کرے گا اور برابر روزے رکھے گا، آپ نے فرمایا کہ "اس سے کہو کہ باتیں کرے، بیٹھے، سایہ میں آرام لے اور اپنا روزہ پورا کرے۔

(صحیح بخاری، ابو داؤد، وابن جارود کتاب الایمان والنذور)

حج میں دیکھا کہ ایک شخص اپنی ناک میں نکیل ڈالے ہوئے ہے، اور دوسرا اس کو جانور کی طرح اس کی نکیل پکڑ کر کھینچ رہا ہے۔ آپ نے جا کر نکیل کاٹ

دی اور فرمایا کہ "اگر ضرورت ہو تو ہاتھ پکڑ کر اس کو طواف کراؤ۔"

(صحیح بخاری ایمان ونذور)

اس قسم کی غیر ضروری ریاضتوں کے متعلق عیسائی راہبوں کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر آپ نے فرمایا۔

لا تشدّدوا علی انفسکم فانما هلك من كان قبلكم بتشديدهم على انفسهم وستجدون بقاياهم في الصوامع والديارات	اپنی جانوں پر سختی نہ کرو، کہ تم سے پہلے تو میں اپنی جانوں پر سختی کرنے سے تباہ ہوئیں اور ان کی بقیہ نسلیں آج بھی گرجوں اور دیروں میں تم کو ملیں گی۔

(جمع الفوائد بحوالۂ معجم کبیر و اوسط للطبرانی
وابوداؤد صفحہ ۲ باب الاقتصاد فی الاعمال)

خاتم الانبیا رصلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کے ان تمام غلط راہبانہ طریقوں کا اپنے ایک مختصر فقرہ سے ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔

لا صرورة في الاسلام	اسلام میں رہبانیت نہیں۔
(ابو داؤد)	(سیرت پنجم صفحہ ۱ ملخصاً)

خطبات صفحہ اس میں تحریر فرماتے ہیں ا۔

" خدا کی عبادت ہر مذہب میں تھی۔ اور ہے۔ لیکن قدیم مذاہب میں ایک عام غلط فہمی پھیل گئی تھی۔ کہ عبادت کا مقصود جسم کو تکلیف دینا ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جس قدر اس ظاہری جسم کو تکلیف دی جائے گی۔ اسی قدر روحانی ترقی ہوگی۔ اور دل کی اندرونی صفائی ہوگی اور پاکی بڑھے گی۔

پیغام محمدی - - - - - - - نے آکر انسانوں کو ان مصیبتوں سے نجات دلائی اور بتایا کہ یہ روحانیت نہیں جسمانی تماشے ہیں۔ ہمارے خدا کو جسم کی شکل نہیں، بلکہ دل کا رنگ مرغوب ہے طاقت سے زیادہ تکلیف اس کی شریعت میں نہیں۔ - - - - - - -

پیغام محمدی نے سب سے پہلی دفعہ دنیا کو بتایا کہ عبادت کا مقصود فقط ایک ہے اور وہ یہ کہ بندہ خدا کے آگے اپنی بندگی کا اقرار کرے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ

جو میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں عنقریب جہنم میں ذلت کے ساتھ داخل ہونگے

(مومن - ۶)

یعنی عبادت یہی ہے کہ بندہ میں سرکشی نہ ہو، یہی چیز عبادات کے مختلف ارکان کو بجالا کر انسان ظاہر کرتا ہے۔ کہ وہ خدا سے سرکش نہیں، بلکہ اس کا اطاعت گذار اور فرمانبردار ہے۔

اسلام میں عبادت کی غایت کیا ہے، فقط حصولِ تقویٰ،

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ

اے لوگو تم اپنے اس رب کی عبادت کرو، جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا، تاکہ تم کو تقویٰ حاصل ہو۔

(بقرہ - ۳)

...... خطبات مدراس ص۱۸۶ تا ص۱۸۹

عزلت نشینی اور قطع علائق عبادت نہیں

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ارقام فرماتے ہیں

"اکثر مذاہب نے دینداری اور خدا پرستی کا کمال یہ سمجھا تھا کہ انسان کسی غار، کھوہ یا جنگل میں بیٹھ جائے اور تمام دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرے۔ اسلام نے اُس کو عبادت کا صحیح طریقہ نہیں قرار دیا۔ عبادت درحقیقت خدا اور اُس کے بندوں کے حقوق کے ادا کرنے کا نام ہے اس بنا پر وہ شخص جو اپنے تمام ہم جنسوں سے الگ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھ جاتا ہے۔ وہ درحقیقت ابنائے جنس کے حقوق سے قاصر رہتا ہے۔ اس لئے وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں۔ اسلام کا صحیح تخیّل یہ ہے کہ انسان تعلقات کے ازدحام اور علائق کے ہجوم میں گرفتار ہو کر ان میں سے ہر ایک کے متعلق جو اس کا فرض ہے اسکو بخوبی ادا کرے جو شخص ان تعلقات و علائق اور حقوق فرائض کے ہجوم سے گھبرا کر کسی گوشۂ عافیت کو تلاش کرتا ہے۔ وہ دنیا کے کارزار کا نامرد اور بزدل سپاہی ہے۔ اسلام اپنے پیروؤں کو جوانمرد سپاہی دیکھنا چاہتا ہے۔ جو ان سب جھمیلوں کو اٹھا کر بھی خدا کو نہ بھولیں، غرض اسلام کے نزدیک عبادت کا مفہوم ترکِ فرض نہیں، بلکہ ادائے فرض ہے۔ ترکِ عمل نہیں، بلکہ عمل، کچھ نہ کرنا نہیں بلکہ کرنا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض ان صحابہ کو جو اہل و عیال اور دوست و احباب سب کو چھوڑ کر دن بھر روزہ رکھتے تھے اور راتوں کو عبادت کرتے تھے فرمایا "اے فلاں! تم ایسا نہ کرو۔ کہ تم پر تمہاری بیوی بچوں کا بھی حق ہے تمہارے مہمان کا بھی حق ہے۔ تمہاری جان کا بھی حق ہے۔ تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے۔" اس سے ظاہر ہوا۔ کہ اسلام کی نظر میں عبادت ان حقوق کو بجا لانا ہے۔ ان حقوق کو ترک کر دینا نہیں، چنانچہ ایک دفعہ کسی غزوہ میں ایک صحابی کا گذر ایک ایسے مقام پر ہوا جس میں موقع سے ایک غار تھا۔ قریب ہی پانی کا چشمہ بھی تھا آس پاس کچھ جنگل کی بوٹیاں بھی تھیں۔ ان کو اپنی عزلت نشینی کے لئے یہ جگہ بہت پسند آئی خدمتِ بابرکت میں آکر عرض کی۔ یا رسول اللہ مجھ کو ایک غار ہاتھ آگیا ہے۔ جہاں ضرورت کی سب چیزیں ہیں۔ جی چاہتا ہے۔ کہ وہاں گوشہ گیر ہو کر ترک دنیا کر لوں، آپ نے فرمایا "میں یہودیت اور عیسائیت لے کر دنیا میں نہیں آیا ہوں میں آسان اور سہل اور روشن ابراہیمی مذہب لے کر آیا ہوں۔"

اسلام سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں کئی کئی دن جا کر رہا کرتے تھے اور عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے لیکن جب سے وحی کا پہلا پیام آپ کے پاس آیا اور دعوت و تبلیغ کا بار آپ کے مبارک کندھوں پر رکھا گیا، شب و روز میں رات کی چند ساعتیں اور سال میں رمضان کے چند آخیر دن گوشۂ عزلت اور زاویۂ تنہائی میں بسر ہوتے تھے۔ ورنہ تمام دن پوری جماعت کے ساتھ خالق کی عبادت اور پھر مخلوق کی خدمت میں صرف ہوتے تھے اور یہی تمام خلفا اور عام صحابہ کا طرز عمل رہا۔ اور یہی اسلام کی عملی اور سیدھی سادھی عبادت تھی۔

(سیرت النبی ج ۵ ص ۴۳ تا ۴۴ ملخصاً۔ تفصیل کے لئے سیرت ج ۵ ص ۱۷ تا ص ۲۲ دیکھئے)

ایک دوسری جگہ "اخلاق و رہبانیت" کے عنوان سے اس حقیقت کو اسطرح کھولا ہے

"اخلاق درحقیقت انسانوں کے باہمی تعلقات میں خوش نیتی اور اچھائی برتنے کا نام ہے یا یوں کہیئے۔ کہ ایک دوسرے پر جو انسانی فرائض عائد ہیں۔ ان کو ادا کرنے کو کہتے ہیں۔ اخلاق کی اس حقیقت ہی سے یہ واضح ہے۔ کہ اخلاق کے وجود کے لئے باہم انسانوں میں تعلقات اور وابستگی کا وجود ضروری ہے۔ جو رہبانیت التجرد اور جوگی پن میں نہیں پائی جاتی ہے اسی لئے گوشہ نشینی، عزلت گزینی، خلق سے کم آمیزی، جماعت سے علیحدگی، اہل وعیال، عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے تعلقات سے آزادی اخلاق کے استعمال کے موقع ہی کو کھو دیتی ہے یا کم کر دیتی ہے"

اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت اس لئے ہے۔ کہ خلق سے قطع تعلق اور گوشہ نشینی نے مذہب میں اکثر نیکی اور دینداری کی بہترین شکل کی حیثیت حاصل کر لی ہے اسلام سے پہلے راہب اور جوگی اسی اصول پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے اور وہ خود اور ان کے عقیدت مند بھی اس کو ان کی انتہائی نیکوکاری اور دینداری قرار دیتے تھے لیکن حقیقتاً ان مذہبی افراد اور جماعتوں نے زیادہ تر اس پردہ اور حجاب کو اس لئے اختیار کیا۔ کہ اس سے ایک طرف اپنے کو عام نظروں سے چھپا کر بادشاہوں کی طرح اپنے رعب و اثر کو نمایاں کرنے اور اپنے کو بالاتر ہستی تصور کرانے میں مدد ملے اور دوسری طرف اپنی زندگی کو زیر پردہ رکھ کر جھوٹا تقدس اور جھوٹی دینداری کا ڈھونگ کھڑا کر سکیں۔ اور تیسری طرف اپنی اس عزت نشینی کے جھوٹے عذر کی بناء پر کسی ملامت کا نشانہ بنے بغیر اہل وعیال، اعزہ و اقارب، دوست

دا حباب اور قوم وملّت کے فرائض وحقوق بجالانے کی تکلیف سے بچ جائیں اسی لئے اسلام نے اپنے اصول اخلاق میں راہبانہ، جوگیانہ اور مجرّدانہ زندگی کی ہمت افزائی نہیں کی ہے۔ نبوّت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری ۲۳ برس کی زندگی اسی مجمع انسانی میں رہ کر اور تمام تر انسانی جدوجہد میں شریک ہو کر گذاری ہے۔ یہی طرزِ عمل خلفائے راشدین اور چند کے سوا تمام اکابر صحابہ رضؓ کا تھا اور پورا قرآن پاک اسی انسانی جدوجہد اور انسانی مجمع کے ساتھ عمل صالح کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے۔ تجرّد، علیحدگی، خلوت نشینی، ترکِ عمل اور ترک جماعت کے لئے ایک اشارہ بھی پورے قرآن میں موجود نہیں ہے۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ جماعتی حقوق اور فرائض جماعتوں کے اندر ہی رہ کر ادا ہو سکتے ہیں۔ ان سے ہٹ کر نہیں۔ وہ لوگ جو آبادی سے دور کسی جنگل یا ویرانہ میں گوشہ گیر اور عزلت نشین ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں، کیا وہ جماعتی مشکلات کو حل کرتے ہیں! کیا وہ قوم کی اخلاقی نگرانی کا فرض انجام دیتے ہیں؟ کیا وہ غریبوں کا سہارا بنتے ہیں! کیا وہ اپنے دست وبازو سے اپنی روزی کماتے ہیں؟ کیا وہ یتیموں کے سرپرست ہیں؟ کیا وہ خلقِ الٰہی کی کوئی خدمت کرتے ہیں؟ کیا وہ لوگوں کو گمراہی اور ضلالت سے بچاتے ہیں؟ کیا وہ تبلیغ و دعوت تعلیم وموعظت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور جہاد جیسے فریضوں سے عہدہ برآ ہیں۔ حالانکہ اخلاقی عبادتوں کے یہی بہترین مواقع ہیں۔ اسی لئے اسلام کی نظر میں نجات طلبی کا عموماً یہ مستحسن طریقہ نہیں، قرآن پاک میں ہے۔

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (تحریم۔۱) تم اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو بھی دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

یعنی انسان کا فرض اپنے ہی کو آگ سے بچانا نہیں۔ بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بچانا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صریح طور سے تمام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ، تم میں سے ہر ایک دوسرے کا ذمہ دار اور نگران ہے اور اس سے اُس کی ذمّہ داری اور نگرانی میں آئے ہوئے لوگوں کی نسبت پوچھا جائے گا۔

امیر اپنی رعیّت کا چرواہا، مرد اپنے اہل و عیال کا رکھوالا اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے۔

(صحیح بخاری ص۷۸۳ ج۲ کتاب النکاح)

جماعتی مصیبتیں جب آتی ہیں۔ تو کنارہ گیر اشخاص کو بھی نہیں چھوڑتیں۔ یہ آگ اندر اور باہر سب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے اس لئے وحی محمدی نے اس نکتہ کو علی الاعلان ظاہر کر دیا، اور کہا۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً (انفال-۳) اور اس فساد سے بچو جو چن کر صرف گنہگاروں ہی پر نہیں پڑے گا۔

بلکہ اس کی لپیٹ گنہگار و بے گناہ سب تک پہنچے گی۔ کہ اگر جماعت اپنے تمرّد کی مجرم ہوتی ہے تو کنارہ گیر اپنے تبلیغ کے فرض سے غافل رہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں اصحاب سبت کے قصّہ میں ان کنارہ گیر اور فرض تبلیغ سے بے پرواہ رہنے والے اشخاص کو بھی گنہگاروں ہی میں شامل کیا ہے۔

دنیا درحقیقت جد و جہد اور دار و گیر کا ایک میدان ہے جس میں تمام انسان باہمی معاونت سے اپنا اپنا راستہ طے کر رہے ہیں۔ راستہ میں سب لوگوں کے ساتھ

چلنے میں یقیناً بہت کچھ تکلیفیں ہیں۔ ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف و آرام کا خیال ولحاظ کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے وہ شخص جو ان جماعتی مشکلات سے گھبرا کر الگ ہو جاتا ہے اور صرف اپنا بوجھ اپنے کندھے پر رکھ کر چل کھڑا ہوتا ہے۔ دنیا کے معرکہ کا ایک نامرد سپاہی ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں اور ترمذی نے جامع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے۔

ان المسلم الذی یخالط الناس و	وہ مسلمان جو لوگوں میں مل جل کر رہتا ہے
یصبر علی اذاھم افضل من	اور ان کی تکلیف دہی پر صبر کرتا ہے
الذی لا یخالط الناس و لا	اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے نہیں
یصبر علی اذاھم	ملتا۔ اور ان کی تکلیف دہی پر صبر نہیں کرتا

(شعب الایمان و جامع ترمذی کتاب الزہد) (سیرت النبی ج ۶ ص ۷۶ تا ۷۹)

اس حقیقت کی وضاحت اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:۔

اسلام کا ہم پر بڑا احسان ہے کہ وہ ہمارے تمام کاموں کو عبادت بنانا چاہتا ہے۔ اسلام کے متعلق یہ سمجھنا کہ صرف مسجد میں محدود ہے۔ صحیح نہیں، اسلام تو جس طرح مسجد میں ہے۔ اسی طرح معرکۂ کارزار میں، اسی طرح بازار میں اسی طرح دفتر میں اور اسی طرح کارخانہ میں، ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے۔ جسے ہم اسلام سے باہر سمجھ سکیں۔ یہ دین و دنیا کی تفریق ہی غلط ہے جس طرح مسجد میں نماز پڑھنا عبادت، اسی طرح دفتر میں خلوص نیت سے حکومت کے کسی کام کو انجام دینا بھی عبادت ہے۔ ایک مسلمان اسلامی حکومت کا عامل ہو کر اپنی دیانت اور امانت کو قائم رکھ کر ہر وقت ہی عبادت میں رہ سکتا ہے

بشرطیکہ اس کی نیت میں اخلاص ہو۔ ایک مجاہد سرحد پر پہرہ دے کر اسی طرح ثواب حاصل کر سکتا ہے، جس طرح ایک نمازی نفل پڑھ کر، بلکہ بعض اوقات مجاہد اس نفل پڑھنے والے سے بھی بڑھ جاتا ہے...... عبادت صرف نماز روزہ ہی نہیں بلکہ اللہ ہی کی رضا جوئی کے لئے جملہ خدمات کو انجام دینا عبادت ہے۔ اسلام تو مسلمان کو ہر وقت عبادت کے اندر ہی رکھنا چاہتا ہے۔ اس دین سے زیادہ محبوب و محترم کون سا دین ہو سکتا ہے۔ جو اپنے پیروؤں کی پوری زندگی کو عبادت گذار زندگی بنانا چاہتا ہے۔ اور اپنے پاس ان کی زندگی کے سارے مسائل کے لئے قابل ہدایت روشنی رکھتا ہو۔

(خطبۂ اسلامی حکومت کے عاملین۔ ماہنامہ مستقبل ۱۹۵۲ء)

ایک دوسری جگہ مزید تشریح فرماتے ہیں:۔

" اس مفہوم کو ہم دوسری عبارت میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا۔ کہ عبادت صرف چندان مخصوص اعمال کا نام ہے۔ جن کو انسان خدا کے لئے کرتا ہے۔ مثلاً نماز، دعا، قربانی، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس تنگ دائرہ کو بیحد وسیع کر دیا۔ اس تعلیم کی رو سے، ہر ایک وہ نیک کام جو خاص خدا کے لئے اور اس کی مخلوقات کے فائدہ کے لئے ہو اور جس کو صرف خدا کی خوشنودی کے حصول کے لئے کیا جائے عبادت ہے۔ اسلام میں خدا کے لئے کسی کام کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کام خواہ خدا کی بڑائی اور پاکی کے لئے ہو، یا کسی انسان یا حیوان کے فائدہ کے لئے ہو، لیکن اس کام کرنے سے اس کام کے کرنے والے کا مقصود، نمائش، دکھاوا، حصول شہرت یا

دوسروں کو احسان مند بنانا وغیرہ کوئی دنیاوی اور مادی غرض نہ ہو، بلکہ محض خدا کی محبت، خوشنودی اور رضامندی ہو۔

اس تشریح کی رو سے وہ عظیم الشان تفرقہ جو دین اور دنیا کے نام سے مذاہب نے قائم کر رکھا تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس کو دفعتہً مٹا دیا۔ دین اور دنیا کی حیثیت اسلام میں دو حریف کی نہیں رہتی بلکہ دو دوست کی ہو جاتی ہے۔ دنیا کے وہ تمام کام جن کو دوسرے مذاہب دنیا کا کام کہتے ہیں، اسلام کی نظر میں اگر وہ کام اسی طرح کیے جائیں لیکن ان کی غرض و غایت کوئی مادی خود غرضی و نمائش نہ ہو، بلکہ خدا کی رضا اور اس کے احکام کی اطاعت ہو۔ تو وہ دنیا کے نہیں دین کے کام ہیں، اس لئے دین اور دنیا کے کاموں میں، کام کا تفرقہ نہیں، بلکہ غرض و غایت اور نیت کا تفرقہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابہ کو جو دن رات خدا کی عبادت میں مصروف رہتے تھے، فرمایا کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو آرام دو۔ تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو کچھ دیر سونے دو۔ تمہاری بیوی کا بھی حق ہے کہ اس کی تسلی کرو۔ اور تمہارے مہمان کا بھی حق ہے کہ اس کی خدمت کے لئے کچھ وقت نکالو۔ غرض ان حقوق کو بھی ادا کرنا، خدا کے احکام کی اطاعت اور اس کی عبادت ہے۔ چنانچہ پاک روزی کھانا اور اس کا شکر ادا کرنا بھی عبادت ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ (بقرہ ۲۲)	اے ایمان والو! ہم نے جو تم کو پاک اور ستھری چیزیں روزی کی ہیں، ان کو کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو، اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو

اس آیت سے معلوم ہُوا کہ پاک روزی ڈھونڈنا اور کھانا اور اس پر خدا کا شکر ادا کرنا عبادت ہے ایک اور آیت میں توکّل یعنی کاموں کے لئے کوشش کرکے نیتجہ کو خدا پر سپرد کردینا بھی عبادت قرار دیا گیا ہے، فرمایا۔

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (ھود۔۱۰) اس کی عبادت کرو اور اس پر بھروسہ رکھو۔

اس طرح مشکلات میں صبرو استقلال بھی عبادت ہے، فرمایا۔

فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ اس کی عبادت کر اور صبر کر

کسی شکستہ دل سے اس کی تسکین وتشفی کی بات کرنا، اور کسی گنہگار کو معاف کرنا بھی عبادت ہے۔ ارشاد ہے

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا اَذًى (بقرہ۔۳۶) اچھی بات کہنا اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے ستانا ہو۔

اس آیت پاک کی تشریح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

کُلُّ معروفٍ صدقةٌ (بخاری کتاب الادب) ہر نیکی کا کام خیرات ہے۔

تبسمك فی وجه اخیك صدقةٌ تمہارا کسی بھائی کو دیکھکر مسکرانا بھی خیرات ہے،

واماطة الاذی عن الطریق صدقةٌ راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا بھی خیرات ہے

غریب اور بیوہ کی مدد بھی عبادت بلکہ بہت سی عبادتوں سے بڑھ کر ہے، فرمایا۔

الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاھد فی سبیل اللهِ و کالذی یصوم النھار و یقوم اللیل (بخاری۔ ادب) بیوہ اور غریب کے لئے کوشش کرنے والے کا مرتبہ خدا کی راہ میں جہاد کرنیوالے کے برابر ہے اور اسکے برابر ہے جو دن بھر روزہ رکھتا ہے اور رات بھر نماز پڑھتا ہے۔

باہم لوگوں کے درمیان سے بغض وفساد کے اسباب دور کرنا اور محبت پھیلانا ایسی عبادت ہے۔ جس کا درجہ نماز، روزہ اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر ہے۔

آپ نے ایک دن صحابہ سے فرمایا:۔

الا اخبرکم بافضل من درجۃ الصیام والصلوٰۃ والصدقۃ　　کیا میں تم کو روزہ، نماز اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر درجہ کی چیز نہ بتاؤں۔

صحابہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ، ارشاد فرمائیے، فرمایا۔

اصلاح ذات البین (سنن ابی داؤد ص۱۹۲ ج۲)　　وہ آپس کے تعلقات کا درست کرنا ہے

.... اس مؤثر طریقۂ ادا نے خدا شناسی اور خدا آگاہی کے کتنے تو بر تو پردے چاک کر دیئے اور دکھا دیا کہ خدا کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے کیا کیا طریقے ہیں؟ حضرت سعد جو چاہتے تھے۔ کہ اپنی کل دولت خدا کی راہ میں دیدیں۔ آپ نے انہیں بتایا۔ کہ "اے سعد! جو کچھ اس نیت سے خرچ کرو کہ اس سے خداوند تعالیٰ کی ذات مطلوب ہے اس کا تم کو ثواب ملے گا۔ یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں بھی دو۔ اس کا بھی ثواب ہے" (ادب المفرد باب یوجر علی کل شیٔ)

ابو مسعود انصاریؓ سے ارشاد فرمایا۔ "مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ ہے (صحیح بخاری کتاب النفقات)

غریب ونادار صحابہ نے دربار رسالت میں ایک دن شکایت کی کہ "یا رسول اللہ دولت مند لوگ ثواب میں بڑھ گئے۔ ہماری طرح وہ بھی نماز پڑھتے ہیں۔ وہ بھی روزہ رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ وہ مالی عبادت بھی بجالاتے ہیں۔ جو ہم نہیں بجا لاسکتے فرمایا۔ کیا تم کو اللہ نے وہ دولت نہیں دی ہے۔ جس کو صدقہ کرسکو، تمہارا سبحان اللہ

اور الحمد للہ کہنا بھی صدقہ ہے۔ یہاں تک کہ جو کوئی اپنی نفسانی خواہش کو جائز طریقہ سے پورا کرتا ہے۔ وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہے۔" لوگوں نے کہا "یا رسول اللہ وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لئے یہ کرتا ہے" فرمایا کہ اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی ہوس پورا کرتا تو کیا اس کو گناہ نہ ہوتا؟ پھر اس کو جائز طریقہ سے پورا کرنے کا ثواب کیوں نہ ملے گا؟

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ حسن عمل، ثواب اور عبادت کے مفہوم میں اسلام نے کتنی وسعت پیدا کردی ہے۔ اور کتنی تو بر تو انسانی غلطیوں کا ازالہ کیا ہے۔ اس تشریح کے بعد روشن ہو جائے گا۔ کہ وحی محمدیؐ نے بالکل صحیح طور سے خلقت انسانی کی غرض و غایت عبادت الٰہی قرار دی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ (ذٰریٰت - ۳) اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

اس آیت پاک میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں ہے۔ جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ وہ تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں تک وسیع ہے۔ جن کے کرنے کا مقصد خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار، اس کی اطاعت اور اس کی خوشنودی کی طلب ہو۔ اس وسعت کے اندر انسان کی پوری زندگی کے کام داخل ہیں۔ جن کے بحسن و خوبی انجام دینے کے لئے اس کی خلقت ہوئی ہے۔ یہ روحانیت کا وہ راز ہے۔ جو صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دنیا کو معلوم ہوا۔

اسلام اس لئے آیا ہے کہ اپنے پیروؤں کے پاؤں کے نیچے دونوں جہانوں کی بادشاہیاں رکھدے اور یہ اس وقت ممکن ہے۔ جب عبادات کے مفہوم کو اس وسعت کے ساتھ سمجھا جائے۔ جو اسلام کا منشاء ہے اور اسی وسعت کے ساتھ اس کو ادا کیا جائے جو اسلام کا مطالبہ ہے

صد۸۴ تا صد۸۵
(سیرت النبی جلد پنجم)

خاص افراد کو مخصوص حالات میں عزلت نشینی اور جماعت سے علیحدگی کی اجازت

گذر چکا۔ کہ یہ اسلام ہی کا امتیاز ہے۔ کہ وہ اپنے پیروؤں کو کارزارِ حیات کا جوانمرد سپاہی دیکھنا چاہتا ہے۔ جو زندگی کے ہنگاموں میں رہ کر خالق سے غافل نہ ہوں۔ جو مخلوق میں الجھ کر مالک کے احکام کے پابند ہوں جن کی ہر حرکت الٰہی رنگ میں نکھر چکی ہو۔ اور دنیا کی کوئی رنگینی انہیں اپنے میں جذب نہ کر سکے۔ جو معاش کے جھمیلوں میں رہتے ہوئے معاد کی ذمہ داریوں سے غفلت نہ برتیں جو ہر نعمت سے مستفید ہوں لیکن منعم کو کسی حال میں نہ بھولیں جو تجارت کی منڈیوں، زراعتی کھیتوں صنعتی کارخانوں، مجالس کے ہنگاموں، جنگ کے میدانوں اور رزم و بزم کی گہما گہمی میں محبوبِ حقیقی میں شاغل رہ کر اس کی مرضیات کے مطابق اوقات گذارنے والے ہوں۔ زن و فرزند، عزیز و اقارب، تخت و سلطنت، فقر و تونگری، کوئی چیز ان کے قلب کی پہنائیوں پر نہ چھا سکے۔ بلکہ ہر حال و ہر مکان میں وہ اپنے عزیز جلیل آقا میں مگن، اس کی رضا کے جویا، اس کے احکام کے متلاشی اور متبع ہوں اور زندگی کے ہر میدان میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ ان کے لئے مشعل راہ اور قندیل ہدایت ہو۔ اسلام کی یہی اصل تعلیم و نظریہ اور بنی آدم کی سیر سلوک کا

یہی محمدیؐ جادہ ہے لیکن اسلام نے ایک دائمی، عالمگیر، حقیقت پسندانہ دین اور عملی اور ہمہ گیر طریقۂ حیات و مذہب ہونے کی بناء پر بعض خاص مواقع پر مخصوص اشخاص کو ہنگامی حالات کی بناء پر گوشہ گیری اور عزلت نشینی کی بھی خصوصی احکام کے تحت اجازت دی ہے۔ جو کہ اسلام کے حکیمانہ طرزِ فکر اور حقیقت پسندانہ اندازِ نظر کی دلیل و نشانی ہے۔ لیکن یہ وضاحت ذہن میں رہے کہ اسلام کا اصل طریق یہ نہیں بلکہ خصوصی حالات و عوارض کی بناء پر یہ اجازت دی گئی ہے۔ بہر حال حضرت الشیخ الامام قدس سرہ عزلت نشینی کے متعلق ارقام فرماتے ہیں۔

" اسلام میں گوشہ گیری اور عزلت نشینی کی اجازت صرف دو موقعوں پر ہے۔ ایک اس شخص کے لئے جس میں فطرۃً بدی ہے جس کی سرشت، دوسروں کو نفع پہنچانا نہیں بلکہ تکلیف دینا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو برائی سے بچنے کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ وہ لوگوں سے قطع تعلق کرے، صحیح بخاری میں ہے کہ ایک بدو نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے بہتر شخص کون ہے، فرمایا ایک تو وہ جو اپنی جان و مال کو خدا کے راستہ میں قربان کرتا ہے دوسرے وہ جو کسی گھاٹی میں بیٹھ کر اپنے رب کی عبادت کرے اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رہنے دے (صحیح بخاری کتاب الادب باب العزلۃ راحۃ من خلاط السوء)

اس تعلیم نبویؐ نے انسانوں کی دو قسمیں کر دیں۔ ایک وہ جن کو خلق اللہ کی ہدایت اور خطری توفیق ملی ہے تو ان پر یہ فرض ہے کہ وہ مجمع اور ہجوم میں رہ کر ان کی

بھلائی کا فرض انجام دیں۔ یہاں تک کہ اس راہ میں ان کی دولت بھی خرچ ہوجائے اور ان کی جان بھی کام آجائے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن میں طبعاً مردم آزاری ہے اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کا مادہ ہے۔ ان کی اخلاقی اور روحانی اصلاح اسی میں ہے کہ وہ اپنے کو مجمع سے الگ رکھ کر خدا کی عبادت میں اپنا وقت صرف کریں تاکہ وہ گناہ کے بار سے اور لوگ ان کے آزار سے محفوظ رہیں"۔

دوسرا موقع جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عزلت نشینی کی اجازت دی ہے وہ ہے جب مجمع و آبادی یا قوم و ملک میں فتنہ و فساد کا بازار اس طرح گرم ہو کہ وہ اس کی روک تھام سے عاجز اور اس کی اصلاح سے قاصر ہو، تو ایسے موقع پر اس کے لئے پسندیدہ یہی ہے کہ وہ جماعت سے ہٹ کر گوشہ گیر ہوجائے چنانچہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ "ایک ایسا زمانہ لوگوں پر آئے گا جس میں ایک مسلمان کی بہترین دولت بکری ہوگی۔ جس کو لے کر وہ بارش کی جگہوں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں کو تلاش کرے گا۔ تاکہ وہ اپنے دین و ایمان کو فتنوں سے بچا سکے،

(صحیح بخاری کتاب الادب باب العزلۃ راحۃ من خلاط السوء)

گوشہ گیری اور عزلت کے یہ دو مواقع بھی درحقیقت نہایت صحیح اصول پر مبنی ہیں۔ پہلے موقع میں ایسے فرد کا جس سے جماعت اور مخلوق کو فائدے کے بجائے نقصان کا اندیشہ ہو الگ رہنا، جماعت اور فرد دونوں کے لئے فائدہ مند ہے اور دوسرے موقع پر جب کہ جماعت کا نظام ابتر ہوگیا ہو اور کوئی فرد جو بجائے خود نیک اور سعید ہو لیکن اپنی کمزوری کے باعث وہ اس جماعت کی اصلاح پر قادر نہ ہو۔ تو اس کے لئے جماعت کے دائرۂ اثر سے اپنے کو باہر رکھ کر ہی اپنی نیکی

اور سعادت کی تکمیل مناسب ہے" (سیرت النبی پنجم ص۴۴۲، ۴۵۱ حاشیہ)

ایک دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں :۔

گوشہ گیری اور جماعت سے علیحدگی کی اجازت اسلام نے صرف ایک ہی موقع پر دی ہے کہ جماعت کا قوام اتنا بگڑ جائے کہ ان کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہے اور فتنہ و فساد کے شعلے اتنے بھڑک چکے ہوں کہ ان کا بجھانا قابو سے باہر ہو جائے تو ایسے وقت میں وہ اشخاص جو اس فساد کو روکنے اور اس آگ کو بجھانے کی طاقت اپنے میں نہ پائیں۔ وہ مجمع سے الگ ہو جائیں۔ فتنہ میں عزلت نشینی کی حدیثیں اسی موقع سے تعلق رکھتی ہیں۔ ورنہ ہر قومی ہمت مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس حالت میں تبلیغ اور امر بالمعروف کے فرض کو ادا کر کے جماعت کے بچانے میں پوری کوشش صرف کرے۔ یہی وہ نمونہ ہے۔ جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں پیش کیا اور تمام بڑے بڑے صحابہ نے اپنے اپنے دائرہ میں اسی کی پیروی کی"۔

(سیرت النبی ششم ص۷۹، ۸۰)

عزلت نشینی طریقۂ صحابہ و صوفیہ نہیں

عزلت نشینی اور خلق سے گوشہ گیری نہ صحابہ کرام کا شعار تھی۔ نہ صوفیہ صافیہ کا عمومی طریق۔ چنانچہ حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:۔

" یہ اسلامی تعلیمات ہی کی برکت تھی۔ کہ صحابہ کرام جو اس کے سوا سب کچھ بھول گئے تھے اور اس کی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کو تیار تھے جو چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر حال میں اس کی یاد میں سرمست و سرشار تھے۔"

يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا   وہ خدا کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے
وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران - ۲۰)   یاد کرتے ہیں۔

اس سرمستی و سرشاری میں بھی انہوں نے جنگلوں میں راہبانہ زندگی بسر نہیں کی۔ دولت مندوں کی بھیک کو اپنا سہارا نہیں بنایا۔ دنیا کی کش مکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے بزدلانہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دے کر اختیار نہیں کیا بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جدوجہد اور سعی و کوشش کو اپنا مذہب سمجھا اور خدا کا حکم جان کر اس کو پوری مستعدی کے ساتھ بجا لاتے اور ان تمام ہنگاموں کے ساتھ دل کا معاملہ ولدار ازل کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا۔ خدا نے ان کی مدح کی

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا   وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت
بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور - ۴)   خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی (سیرت النبی جلد ۴ صفحہ ۴۸۹)

"بعض صاحبوں کو خانقاہ نشینوں کے موجودہ طرز سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ان خاصانِ حق کا ہمیشہ سے یہی طریقہ رہا ہے۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ ان بزرگوں کی سیرتوں اور تذکروں کو کھول کر پڑھیں۔ تو معلوم ہوگا کہ کہاں کے رہنے والے تھے۔ کہاں فیض پایا اور جو پایا۔ اس کو کہاں کہاں بانٹا اور کہاں جا کر زیر زمین آرام کیا اور یہ اس وقت کیا جب دنیا ریلوں، لاریوں، موٹروں اور سفروں کے دوسرے سامانِ راحت سے محروم تھی۔ معین الدین چشتیؒ سیستان میں پیدا ہوئے۔ چشت واقع افغانستان سے دولت پائی اور راجپوتانہ کے کفرستان میں آکر حق کی روشنی پھیلائی فریدؒ شکر گنج سندھ کے کناروں سے دہلی تک اور دہلی سے پنجاب تک آئے گئے اور ان کے مریدوں در مریدوں میں حضرت نظام الدین سلطان الاولیاءؒ اور

پھر ان کے خلفاء کے احوال اور ان کے سفر کے مقامات اور ان کے مزارات کی جائے وقوع کو دیکھئے کہ وہ کہاں کہاں ہیں کوئی دکن میں ہے کوئی مالوہ میں ہے کوئی بنگال میں ہے۔ کوئی صوبجات متحدہ میں ہے"

(مقدمہ سوانح مولانا الیاس رح)

ان طویل اقتباسات و مباحث کا مقصد و خلاصہ یہ ہے کہ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام میں کسی ایسے سلوک و تصوّف کی گنجائش نہیں، جو زندگی سے فرار و گریز، ترکِ دنیا، تجرّد و عزلت نشینی، جسمانی اذیت، تعطل اور دین و دنیا کی تفریق کے رہبانی و غیر اسلامی نظریات کا حامل و داعی ہو۔ حضرت سید ملت قدّس سرّہ کے نزدیک سلوک ایک پیہم مجاھدہ ہے جو اس رزمگاہ حیات کے ہر سپاہی کے لئے مقدر کیا گیا ہے کہ وہ اس آزمائش کدۂ عالم میں رہ کر، اس کے پُر فریب مناظر میں الجھ کر حسنِ ازل کی کیف انگیزیوں کو نہ بھولے، فانی میں پھنس کر باقی سے نگاہیں بند نہ کرے، دنیا کی لذتیں اس کے کام و دہن کو لذائذ عقبیٰ سے اور مخلوق کا تعلق خالق کے لطف و محبت سے بے بہرہ نہ کر دے۔ زن و اولاد کی الفت، زر و جواہر کی دلفریبی، زخارف دنیوی کا انہماک تجارت و زراعت کی مصروفیت، صنعت و حرفت کی مشغولیت اسے مالک حقیقی سے غافل نہ کر دے وہ ان تمام اشیاء کو برتے لیکن ہر لغزش گاہ سے مردانہ وار گذر جائے، باہمہ بے ہمہ اس کا حال ہو اور خلوت در انجمن، اس کی کیفیت، ہر مقام و محل، ہر فکر و عمل کے وقت باطل خواہشات، ناجائز اعمال اور اتباع ہویٰ سے بچے، رضائے الٰہی کی جستجو، اچھے اعمال کی پابندی اور خیر میں مسابقت کرے، حق و باطل، خیر و

شر، نیکی وبدی میں تمیز اس کا معمول ہو۔ اور اتباع نبوی کمال تقویٰ اس کا شعار تاکہ اس کے فطری جواہر چمکیں۔ اس کی پوشیدہ صلاحیتیں اُجاگر ہوں۔ اور وہ صفاتِ الٰہیہ کا مظہر بن کر خلافت خداوندی اور حیات طیّبہ کا سزاوار ٹھہرے۔ اور اِبتلاء، کی اس گھاٹی (دنیا) کو کامیابی سے پار کر کے رضائے الٰہی، قربِ ربّانی اور نعمائے جنت سے نوازا جائے، وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ" ٥

زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است
اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو با ہمہ رو

دُنیا یا مزرعہ آخرت

دُنیا مقصود نہیں بلکہ اسکی حیثیت آخرت کی کھیتی کی ہے

عزلت نشینی وقطع علائق سے پرہیز اور دین و دنیا کی وحدت کا ہرگز یہ مدعا نہیں کہ دُنیا کو کسی درجہ میں بھی مطلوب بنا کر زخارف دنیوی کو اپنے دل میں بسالیا جائے، کہ اسلام میں جس دنیا کی مذمت ہے اور جسے دنیا کہہ کر پکارا جاتا ہے وہ زندگی کا وہ نظریہ وچلن ہے کہ انسان ذات الٰہی سے قطعاً غافل ہو کر اسی دنیاوی زندگی کی زیب وزینت کو مدعا و مقصد بنا کر ہمہ تن۔ اسی میں مشغول ہو جائے اور احکام الٰہی اور سنن نبوّیہ کی کوئی پرواہ نہ کرے۔ دنیا ہی اس کا کعبہ مقصود ہو۔ اور یہاں کا چین وآرام اس کی زندگی کا مقصد ہو ے

اہل دنیا کافران مطلق اند

ہرزماں در حق حق در بق بق اند (رومی)

ظاہر ہے کہ ایسی دُنیا یا زندگی کی گنجائش ایک الٰہی دین و آسمانی مذہب میں کیسے ہو سکتی ہے۔ اسی بنا پر عارف رومی نے اس کرہیہ دنیا، کی مذمت کرتے ہوئے کہا۔

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں ایں خیال است ومحال است وجنون

اس کے برعکس اسلام، دنیا کے ہر اس حصول و استعمال قول و عمل کو سرے سے دنیا کہتا ہی نہیں، جو رضائے الٰہی کے لئے حدود و احکام ربانی کی پابندی و تحت میں ہو۔ دنیا اور اس کے حصول و استعمال کے وہ جملہ طریقے جو احکام الٰہی اور سنت نبویہ کے مطابق ہیں۔ سراسر دین اور عین مطلوب ہیں وہ دنیا ہے ہی نہیں۔ کہ دنیا کو دنیا کے لئے چاہنا حرام اور اس کا احکام ربّانی کے مطابق اور رضائے حق کے لئے استعمال و حصول عین دین ہے ؎

چیست دنیا از خدا غافل شدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

بات یہ ہے کہ اس دنیا کا قیام و بقا ایک خاص مقصد کی تحت میں ہوا ہے اور وہ مقصد ہے انسانوں کا اس "ابتلا کی گھاٹی" کو اس طرح پار کر لینا کہ یہاں کی زندگی اور اس کے مناظر و وقائع، احوال اعمال، معاملات و تعلقات سب انسان کے لئے معرفت و رضائے الٰہی کا زینہ بن جائے اور اس کی زندگی اس نہج سے گذرے کہ یہاں کا ایک ایک عمل اس کی آنے والی زندگی کو بنا دے اور یہاں کی نیکیوں، بھلائیوں اور احکام الٰہی کی پابندی کے پھل وہ نعمائے جنت و رضوان الٰہی کی صورت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پا سکے۔ اس لئے اس آتی جاتی زندگی کو ایک آنی و فانی، گذر جانے والا وقفہ قرار دیا گیا۔ اور اس زندگی کا جملہ خاکہ آخرت کے منافع و مضار، عقبیٰ کی مصلحتوں اور تقاضوں کو سامنے رکھ کر بنایا گیا کہ آخرت منزلِ مقصود ہے اور دنیا محض چند روزہ رہگذر و ذریعہ ہے۔ اس الٰہی خاکہ میں ضمناً و ذیلاً تمام دنیاوی اجتماعی و انفرادی منافع اور ضرورتیں آجاتی ہیں

بلکہ اس خاکہ اور طریقۂ حیات میں دنیاوی منافع خود بخود اس طرح آجاتے ہیں۔ جیسے گندم بونے والے کے لئے بھوسا ذیلاً آہی جاتا ہے۔ اس لئے آخرت کا یہ گھروندا تمامتر آخرت کی بنیاد پر استوار کیا گیا ہے۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں۔

"کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آئندہ دنیا کے گھر پر قائم ہے۔ اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمال انسانی کے نتائج کا ریشہ ریشہ بیخ و بن سے اکھڑ جائے اس لئے تمام مذاہب نے کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی اصطلاح میں دوسری زندگی کو متفقاً تسلیم کیا ہے۔"

(سیرت النبی ج ۴ ص ۶۳۵)

دنیا میں ایمان و اعمال صالحہ کے جو درخت لگائے جائیں گے۔ انہیں کا میٹھا پھل اور کفر اور برے اعمال کا کڑوا پھل آخرت میں انسان پائے گا۔ گویا دنیا آخرت کے لئے کھیتی ہے اور "آخرت" اس کے ثمرات اور پھل پانے کا مقام، اس لئے حیاتِ دنیا کا ہر ہر قدم آخرت کے نتائج کو سامنے رکھ کر اٹھایا جائے گا اور یہاں کی ہر حرکت و سکون آخرت کی زندگی کے منافع و مضار کی حامل ہو گی۔ بقول حضرت والا قدس سرہ "اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ یہ دنیا اس آئندہ دنیا کی خریداری کا بازار ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ۔

رضائے الٰہی کے باغستان کی جس کا دوسرا نام جنت ہے وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ کی قیمت کتنی ارزاں اور سستی بتائی گئی ہے۔ جاں و مال کی بازی،

قیمتِ خود ہر دو عالم گفتۂ　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

یہ دنیا اس لئے دی گئی کہ یہاں رہ کر اُس دنیا کا سودا کیجئے۔ مثلاً آپ جسطرح افریقہ اور برما میں رہ کر انڈیا کو آباد کرتے ہیں۔ اسی طرح اس دنیا میں سودا کر کے آخرت کی آبادی کی فکر میں رہیں۔ اس دنیا میں رہ کر اور اس دنیا کے کاروبار کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق انجام دے کر اور خواہشات دنیا سے بچکر اطاعتِ الٰہی کی تعمیل کر کے معرفت الٰہی اور رضائے الٰہی کی جو سرفرازی پائیں تو یہ وہی مجاہدہ ہے جو آدمؑ اور بنی آدم کیلئے مخصوص ہوا ہے۔ اور جو فرشتوں کی حدود سے خارج ہے۔"

آگے مزید ارشاد فرماتے ہیں،

"سارا عالم آفتاب سے لے کر زمین تک قلیوں کی طرح کام میں لگا ہوا ہے۔ تاکہ آدم کے بچوں کو جو اس فیضِ عام کے دسترخوان پر مہمان ہیں۔ کھانے کو روٹی اور پینے کو پانی اور پہننے کو کپڑے اور سایہ کرنے کو گھر ملیں، یہی چاروں چیزیں انسان کی اصلی ضرورتیں ہیں۔ آدمؑ کی جنت کی تعریف یہ فرمائی گئی تھی۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا	ہماری دنیاوی جنت یہی ہے
وَلَا تَعْرٰى وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا	جہاں بھوک، پیاس اور دھوپ
فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى	اور برہنگی سے بچاؤ ہو۔

انہی چیزوں کے مہیا کرنے کیلئے سارا عالم چکر کاٹ رہا　اور گردش

کر رہا ہے۔ اور اس سامان کے ہاتھ آنے کی غرض یہ تھی، کہ انسان اپنی بقا کو مدت متعینہ تک محفوظ رکھے۔ اور اس میں اپنے میزبان خلاق عالم کے شکر و طاعت کا فرض بجالائے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ	ہم نے جن و انس کو اپنی طاعت
اِلَّا لِیَعْبُدُوْن	و معرفت کیلئے پیدا کیا ہے۔

غرض سارا سامان انسان کی محدود بقا کے لئے ہے۔ اور انسان خود اللہ تعالیٰ کی طاعت کیلئے بنا ہے۔ یہی مفہوم خطبوں میں ہم کو ان الفاظ میں سنایا جاتا ہے

ان الدنیا خلقت لکم وانکم	دنیا تمہارے لئے اور تم آخرت
خلقتم للآخرۃ	کیلئے بنے ہو

.... انسان کے جسم کے مقابلے میں دنیا کی وسعت و عظمت میں کوئی شبہ نہیں لیکن اس سارے نظام عالم میں سب ہی عقل و معرفت، ہوش و رائے و علم، احساس اور مقصود ارادہ کی سب سے بڑی نعمت سے محروم ہیں اور صرف یہی چھ فٹ والا ایک انسان اس سے سرفراز کیا گیا ہے۔ اسلئے تکلیف و شریعت اور بالارادہ طاعت کا وہی ذمہ دار بنایا گیا ہے۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی	ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر،
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ	زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی،
فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ	تو سب نے اسکے اٹھانے سے
مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ	انکار کیا۔ اور ڈر گئے۔ اور
اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا	انسان نے اٹھالیا۔ وہ ظالم و
(احزاب-۹)	جاہل تھا۔

اب یہیں سے یہ مسئلہ معلوم ہوا۔ کہ انسانوں کو بارگاہ الٰہی سے جو کچھ خاص چیزیں ملی ہیں وہ اس کی اپنی نہیں۔ بلکہ بطور امانت اس کو بضرورت اور مصلحتاً سپرد ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کرکے اور اسمار صفات و خواص کا علم عطا فرما کر اس کو اپنی بقا کی بہم رسانی کا سامان بخشا۔ لیکن خود اس کی حیثیت ملائکہ عالم کو یہ بتائی گئی اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً میں زمین میں ایک نائب اور نمائندہ بنا رہا ہوں نائب اور نمائندہ وہی ہوتا ہے۔ جو اصل کی طرف سے اصل کے دیئے ہوئے احکام کو جاری کرتا اور اس کے بخشے ہوئے اختیار کو کام میں لاتا ہے اور ان احکام کے اجرار و اختیار کے کام میں لانے کے لئے جو ساز و سامان ضروری ہے وہ اسی اصل سے عاریۃً اس کو ملتا ہے اور امانۃً اس کے پاس رہتا ہے پس انسان کو عقل و قدرت، ہوش و خرد اور علم و معرفت کا جو سامان ملا ہے وہ اصل کی نقل اور مالک سے مستعار ہے انّ اللّٰہ خلق آدم علی صورتہٖ اسی مبتدار کی خبر ہے اور صوفیہ کے اس قول کی شرح ہے کہ عالم میں جو کچھ ہے سو وہ سب اسمائے الٰہی کے مظاہر ہیں۔ اور ان میں سے انسان اللہ تعالیٰ کے شؤن و صفات کا سب سے بڑا مظہر ہے اور اس طرح تخلق باخلاق اللہ کا منشار اس سے پورا کرنا ہے

یہ سب کیوں ہوا۔ تاکہ انسان خالق کی معرفت حاصل کرے اور طاعت بجالائے لیکن غافل انسان کیا کرتا رہا۔ اس عظیم الشان فرض سے جو اس پر عائد ہے غفلت برتتا رہا، اور برت رہا ہے۔ اس کو اس زمین میں متعینہ مدت کی بقار کے لئے کھانے پینے رہنے اور پہننے کی چار چیزوں کی پیدائش اور سامان کے لئے جو محدود علم اور قوت ملی تھی۔ اس کو اس نے ان چاروں چیزوں کے حصول کی غیر محدود بھوک اور پیاس میں

پیدا کر کے صرف ان کے حصول میں صرف کرنے لگا اور کر رہا ہے۔ اس کا سارا وقت اور اس کی ساری جسمانی و دماغی قوت صرف اس میں خرچ ہو رہی ہے کہ کس طرح ساری دنیا کا کھانا اور پانی اس کو مل جائے۔ ساری زمین اس کے قبضہ میں آجائے اور سارا سامان صرف اسی کے تصرّف میں رہے۔ غرض اسی سامان کے غیر ضروری ہمہ گیر حصول و حفاظت اور پیداوار اور بہتات اور سب کو صرف اپنی ملکیت بنانے میں وہ اپنی قوت اور طاقت کا ہر ذرّہ فنا کر رہا ہے اور اس کھانے پینے اوڑھنے اور رہنے کے سارے ذخیرہ پر بلا شرکتِ غیرے زیادہ سے زیادہ تصرّف کے پیچھے وہ دیوانہ ہو رہا ہے۔ اور اس مشغولیت اور انہماک میں اس کو اس دنیا کے چھوڑنے اور دوسری دنیا میں جانے اور اس کے لئے اپنے اوپر عائد کردہ فرائض کی بجا آوری میں خالق کی معرفت اور اس کے احکام کی تعمیل کو بالکل بھلا بیٹھا ہے۔ بادشاہ سے لے کر مزدور تک سب اسی میں مبتلا ہیں۔ اس کا سارا زور و ظلم، جبر و قہر، چوری و سینہ زوری، غصب، ڈاکہ، قتل کی وارداتیں اور زنا اور بدکاری، طمع و حرص، عدم قناعت، ساری برائیاں اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔ حدیث میں ہے۔

لا یملاء بطن آدم الاّ التراب — آدم کے پیٹ کو صرف قبر کی مٹی بھرے گی

پھر فرمایا۔ اگر آدم کے پاس ایک وادی ہو۔ تو وہ دوسری وادی کا جویا رہتا ہے شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے کہ کسی نے سلطان محمود کو خواب میں دیکھا کہ اس کی آنکھیں کھلی ہیں۔ ایک صاحبِ معرفت نے اس کی تعبیر دی "چشمش نگراں است کہ ملکش با دیگر آن است"

ہفت اقلیم ار بگیرد بادشاہ — ہمچناں دربندِ اقلیمے دگر

بادشاہ کو اگر ساتوں اقلیموں کی سلطنت بھی مل جائے تو وہ اس پر بھی ایک دوسری اقلیم کی فکر میں رہے گا۔ یہ حقیقت آج بھی عیاں ہے۔ بادشاہ بادشاہ سے قوم قوم سے اور ملک ملک سے صرف اس لئے لڑنے میں مصروف ہے کہ اس کو وہ بھی چاہئے، جو دوسرے کے قبضے میں ہے اس لئے انسانوں میں بے قراری، قوموں میں تباہ کاری، ملکوں میں پریشاں روزگاری اور بادشاہتوں میں ستم گاری کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے۔ اب چاہے کوئی کتنی ہی لیگ آف نیشن اور سان فرانسسکو کی مجلیس بنائے، دنیا میں امن اور اطمینان اور قوموں میں سکون اور ملکوں میں تسکین پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کا علاج صرف ایک ہی ہے۔ سیاسی و اجتماعی قناعت، آیتِ کُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ، اور اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا پر عمل، جو جس کا ہے وہ اس کو دو، ورنہ کوئی قوم سب کچھ پاکر بھی تسلی نہیں پا سکتی، اسی طرح کوئی انسان سب کا سب کھا جائے، تب بھی اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ کیونکہ وہ اسی کھانے اور پینے کو زندگی کا اصل مقصد سمجھتا ہے اور ظاہری زندگی کی اسی چہل پہل اور رونق کو اصل زندگی جانتا ہے لیکن ہم غور کریں اور سوچیں۔ کہ یہ صفت اصل میں کفر کی ہے۔ ایک مومن اور کافر کا فرق یہی ہے کہ مومن بقدر ضرورت کفاف پر بسر کرکے مالک کے حکم کے مطابق دوسری زندگی کے لئے اس پہلی زندگی کے عائد کردہ فرائض کو بجا لاتا ہے اور اس دنیا کی ضروریات میں ضرورت کی حد تک جو بقا کے لئے ضروری ہے۔ مصروف ہوتا ہے اور باقی وقت کو اصل کام میں لگاتا ہے لیکن وہ لوگ جو دوسری دنیا کے قائل نہیں۔ اپنے اعمال کی جوابدہی اور اپنے کاموں کے مواخذہ سے بے خبر ہیں۔ دیکھ لیجئے کہ ان کا سارا انہماک خواہ نوکری، زراعت،

تجارت، سلطنت، کسی کام میں ہو، جو محض خور دونوش کی بہتات اور مسکن و ملبس کی رونق اور افراط کے لئے ہے اور اس کے لئے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ ہو سکے تو غیروں کا حصہ بھی چھین کر، جھٹک کر، چوری کر کے، غصب کر کے، ڈاکہ مار کے فریب دے کر، دھوکہ دے کر، قتل کر کے حاصل کرے اور اس خوشی میں مگن رہے کہ سب کچھ ہمارے پاس ہے اور قیامت تک کے لئے ہمارے پاس سامان ہے حالانکہ خود زیست جس کے لئے قیامت کا سامان ہے چند روز سے زیادہ کی نہیں کیا ان سے زیادہ کوئی احمق ہو سکتا ہے۔ کیا جانوروں کی زندگی یہی نہیں ہے۔ انہیں کی شان میں اللہ تعالیٰ کا بار بار ارشاد ہے۔

أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا (فرقان - ۴) — کیا تو سمجھتا ہے کہ ان کافروں میں سے اکثر لوگ سنتے یا سمجھتے ہیں۔ یہ نہیں ہیں۔ مگر جانوروں کی مثل، بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ کو بھولے اور بھٹکے ہوتے۔

سورۂ محمد میں ہے

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (محمد - ۲) — اور جو کفر میں مبتلا ہیں۔ وہ اسی طرح دنیا کے فائدے اٹھاتے اور پیٹ بھرتے ہیں جیسے جانور، ان کا ٹھکانا دوزخ ہے

ایک اور آیت ہے۔

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ (حجر - ۱) — ان کو چھوڑ دیجئے۔ کہ یہ کھاتے اور دنیا سے تمتع اٹھاتے رہیں اور دنیا کی آرزو ان کو غفلت میں ڈالے رکھے۔

دوسری آیت میں ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا، وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا، وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا، أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (اعراف - ۲۲)

ان کافروں کے دل ہیں جن سے سمجھ کا کام نہیں لیتے اور آنکھیں ہیں جن سے نہیں دیکھتے اور کان ہیں جن سے نہیں سنتے، یہ جانوروں کے مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ بھٹکے ہیں

ان کی آنکھیں ہیں، مگر دیکھتے نہیں۔ کان ہیں مگر سنتے نہیں جو عضو جس کام کے لئے بنا ہے جب اس سے اس کا کام نہ لیا جائے تو وہ بیکار ہے۔ گویا اس کا وجود ہی نہیں۔ ان آیتوں میں ان کفار کو جانوروں سے بھی زیادہ بھٹکے اور بھولے ہوئے بتایا گیا ہے۔ اس لئے کہ بہر حال ہر جانور طوعاً و کرہاً زبردستی یا اپنے جی سے اس کام کو بجالا رہا ہے جس کے لئے وہ دنیا میں لایا گیا ہے، مگر جو اپنی خلقت اور دنیا میں اپنی آمد کی غرض کو بھلائے ہوئے ہیں۔ وہ تو ان سے بھی بڑھ کر بے عقل اور احمق اور بھٹکے ہیں۔

آج کل مسائل اعتقادی میں جس اعتقاد سے سب سے زیادہ غفلت برتی جارہی ہے وہ یوم الدین اور روز قیامت کا مسئلہ ہے۔ قیامت سے قیامت کی غفلت ہے۔ کافر تو کافر مسلمان تک اگر اس سے غفلت نہیں تو تغافل ضرور برت رہے ہیں یعنی ایماناً تو بہر حال اس کا عقیدہ ظاہر کرتے ہیں لیکن عملاً اس عقیدہ پر یقین ہونے کی صورت میں ان کے طرز عمل میں جو تبدیلی ہونی چاہیئے وہ نہیں ہے اس لئے بطور نظریہ کے تو وہ مانتے ہیں لیکن زندگی کے کاروبار اور اعمال میں اس ایمان سے اگر وہ کامل ہوتا۔ جس نتیجہ کی اُمید تھی۔ وہ پوری نہیں ہو رہی ہے اور سمجھتے ہیں:۔

اب تو آرام سے گزرتی ہے   عاقبت کی خبر خدا جانے

حالانکہ یہ آرام ویسے ہی ہے جیسے جانوروں کو تبیلہ میں اور کیڑوں کو نجاستوں میں اور گندگیوں میں ملتا ہے۔

ہم ایسے رہے یا کہ ویسے رہے   وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے

خدا فرماتا ہے۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ   اور آخرت ہی کی زندگی زندگی ہے

(عنکبوت - ۷)

آج کل اسی دنیاوی زندگی کے عیش و نشاط کی بہتات اور افراط کا نام ترقی رکھا گیا ہے۔ جس کی ہر طرف پکار ہے۔ دولت پرست اور سرمایہ پسند قوموں کی تقلید میں ترقی کی تعبیر بڑی بڑی ملازمتوں، بڑی بڑی تنخواہوں اور حکومت کی نگاہ میں اعزاز و اکرام وجاہ و منصب کی طلب اور حصول سے کی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ دولت اور جاہ و منصب ایسا ہی ہے۔ جیسے شاہی غلاموں کی کمر اور گلے میں طلائی اور نقرئی پٹے اور کمر بند پڑے ہوئے ہوں یا قفس کی سنہری تیلیوں کے اندر خوشنوا اور خوشنما پرندوں کو بند کر دیا جائے۔

آج کل اس راہ میں دو قسم کی گمراہیاں یکجا ہیں۔ ایک طرف سرمایہ دار قومیں ہیں۔ جنہوں نے سونے چاندی کی اینٹوں کے بت تراشے ہیں اور دنیا کے سارے سر سبز علاقوں پر اس لئے حکومت کرنا چاہتی ہیں کہ ساری دنیا کی دولت کو اپنے خزانوں میں جمع کر لیں۔ دوسری طرف اب سوشلزم کا زور ہے۔ جو حقیقت میں سرمایہ داری کی پہلی غلطی کا ردّ عمل ہے۔ پہلا گروہ اگر صرف تاجروں، زمین کے مالکوں، بینک کے حصہ داروں اور معلت کے ٹھیکیداروں کے خزانوں کے بھرنے میں مصروف ہے

اور اس کو عام انسانوں سے بحث نہیں۔ تو دوسری طرف یہ دوسرا گروہ عام انسانوں کے پیٹ کے بھرنے کے لئے کوشاں ہے اور اس حد تک تو بات صحیح بھی ہے۔ لیکن اس کی افراط یہ ہے۔ کہ اس نے انسان کو صرف پیٹ سمجھا ہے اور اس پیٹ کے مسئلہ کو دنیا کا اصلی مسئلہ بنا رکھا ہے اور اس کو اس قدر اہمیت اور وسعت دی ہے کہ ساری دنیا ایک پیٹ میں سما گئی ہے۔ مذہب، اخلاق، تمدّن، تاریخ، سے لے کر کاروباری زندگی کی صلح و جنگ کے ہر ایک حادثہ کی تشریح اسی پیٹ سے کی جاتی ہے۔ ہم کو پیٹ کی اہمیت سے انکار نہیں۔ حدیث میں جس طرح "شر فتنة الغنى" سے پناہ مانگنے کی دعا کی تعلیم ہے اسی طرح شر فتنہ الفقر سے بھی پناہ مانگنے کا حکم ہے۔ اس لئے اسلام میں دولت کے طغیان اور مفلسی کی ذلّت دونوں سے بچنے کی تعلیم یکساں ہے جس طرح طغیان دولت کا نتیجہ استکبار اور تمرّد یعنی فرعونیت و نمرودیت اور شدادیت ہو کر کفر کا موجب ہوتا ہے تو دوسری طرف ذلّت اور مسکنت غضبِ الٰہی کا مظہر ہے "ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآؤُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللهِ" قرآن میں، "كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا" روایتوں میں وارد ہے۔

لیکن ضرورت افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال کی ہے۔ موجودہ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف ایک فقرہ منسوب ہے۔ کہ آپ نے فرمایا کہ "انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا" سو! یہ بات ٹھیک ہے۔ انسان کے جسم میں پیٹ ہے جس کی مشکل کے حل کرنے کا نام علم معاشں ہے لیکن اس کے سینہ میں "دل" بھی ہے اور قرآن پاک میں اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

هٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيظٍ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ (ق - ۳)

یہ جنت موعودہ اس کے لئے ہے۔ جو باطل کو چھوڑ کر حق کو قبول کرتا ہے اور حقوق آداب کی نگرانی کرتا ہے۔ جو اللہ سے بن دیکھے ڈرا اور لایا وہ دل جس میں رجوع ہے ان سے قیامت میں کہا جائے گا کہ چلے جاؤ اس میں بسلامت۔

ایک دوسری آیت میں "يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُونَ إِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ" وارد ہے یعنی وہ قلب جو ہر باطل اور کجی سے سلامت رہا۔ حدیث شریف میں وارد ہے۔

الا ان فی الجسد لمضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وهی القلب

ہاں انسان کے بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ ٹھیک ہوگا۔ تو سارا بدن ٹھیک ہوگا۔ اور جب وہ بگڑے گا تو سارا بدن بگڑ جائے گا۔ ہاں وہ دل ہے۔

اس سے معلوم ہوا۔ کہ پیٹ کا کام اسی لئے ضروری ہے کہ اس سے قلب کو حیات مادی اور بقا حاصل ہو جب تک کے لئے اس دنیا میں اس کی بقا مقدر ہے اور قلب کا کام یہ ہے کہ سارے نظام جسم کو صالح بنائے رکھے اور فساد سے بچائے اس سے ہمارے لئے جس طرح پیٹ کے سامان کی ضرورت ہے۔ قلب کے سامان کی بھی ویسی ہی ضرورت ہے۔ دو میں سے ایک سے بھی تغافل نہیں برتا جاسکتا۔ اگر پیٹ سے غفلت برتئے اور صرف قلب کے کام میں لگے رہیئے تو عجب نہیں کہ بقول عارف۔

سنیے! جب پچھلی پہر رات کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے اور آپ تہجد کی نماز کو بھوکے پیاسے کھڑے ہوں تو کان میں آواز آئے ع

"چہ خورد بامداد فرزندم"

اگر پیٹ بھرا ہو۔ اور قلب کی اصلاح کی طرف توجہ نہ ہو۔ تو قرآن پاک کے بموجب "بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا" عیش دنیا میں ناز و غرور کی شان پیدا ہو کر خود حق تعالیٰ سے بغاوت اور طغیان پیدا ہو جاتے۔ فَاَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا، یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب کوئی بستی تباہ ہوتی ہے تو اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس بستی کے دولت مند اور اصحاب نعمت اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کو تباہ کر ڈالتا ہے اس لئے بڑی ضرورت ہے کہ پیٹ کی طرح قلب کی بھی فکر کی جائے"۔

غرض اسلام میں دنیاوی زندگی، آخرت کی زندگی کا دیباچہ اور پیش خیمہ ہے، یہاں پیٹ، و دل، کی بقا و صلاح کے لئے وہی احکام اور اوقات گذاری کے طریقے دیئے گئے ہیں۔ جو انسان کی دائمی زندگی کے لئے مفید و نافع ہے۔ گویا یہ زندگی مسافرت اور یہ عالم محض عبرت کدہ ہے۔ جہاں انسان ایک مسافر راہی کی صورت میں آتا اور اپنے وطن اصلی "الآخرة" کے لئے توشہ و سامان اکٹھا کر کے چلا جاتا ہے۔ سفر کی منزل ہر آن طے ہو رہی ہے۔ لیکن غافل راہی، راہ کے تماشوں اور ہنگاموں میں کچھ اس طرح گم ہے کہ نہ منزل یاد ہے۔ نہ وہاں کی ضرورتیں اور تقاضے، فانی لذائذ و مشاغل نے اس طرح گھیر رکھا ہے۔ کہ اپنے ہی ذاتی و دائمی اور باقی رہنے والی لذتوں اور راحتوں سے بے پرواہ اور نا آشنا ہو جاتا ہے۔ انبیاء کرام ؑ اسے اسی عمیق غفلت سے

ہشیار اور وطن اصلی کی تیاری کے لئے بیدار اور اللہ تبارک و تعالیٰ کو مرجع و مقصد قرار دینے کے لئے آتے ہیں۔ حضرت سیدنا الا رحمہ اللہ تعالی ارقام فرماتے ہیں "غور کیجئے۔ تو معلوم ہوگا کہ ہر انسان ہر وقت سفر میں ہے لیکن یہ سفر مکانی حرکت نہیں بلکہ زمانی حرکت ہے اور یہ سفر ایسا سفر ہے جو ہمارے اختیار میں نہیں۔ ابلق ایام ہر آن رواں ہے اور اس کی روانی کے ساتھ سارا عالم امکان بحالت سفر ہے۔ مکانی حرکت تو ایسی چیز ہے کہ ہم چاہیں تو حرکت کریں اور نہ چاہیں تو نہ کریں۔ مگر یہ زمانی حرکت تو ایسی چیز ہے کہ ہم ہزار نہ چاہیں مگر یہ سفر ایک لمحہ کے لئے بھی رک نہیں سکتا۔ لیکن گو حرکت ہم کو ہو رہی ہے مگر اس حرکت کے سوار ہم نہیں ؎

نے ہاتھ میں لگام نہ پاؤں رکاب میں۔

کوئی اور ہی شہسوار ہے جو برابر اپنے سوار کو حرکت دیتا چلا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سارے عالم کو حرکت ہو رہی ہے لیکن کیا عجیب بات ہے کہ ہم کو اپنے مکانی سفر کا تو احساس ہوتا ہے لیکن اپنے زمانی سفر کا کچھ بھی احساس نہیں بچہ پیدا ہوتا ہے بڑھتا ہے اور ہر آن بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جوانی کی عمر کو پہنچ جاتا ہے اور پھر وہاں سے نیچے کو کھسکتا ہے اور بڑھاپے کو پہنچ جاتا ہے اور آخر قبر میں پہنچ کر اپنی مسافرت کی کمر کھولتا ہے لیکن افسوس کہ زاد سفر پاس نہیں ہوتا۔ وَخَيْرُ الزَّادِ التَّقْوٰى اس سفر کا توشہ اور زاد راہ صرف تقویٰ اور نیک عمل ہے۔ اس زمانہ میں مادیت اس زیب و زینت اور شان و شکوہ اور جاہ و جلال سے جلوہ افروز ہے کہ روحانیت اور تزکیۂ باطن کے حسن لطیف تک نظر پہنچنے نہیں پاتی۔ اور دم اٹھتے بائیں اور آگے

پیچھے کا خوشنما منظر اس کا موقع ہی نہیں دیتا کہ خود اپنی طرف دیکھا جائے۔ وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ؏

تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درآ

حضرات صوفیہ واولیاء رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہم راہ حقیقت کے وہ مسافر ہیں جنہوں نے اس دنیا کے رونق خانہ میں کُن فی الدُّنیا کانک غریبٌ او عابری سبیلٌ کے ارشاد نبوی پر عمل فرما کر اس دنیا کو مسافر خانہ اور اپنے کو راہ چلتا مسافر سے زیادہ نہیں سمجھا' اور اس دنیا کی چیزوں سے اپنے دل کا لگاؤ اتنا ہی رکھا۔ جتنا ایک رات بھر کے مسافر کو مسافر خانہ کے سامان سے ہوسکتا ہے'۔

حیات دوروزہ کا کیا عیش وغم
سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

مگر یہ مسافرانہ بے تعلقی اگر بے تعلقی ہی کی حد تک ہے تو یہ جوگ اور رہبانیت ہے جس کی جگہ اسلام میں نہیں۔ لیکن اگر ظاہر کی بے تعلقی اس لئے ہے کہ حق تعالیٰ کیساتھ دل کی وابستگی ہو اور ظاہر کے ساتھ تعلق بھی اسلئے ہو کہ وہ باطنی وابستگی کا نتیجہ ہے اور خلق مخلوق کیساتھ تعلق اس لئے ہو کہ وہ خالق کی رضا کے حصول کا ذریعہ ہے تو وہ عین مطلوب اور عین اسلام ہے اور اسی کا نام اصطلاح عام میں تصوّف ہے۔ غرض مومن اور غیر مومن میں بڑا فرق اعمال کی قوت محرکہ اور غایت کے فرق کا ہے

وَاَمَّا مَنْ طَغٰیo وَ آثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی
وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰیo

(دیباچہ ملفوظات بزرگان دین" مؤلفہ محبوب سید ایم۔ اے)

ترجمہ:۔ جس شخص نے (حق سے) سرکشی کی ہوگی اور آخرت کا منکر ہوکر) دنیاوی زندگی کو ترجیح دی ہوگی سو دوزخ (اس کا) ٹھکانہ ہوگا اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا۔ اور نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا۔ سو جنت اس کا ٹھکانا ہوگی۔"

شریعت و طریقت کی عینیت و اتباعِ نبوت

حضرۃ الشیخ الامام قدس سرہٗ نے تصوف و سلوک کی جو تشریح فرمائی ہے۔ اس سے یہ چیز واضح اور مبرھن ہو جاتی ہے کہ سلوک کمالِ دین، احکام الٰہی کی کامل پابندی اور سنت نبویّہ کے مکمل ظاہری و باطنی اتباع کا نام ہے۔ گویا شریعت مطہرہ اور تعلیمات محمدیّہ کی بکمال اخلاص پیروی و تعمیل و تکمیل ہی طریقت ہے شریعت طریقت ہے اور طریقت عین شریعت، لہٰذا طریقت و سلوک و تصوف کا کتاب و سنّت کے دائرہ کے باہر کوئی وجود ہی نہیں۔ شریعت و طریقت کی یہ عینیت و یکجائی سلوک سلیمانی کا سب سے بڑا کمال و جمال ہے۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ارقام فرماتے ہیں۔

"جاہل پیروں اور دوکاندار صوفیوں نے ایک مسئلہ یہ گھڑا ہے کہ شریعت و طریقت دو الگ چیزیں ہیں۔ اور اِس زور و شور سے اسکو شہرت دی ہے کہ عوام تو عوام خواص تک پر اس کا رنگ چھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ تمامتر لغو اور بے معنیٰ ہے۔ حضرت حکیم الامتہؒ نے تمام عمر لوگوں کو یہی تلقین فرمائی۔ کہ طریقت عین شریعت ہے۔ احکام الٰہی کی باخلاص تمام تعمیل و تکمیل ہی کا نام طریقت ہے۔ وگرہیچ، اور

یہی خواصِ امت کا مذہب ہے اور جس نے اس کے سوا کہا وہ دین کی حقیقت سے جاہل اور فن سلوک سے ناآشنا ہے۔ اس بارگاہ کے ایک حلقہ بگوش کا شعر ہے۔

اب تو مے تو نوشی ہے عین شرع برفتوائے شیخ
اب وہی ہوگا فقیہہ شہر جو مے نوشں ہے

(رسالہ معارف اعظم گڑھ ص۱۰۱ ج ۵۲)

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں،

"شریعت عین طریقت ہے اور طریقت عین شریعت ہے"

سیرت النبی جلد پنجم میں "عبادات قلبی" کی تحت میں ارشاد فرماتے ہیں۔

" اسلام میں بعض ایسی عبادات بھی ہیں۔ جن کا تعلق تمام تر قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے۔ پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ اسلام میں ہر نیکی کا کام عبادت ہے۔ اس لئے تمام امور خواہ وہ جسمانی یا مالی یا قلبی ہوں عبادات کے اندر داخل ہیں۔ فقہا نے صرف جسمانی اور مالی عبادات سے بحث کی ہے۔ لیکن حضراتِ صوفیہ نے جسمانی اور مالی عبادات کیساتھ قلبی عبادات کو بھی شامل کرلیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ فقہا نے اپنا فرضِ منصب صرف جسمانی اور مالی فریضوں تک محدود رکھا ہے۔ اور صوفیہ نے اس سارے فریضوں کو یکجا کیا ہے۔ جن سے اسلام نے انسان کے قلب و روح کی درستی کا کام لیا ہے۔

.... یہ وہ فرائض یا قلبی عبادات ہیں جو اسلام کی روح

اور ہمارے تمام اعمال کا اصل جوہر ہیں۔ جن کے الگ کر دینے سے وہ عبادات پنجگانہ بھی جن پر اسلام نے اِس قدر زور دیا ہے۔ جسد بے روح بن جاتے ہیں .... فقہ و تصوّف کی ایک دوسرے سے علیحدگی نے ایک طرف عبادات کو خشک و بے روح اور دوسری طرف اعمالِ تصوّف کو آزاد اور بے قید کر دیا ہے۔"

کہ فقہ و تصوّف دونوں ایک ہی حقیقت (شریعت مطہرہ) کے دُو رخ، ایک ہی نور کی دو شعائیں اور ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں۔ جو اپنی تکمیل میں ایک دوسرے کی محتاج ہیں۔ کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو شریعت لے کر آئے تھے وہ ظاہر و باطن کی جامع اور جانی و مالی، قلبی و جسمانی، انفرادی و اجتماعی جملہ امور پر حاوی و محیط ہے۔ جب تک احکام الٰہی اور سنّت نبوّیہ کے جز و کل کو مانا اور اپنایا نہ جائے۔ شریعت کا اتباع مکمل نہیں ہوتا۔ کہ اسوۂ نبویہ کا دوسرا نام شریعت ہے اور جو عقیدہ و نظریہ، قول و عمل، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "قدم مبارک" کے نیچے نہیں وہ عین ضلالت ہے۔ اعمال و اقوال میں مقبولیت و محبوبیت باخلاص اتباع نبوتؐ ہی سے آتی ہے۔ اور جمالِ رسالت ہی سے اعمالِ ایمانیہ کا حسن و نکھار، خوبی اور رونق ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال ظاہری و باطنی سے جس قدر مشابہت اخلاص و احتساب کے ساتھ ہوگی۔ اسی قدر انعاماتِ ربانی، کمالات نبوت اور فیوض و برکاتِ رسالت سے انسان بہرہ مند ہوگا۔

حضرت سیّد الملت قدّس سرہٗ ارقام فرماتے ہیں۔

"بے شبہہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات سے ہر امتی بقدر استعداد

بہرہ ور ہوتا ہے۔ اور ہوتا رہے گا۔ مگر اس کو منصبِ نبوتؐ سے کوئی
تعلق نہیں کہ وہ بند ہو چکا۔"

ایک دوسرے گرامی نامہ میں تحریر فرمایا،

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض و برکات ہر وقت جاری ہیں۔ اپنے
میں استفادہ کا مادہ ہونا چاہیئے اور اس کی صورت حضور علیہ السلام کی
محبت عقلی ہے۔ جس کا مظہر اتباع احکام و سنّت ہے۔"

کسی عمل کی خوبی و کمال یہی ہے کہ وجہ عمل محض رضائے الٰہی ہو۔ اور وہ عمل زیادہ سے زیادہ حضور سید عالم (روحی فداہ) صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق، مشابہ اور قریب ہو۔ رضائے حق کا داعیہ اور یہ مطابقت و قرب جس قدر بڑھتا جائے گا۔ انشاءاللہ قرب و اقربیتِ الٰہی کی منازل طے ہوتی جائیں گی۔ کہ نعمائے ربانی کا اتمام و سبوغ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور اسوۂ مبارکہ میں کر دیا گیا ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ	آج کے دن تمہارے لئے تمہارے
وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ	دین کو میں نے کامل کر دیا۔ اور میں نے
وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ	تم پر اپنا انعام تام کر دیا۔ اور میں نے
دِیْنًا ؕ (المائدہ ـ ۱)	اسلام کو تمہارا دین بننے کیلئے پسند کر لیا۔
وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَهٗ	اور اس نے تم پر اپنی ظاہری و
ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً ؕ (لقمان ۲)	باطنی نعمتیں پوری کر دیں۔

اِس لئے کمال انسانی یہی ہے۔ کہ اِس کے عقائد و اعمال، احوال و کیفیات

سیرت واخلاق زیادہ سے زیادہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطابقت رکھتے ہوں۔ اس کے ہر قول وعمل سے سنّت کا اتباع ظاہر ہوتا ہو۔ اور اس کا دل، حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں رضائے الٰہی کی دھن میں مگن غیر سے منقطع، ذاتِ حق میں شاغل اور کیفیاتِ سرمدی میں مشغول ہو۔" صحت ایمان اور ظاہری عمل صالح کیساتھ اِس کے باطنی احوال بھی منہاج نبوت پر ہوں محبتِ الٰہی، خشیت الٰہی، اخلاق للّٰہ، تعلق مع اللہ کی اور اخلاق وعادات و شمائل میں اتباعِ سنن نبویؐ کی کیفیت ہو۔" کہ جس قدر ختم الرسل نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری و باطنی اعمال سے حصہ نصیب ہوگا۔ اسی قدر قرب ربانی اور رضائے الٰہی میسر ہوگا۔

منہاجِ رسالت ہی راہ معرفت اور طریقۂ نبوی ہی رہنمائے حق ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ظاہر و باطن ہی آئینۂ رضائے الٰہی اور اتباع نبوت ہی جادہ محبوبیت ربّانی ہے۔ حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول وعمل جاذبِ رحمت الٰہی، مفتاحِ اسرار اور ذریعہ قربت و رضائے حق ہے۔ حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیات ایمانی، احوال باطنی اور اعمال ظاہری کی تلاش و یافت اور عمل ہی ہر امتی کیلئے اس کی استعداد و اخلاص اور احتساب کے بقدر مرادیتِ ربّانی اور محبوبیت الٰہی کا زینہ ہے۔ کہ اب (یعنی بعثتِ نبوت سے قیامت تک) قرب و رضائے الٰہی معرفت ربّانی ولایتِ خاصہ و عامہ، محبوبیت و مرادیتِ حق کی جملہ منازل و مدارج طریقۂ محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ) میں مندرج، منطوی اور منحصر کر دیئے گئے ہیں۔ اب جسے بھی ملے گا اور جہاں بھی ملے گا اور جب بھی ملے گا ـــــــ

ایمان و معرفت، اعمال صالحہ، اخلاق فاضلہ کا ہر ذرہ و حصہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع و طریقہ ہی سے ملے گا۔ کہ نبی امی احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ علیا ہی انسانیت کی شاہراہِ معرفت ہے۔ ایمان و عرفان و رضاء و قربِ ربانی کا کوئی ادنےٰ ذرہ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حیطۂ نبوتؐ کے باہر اور آپ کے اسوۂ حسنہ سے ہٹ کر نہیں مل سکتا۔ آپ کا دین ہی مجسم رضائے حق اور آپ کا اسوہ ظاہری و باطنی ہی تقرب ربانی ہے۔ معرفتِ الٰہیہ کی جملہ منازل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ اور طے کردہ جادۂ ہدایت کے اندر ہی منحصر و محصور ہیں

وَ اِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍۙ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ۔ (الشوریٰ - ۵)	اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ سیدھے رستہ کی طرف ہدایت کر رہے ہیں۔ یعنی اس اللہ کے رستہ کی کہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔

بقول الشیخ قدس سرہٗ:

سنت بیضا راہ تری، چاہ خدا کی چاہ تری
شافع عاصی جاہ تری، عرش پہ مسند صلی علیٰ

لولاک لما عنوان ترا فرمان خدا فرمان ترا — پیغام خدا پیغام ترا ایمان خدا ایمان ترا
تری محبت دین مرا اور دین ترا آئین مرا
ہر لفظ پہ تیرے یقین مرا عرفانِ خدا عرفان ترا

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ادا محبوبیت کی شان لئے ہوئے ہے۔ اور آپ کا ہر عمل اجتباء و انجذاب کی کیفیت رکھتا ہے۔ آپ کے اعمال و افعال، اخلاق و شمائل میں قوتِ جاذبۂ رحمت و محبت حق ہے۔ اس لئے آپ کا طریق اتباع جذب و اجتباء اور محبوبیتِ الٰہی کا مقبول اور آسان ترین راستہ ہے جس کا ہر قدم حب الٰہی کا مورد، رضائے الٰہی کا مہبط اور عشقِ الٰہی کی دلیل و نشانی ہے۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

قہر ہو یا مہر ہو جو کچھ بھی ہو ہر ادا محبوب کی محبوب ہے
بندہ کی محبت ہے آقا کی محبت جو پیرو احمد ہے وہ محبوب خدا ہے
کیا شان ہے اللہ رے محبوب نبی کی محبوب خدا ہے وہ جو محبوب نبی ہے

اِس لئے ایک سالکِ صادق کے لئے سیدھا سادھا اور ارفع و اعلیٰ، انفع و اسہل طریق یہی ہے کہ کمالِ اخلاص اور رضائے الٰہی کی نیت سے اتباعِ نبوت کو اپنی خلوت و جلوت، ظاہر و باطن، اجتماعی و انفرادی زندگی کا مقصد و شعار بنالے اور ہر غل و غش سے اپنے دامن کو بچاتا ہوا، محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حال و قال کو مدنظر رکھ کر اس پر اپنی ہمت و عزیمت کے بقدر چلنے کی کوشش کرے۔ انشاء اللہ تعالیٰ محبوبیت الٰہی مرادیتِ ربانی اور قرب و رضا کے اعلیٰ مقام سے نواز دیا جائے گا۔ حضرت والا قدس سرہ ایک طالب کو لکھتے ہیں۔

"بے شبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی ہمارا مرکز ہے اور اس کی اتباع و پیروی میں دارین کی کامیابی ہے۔ اس کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو علم کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کیسی تھی۔

اس کا ذریعہ کتابیں ہیں یا بزرگوں کی صحبت ہے۔ دوسری چیز اس کی پیروی پر عمل ہے۔ اس کے لئے مسلمان کے دل میں عزم اور ہمت پیدا ہونی چاہیئے۔ جس عزم و ہمت سے ہم آپ دنیا کے کاموں میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اسی عزم و ہمت سے دین کے کاموں میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ"

ایک جگہ ارقام فرماتے ہیں:۔

تزکیہ اور تصفیہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر عمل کرنے ہی سے ہوسکتا ہے۔

ایک طالب کو تحریر فرماتے ہیں،

"تمام امور میں اتباعِ سنت اور احتراز از بدعت پیشِ نظر ہو۔"

ایک دوسرے مکتوب میں ہے،

"اصل شئ احکامِ الٰہی کی کلی اطاعت، حلال و حرام کا خیال، معاملات کی صفائی، اخلاق کی نزاہت، اتباعِ نبوی کا دھیان، اور تمام امور میں رضائے الٰہی کی طلب ہے۔ ان امور کی طرف توجہ فرمائیں۔ کہ یہ اصل ہیں اور باقی سب فروع و تدابیر۔"

یہ بات واضح ہے کہ حضور سرور کائنات سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال کی کامل، اور کم وکیف میں مکمل و ہوبہو مشابہت کیسے میسر آسکتی ہے۔ بقول حضرت سید الملۃ رحمہ اللہ تعالیٰ:

"ظاہر ہے۔ کہ سنتِ راشدۂ نبویہ پر پورا پورا عمل مشکل ہے۔ مگر صحیح

راستہ پر ایک قدم بھی پڑے گا۔ تو وہ کچھ نہ کچھ منزل کو قریب کردیگا۔"

اعلیٰحضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کا شعر ہے:

ایک تجلی کافی ہے گر پہنچے وہاں　　گرچہ کرتے ہیں بہت نالہ وفریاد ہم

اِس لئے سالکینِ راہِ وفا کا فرض ہے کہ آخری سانس تک اِس جادہ قرب و رضا پر چلتے رہیں۔ اس بارے میں حضرۃ الشیخ قدس سرہٗ بلند ہمتی، عزیمت اور دائمی جہد و محنت کا درس دینے کیلئے اکثر یہ شعر لکھتے تھے۔

ہمت بلند دار کہ پیش خدا و خلق　　باشد بقدر ہمتِ تو اعتبار تو نیز

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کا اپنا شعر ہے۔

اے مسافر اور تھوڑی ہمت مردانہ کر　　دیکھ لے وہ منزلِ مقصود دو سہ گام ہے

حق تو یہ ہے، کہ اگر جان جاکر بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ادا بلکہ ادا سے مشابہت نصیب ہوجائے تو سستا سودا ہے

حضرت سیدی قدس سرہٗ کا ارشاد ہے۔

جان کی قیمت دیارِ عشق میں ہے کوئے دوست
اس امید جانفزا سے سر و بال دوش ہے

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے:

"کہ اہل اللہ اور بزرگانِ دین کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ اور اعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے ان پر نگاہ رکھکر جب وہ اپنے اعمال پر نظر کرتے ہیں۔ تو اپنی کوتاہیوں کے استحضار سے انہیں اپنے اعمال کالعدم اور ہیچ در ہیچ دکھائی دیتے ہیں وہ ندامت سے روتے

ہیں۔ اور اپنے اعمال کے ہیچ اور بے کار ہونے پر قسمیں کھاتے ہیں حالانکہ ہم جیسے لوگ انہیں اعمال کو دیکھ کر انکی بزرگی کے قائل ہوتے ہیں"۔ —— کہ نمونہ اتنا کامل ہے کہ اس کی ہو بہو نقل تو دشوار ہے۔ تاہم اسوۂ وہی ہے اور اسی کے اتباع میں نجات و کامیابی ہے،

حضرت والا نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"...... قبلہ ایک ہی ہے۔ اور وہ کتاب و سنت کی تعلیم ہے اور اس پر عمل کرنا ہے، شیخ کا کام اس پر عمل کرنے کے صحیح اور آسان طریق کی تعلیم ہے"۔

پس نبی امی (روحی فداہ) صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات بخش تعلیمات اور جان پرور اسوۂ کاملہ کا اختیار و عمل ہی سلوک کی غایت اور فوز و کامرانی کا کامیاب اور دلکش راستہ ہے۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے کیا خوب کہا ہے ۔۔

تو ہے مجموعہ خوبی و سراپائے جمال
کونسی تیری ادا دل کی طلب گار نہیں

اس حرماں نصیب کی محرومی کا کیا ذکر کیا جائے۔ جو طریق کی اِس نبوی شاہراہ سے بھٹک کر دوسرے ریگزاروں اور خارزاروں میں اُلجھ گیا ہو۔ کہ وصول و قربِ ربانی کا واحد و تنہا راستہ حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق ہے ــ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ ۔

لے جائے گا منزل سے پرے دور بشر کو
جو جادۂ سفر کا ترےؐ جادہ کے سوا ہے

(سید الملۃ)

سلوک یا طریق ولایت و تقویٰ

سلوک ولایت کی راہ ہے۔ اور ولایت کا مدار ایمان و تقویٰ پر ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے،

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ	یاد رکھو کہ بیشک اللہ تعالیٰ کے دوستوں
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝	پر نہ کچھ خوف ہے نہ وہ غمگین ہونگے اور
الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا	یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں
يَتَّقُونَ ۔ (یونس - ۷)	نے تقویٰ (پرہیزگاری وگناہوں سے اجتناب) اختیار کیا۔

اِس آیت میں اولیاء اللہ ۔ ایمان و تقویٰ والوں کو کہا گیا ہے۔ پس جس قدر ایمان اور تقویٰ ہوگا، اسی قدر ولایتِ الٰہی نصیب ہوگی۔ ادنیٰ ایمان و تقویٰ پر "ولایت عامہ" میسر ہوگی جو ہر مومن کو حاصل ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔

وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ۔ 'اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا دوست ہے'

اور اگر اعلیٰ درجہ کا ایمان و تقویٰ ہوگا۔ تو کامل ولایت یعنی ولایتِ خاصہ نصیب ہوگی۔ اور یہاں مراد ولایت خاصہ ہی ہے۔ جو سلوک کا بھی موضوع ہے۔ اور جسکے متعلق قرآن کریم نے فرمایا ہے

وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ	اور اللہ تعالیٰ اہل تقویٰ کا
(الجاثیہ - ۲)	دوست ہے

پس راہ ولایتِ خاصہ کمالِ ایمان وتقویٰ کی راہ ہے۔ اور بقول علامہ آلوسی بغدادیؒ:۔

فالولیٰ[۱] هو المومن المتقی علی الکمال (روح المعانی ص۱۸۶ ج۴)	ولی (کامل) کمال درجہ کا تقویٰ والا مومن ہی ہے۔

اِس لئے سلوک کو اگر "طریقِ تقویٰ" کہا جائے تو عین حقیقت ہوگا۔ کہ ولایت کی جملہ منازل، تقویٰ ہی کے مختلف مقامات ہیں۔ اور منہاج نبوتؐ طریقِ رسالت کا منشاء ومقصد بھی تقویٰ ہی کا حصول ہے۔ ارشاد ربانی ہے

وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ○ (انعام - ١٩)	اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے جو کہ مستقیم سیدھا ہے۔ سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی۔ اس کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم (اس راہ کے خلاف کرنے سے احتیاط رکھو) اور تقویٰ کو پالو۔

---

[۱] علامہ آلوسیؒ نے کیا خوب لکھا ہے۔

واحسن ما یعتمد علیه فی معرفة الولیّ اتباع الشریعة الغراء وسلوک المحجة البیضا فمن خرج عنها قید شبرا بعد من الولایة بمراحل فلا ینبغی ان یطلق علیه اسم الولی	اور ولی کی بہترین پہچان یہ ہے کہ وہ روشن شریعت کا تبع اور شریعت کے ثابت و واضح درست طریقت کا پیروکار ہو۔ پس جو شخص شریعت کے اتباع سے ایک بالشت بھی نکل گیا۔ وہ ولایت سے مراحل دور جا پڑا۔
ولو أتی بألف خارق (روح المعانی ص۱۸۷ ج۴)	اور اگر وہ لاکھوں خوارق (کرامات) بتائے تب بھی اسپر "ولی" کا اطلاق نہیں کیا جائیگا

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک طالب کو تحریر فرماتے ہیں،

" تقویٰ قلب کی ایک کیفیتِ ایمانی کا نام ہے۔ جسکی بنیاد پر بندہ کو ہر وقت اپنے مالک کی رضاجوئی کا اہتمام رہتا ہے۔ اور ہر کام کے کرتے وقت یہ خیال رہتا ہے۔ کہ یہ کام مالک کی نظر میں جائز ہے یا نہیں۔ اور اسکے حکم کے مطابق ہے یا نہیں۔ مطابق ہو تو کرے ورنہ اُس سے احتراز کرے۔

تقویٰ بڑی اہم چیز ہے۔ اور حاصل ہے۔ سارا قرآنِ پاک اس کی اہمیت کے بیان سے معمور ہے۔

ایک دوسرے گرامی نامہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

" تقویٰ کا خیال، حلال وحرام کی فکر، جائز وناجائز کی تمیز، ہر کام میں ضروری ہے۔ تقویٰ حاصل اعمال ہے۔

ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرمایا

" حصول تقویٰ، تحلی بالفضائل اور تخلی عن الرذائل برائے رضائے الٰہی اصل سلوک ہے۔"

سیرۃ النبی (جلد پنجم) میں تقویٰ کی اہمیت جس انداز سے کلکِ سلیمانی نے ثبت فرمائی ہے۔ وہ قابل دید اور اِسی اجمال کی اچھوتی تفصیل ہے۔ ارقام فرماتے ہیں "تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غایت ہے اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں کرنا چاہیں۔ تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں۔ اِسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اِسی تقویٰ کی روح

پیدا کرنا ہے۔ قرآن پاک نے اپنی دوسری ہی سورہ میں یہ اعلان کیا ہے۔ کہ اس تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جو تقویٰ والے ہیں۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (بقرہ-۱) یہ کتب تقویٰ والوں کو راہ دکھاتی ہے

اِسلام کی ساری عبادتوں کا منشا اسی تقویٰ کا حصول ہے۔

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی
الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ جس نے تم کو اور تمہارے پہلوں کو
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ-۳) پیدا کیا عبادت کرو تاکہ تم تقویٰ پاؤ

حضرت والا قدس سرہٗ اس کے بعد قرآنی آیات سے تفصیلاً یہ بات ثابت اور مبرہن فرماتے ہیں، کہ روزہ کا مقصد، حج کا منشاء، قربانی کی غرض، مساجد کی وجہ بنیاد، اسلام کے اخلاقی نظام کا قیام انسانی مراحل زندگی کا توشہ وسامان اور جملہ اسلامی احکام کا مقصود تقویٰ ہے۔ اور اہلِ تقویٰ ہی تمام اخروی نعمتوں کے مستحق، دنیاد عقبیٰ کی فوز وفلاح وکامیابی کے سزاوار، اللہ تبارک وتعالیٰ کے محبوبین ومقبولین میں شامل اور حق سبحانہ وتعالیٰ کی معیت کے شرف سے ممتاز اور مدد سے سرفراز ہیں۔ لوگوں میں بھی ان ہی کو حسن قبول، عقیدت، محبت اور ہر دلعزیزی عطا فرمائی جاتی ہے۔ اور ان ہی کے کاموں کو دنیا اور آخرت میں بقا اور قیام نصیب ہوتا ہے۔ غرض بقول سید الملۃؒ۔ تقویٰ ہی اسلام کی تعلیم کی اصلی غایت اور وہی سارے اسلامی تعلیمات کی روح ہے۔ اور دین ودنیا کی تمام نعمتیں اہل تقویٰ ہی کے لئے ہیں۔

(سیرت پنجم صد ۱۱۳ تا صد ۲۰۱)

حقیقت تقویٰ | سید القلم مزید گوہر بار ہے

تقویٰ قلبی کیفیت کا نام ہے

تقویٰ اصل میں وقویٰ ہے، عربی زبان میں اس کے لغوی معنیٰ بچنے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں۔ لیکن وحی محمدیؐ کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے۔ جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اسکی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے۔ یہ بات کہ تقویٰ اصل میں دل کی کیفیت کا نام ہے۔ قرآن پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے جو ارکان حج کے بیان کے موقع پر ہے۔

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ — اور جو شعائر الٰہی کی تعظیم کرتا ہے

فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ — تو وہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

(حج - ۴)

اس آیت سے واضح ہوتا ہے۔ کہ تقویٰ کا اصلی تعلق دل سے ہے۔ اور وہ سلبی کیفیت (بچنا) کی بجائے ایجابی اور ثبوتی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے وہ امور خیر کی طرف دلوں میں تحریک پیدا، اور شعائر الٰہی کی تعظیم سے ان کو معمور کرتا ہے۔ ایک اور آیت کریمہ میں ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ — بے شک جو لوگ رسول اللہ کے

اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ — سامنے دبی آواز سے بولتے

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ
(حجرات — ۱)

ہیں۔ وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے واسطے جانچا ہے۔ ان کو معافی ہے اور بڑا بدلہ۔

اِس آیت میں بھی تقویٰ کا مرکز دل کو ہی قرار دیا ہے۔ اور بتایا ہے۔ کہ رسول کی تعظیم کا احساس تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک اور تیسری آیت میں تقویٰ کے فطری الہام ہونے کی طرف اشارہ ہے

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا
(الشمس — ۱)

تو ہر نفس میں اس کا فجور اور اس کا تقویٰ الہام کر دیا۔

فجور تو ظاہر ہے کہ گنہگاری اور نافرمانی کی جڑ ہے۔ ٹھیک اسی طرح تقویٰ تمام نیکیوں کی بنیاد اور اصل الاصول ہے۔ اور دونوں بندہ کو فطرۃً ودیعت ہیں۔ اب بندہ اپنے عمل اور کوشش سے ایک کو چھوڑتا اور دوسرے کو اختیار کرتا ہے۔ مگر بہرحال یہ دونوں الہام رّبانی ہیں۔ اور سب کو معلوم ہے۔ کہ الہام کا ربانی مرکز دل ہے۔ اسلئے یہی تقویٰ کا مقام ہے۔

تقویٰ کا لفظ جس طرح اِس دلی کیفیت پر بولا جاتا ہے۔ اس کیفیت کے اثر اور نتیجہ پر بھی اطلاق پاتا ہے۔ صحابہ نے کفار کے اشتعال دلانے اور ان سے بدلہ لینے پر پوری قوت رکھنے کے باوجود حدیبیہ کی صلح کو تسلیم کر لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اِس مستحسن روش کو تقویٰ فرمایا۔

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا

اور جب کفار نے اپنے دلوں

فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْحَمِیَّۃَ حَمِیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَلْزَمَھُمْ کَلِمَۃَ التَّقْوٰی وَکَانُوْا اَحَقَّ بِھَا وَاَھْلَھَا (فتح-۳)

میں پچ رکھی، نادانی کی پچ، تو اللہ تعالیٰ نے اپنا چین اپنے رسولؐ پر اور مومنین پر اتارا، اور ان کو تقویٰ کی بات پر لگا رکھا۔ اور وہی تھے اس کے لائق اور اس کے اہل۔

یہاں جنگ و خونریزی سے احتراز، خانہ کعبہ کا ادب اور کفار قریش کی جاہلانہ عصبیت سے چشم پوشی کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک اور دوسری آیت میں دشمنوں کے ساتھ ایفائے عہد اور حتی الامکان جنگ سے پرہیز کرنے والوں کو متقی یعنی تقویٰ والے فرمایا ہے۔ اور ان کے ساتھ اپنی محبت ظاہر فرمائی ہے۔

فَاَتِمُّوْٓا اِلَیْھِمْ عَھْدَھُمْ اِلٰی مُدَّتِھِمْ ط اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ۔

(توبہ-۱)

تو تم ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پورا کرو۔ خدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

فَمَا اسْتَقَامُوْا لَکُمْ فَاسْتَقِیْمُوْا لَھُمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ

(توبہ-۲)

تو جب تک تم سے سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو، خدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

جس طرح انسان کا فجور بری تعلیم، بری صحبت اور برے کاموں کی مشق اور

کثرت سے بڑھتا جاتا ہے۔ اسی طرح اچھے کاموں کے شوق اور عمل سے نیکی کا ذوق بھی پرورش پاتا ہے اور اسکی قلبی کیفیت میں ترقی ہوتی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّ اٰتَاهُمْ تَقْوٰهُمْ۔ (محمد-۲)

جو لوگ راہ پر آئے، خدا نے ان کی سوجھ اور بڑھائی۔ اور ان کو ان کا تقویٰ عطا کیا۔

اِس سے معلوم ہُوا۔ کہ تقویٰ، ایک ایجابی اور ثبوتی کیفیت ہے۔ جو انسان کو خدا عنایت فرماتا ہے، اور جس کا اثر یہ ہوتا ہے۔ کہ اس کو ہدایت پر ہدایت اور فطری تقویٰ پر مزید دولتِ تقویٰ مرحمت ہوتی ہے۔

تقویٰ کی یہ حقیقت کہ وہ دل کی خاص کیفیت کا نام ہے ایک صحیح حدیث سے۔ تصریحاً معلوم ہوتی ہے۔ صحابہ کے مجمع میں ارشاد فرمایا۔

التقویٰ ھٰھنا (مسلم) تقویٰ یہاں ہے۔

اور یہ کہہ کر دل کی طرف اشارہ فرمایا۔ جس سے بے شک وشبہہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تقویٰ دل کی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے۔ جو تمام نیکیوں کی محرک ہے اور وہی مذہب کی جان اور دینداری کی روح ہے۔ اور یہی سبب ہے۔ کہ وہ قرآن پاک کی رہنمائی کی غایت، ساری ربانی عبادتوں کا مقصد اور تمام اخلاقی تعلیموں کا ماحصل قرار پایا۔

اسلام میں برتری کا معیار اسلام میں تقویٰ کو جو اہمیت حاصل ہے اسکا اثر یہ ہے۔ کہ تعلیم محمدی نے نسل، رنگ وطن، خاندان، دولت، حسب، نسب

غرض نوع انسانی کے صدہا خود ساختہ اعزازی مرتبوں کو مٹاکر صرف ایک ہی امتیازی معیار قائم کردیا۔ جس کا نام تقویٰ ہے۔ اور جو ساری نیکیوں کی جان ہے۔ اور اسلئے وہی معیاری امتیاز بننے کے لائق ہے۔ چنانچہ قرآن نے باآواز بلند یہ اعلان کیا۔

جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔ (حجرات - ۲)	ہم نے تم کو مختلف خاندان اور قبیلے صرف اس لئے بنایا کہ باہم شناخت ہو سکے۔ خدا کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔

اس اعلان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن دو مختصر لفظوں میں ادا فرمایا۔ الکرم التقویٰ یعنی بزرگی اور شرافت تقویٰ کا نام ہے۔ اور اسی کے لئے حجۃ الوداع کے اعلان عام میں پکار کر فرمایا کہ:

"عرب کو عجم پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں، برتر وہ ہے جس میں سب سے زیادہ تقویٰ ہے۔" (سیرۃ النبی پنجم ص۲۱۱ تا ص۲۱۲)

اسلامی تعلیمات میں تقویٰ کی اِس اہمیت اور سلوک سلیمانی کی اِس تشریح کے بعد کہ وہ کمال دین اور حقیقت وتکمیلِ ایمان کے حصول ہی کی کوشش ہے۔ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سلوک طریق تقویٰ ہی کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ حضرت سید الملۃ قدس سرہٗ نے مختلف مکاتیب میں اسی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ اپنے عزیز و محبوب شاگرد مولانا مسعود عالم ندویؒ کو تحریر فرماتے ہیں۔

"بار بار اپنی خوشی و راحت اور اپنے کسی فضل پر اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کو من جانب اللہ فضلِ محض بلا استحقاق کرنا ہی احسان کا زینہ ہے

جس کا رسمی نام تصوف ہے۔ ولا مشاحۃ فی الاصطلاحات ہم نے اب اس کا نام طریق تقویٰ رکھنا چاہا ہے۔ اسلام اطاعت ہے، ایمان اس اطاعت پر سکینیت اور طمانیت ہے۔ اور اتقاء یا تقویٰ دل کی وہ کیفیت ہے جس سے امور زیر ایمان پر عمل بسہولت پر مداومت قائم ہو جائے، وللہ الحمد۔ (مکاتیب سلیمان ص ۱۶۹-۱۷۰)

ایک دوسرے گرامی نامہ میں انہی کو لکھتے ہیں

"بڑی خوشی ہوئی کہ بات کی تہہ تک آپ پہنچ گئے زادکم اللہ تعالیٰ علماً و معرفۃ تصوف کا احسان کے ساتھ ایسا تعلق ہے جیسے حکمت کے ساتھ لفظ فلسفہ قرار دیا جائے یا آج کل سائنس یا فلاسفی کہدیا جائے بزرگوں سے لفظ احسان تو اس معنی میں سن رکھا ہے اور ٹھیک ہے کہ اس کا ورود حدیثوں میں ہے لیکن اب تو مجھے اس کے لیے تقویٰ اور اتقا کی اصطلاح اچھی معلوم ہوتی ہے کہ اس کا ورود قرآن پاک میں بکثرت ہے اور عادات بلکہ تمام ماموراتہ کا مقصود اسی کیفیت کا حصول معلوم ہوتا ہے۔

ولا یخفی ذالک علی من یتتبع کتاب اللہ یاایھا الناس اعبدوا ربکم لعلکم تتقون۔۔۔۔ کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔۔۔ ۔۔۔لکن ینالہ تقوی منکم

ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب

آغازِ کتاب : هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ وغیرہ۔ اب ضرورت اِس بات کی تھی کہ حصولِ تقویٰ، حقیقت تقویٰ، شرائط تقویٰ، طریقِ حصول تقویٰ، ازالۂ موانع تقویٰ، تقویٰ فی الایمان باللہ و اسمائہ و صفاتہ و انبیائہ و کتبہ و ملائکتہ والیوم الاخر اور تقویٰ فی العبادات والمعاملات والاخلاق و کیفیات القلوب، التی ھی الاخلاص فی الدین کو بھی عقائد و فقہ کی طرح مدون کر دیا جائے۔ چنانچہ محدثین و صلحائے امت نے یہی کیا ہے۔ امام ترمذی کی کتاب الزہد والرقاق پڑھیں۔ امام احمدؒ کی کتاب الزہد اگر نہ مل سکے تو کتاب الصلوٰۃ پڑھی جائے۔ تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ سورۂ واقعہ پڑھیئے اللہ تعالیٰ نے تین گروہوں کے نام لئے ہیں۔ وَكُنتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً۔ اس کی تفسیر آگے ہے۔ اول مُقَرَّبِيْنَ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُقَرَّبُونَ، دوم اصحاب الیمین اور سوم اصحاب الشمال، تیسرا گروہ اہل نار کا ہے۔ دوسرا گروہ عامۂ مسلمین کا اور پہلا خواص امت کا، فَأَمَّا إِن كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ وَجَنَّتُ نَعِيمٍ وَأَمَّا إِن كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ فَسَلَامٌ لَّكَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ، وَأَمَّا إِن كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِينَ الضَّالِّينَ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَتَصْلِيَةُ جَحِيمٍ۔

اہلِ فن عام مسلمانوں کی کیفیت کو ولایت عامہ اور مقربین کی ولایات کو ولایت خاصہ کہتے ہیں، ولایت عامہ جو وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ (آل عمران) کا

منشا ہے۔ ہر مسلمان کو حاصل ہے اور اس کا مفاد نجاۃ من النار اور دخول فی الجنتہ ولو بعد من برھۃ العذاب ہے۔
اور ولایت خاصہ جو وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ (جاثیہ) کا منشا ہے وہ بُعد من النار بفضل اللہ دائما اور دخولِ جنت فی الفور مع رضوان اللہ تعالیٰ، رضی اللہ عنہم ورضوعنہ، اب معلوم ہُوا۔ کہ احسان کا درجہ ایمان سے اونچا ہے۔ اور اس کے بے انتہا مدارج ہیں، مدارج قرب و اقربیت کمالایخفیٰ، جس طرح ایمان کا حصول شہادت پر مبنی ہے۔ احسان کا قرب کمالِ ایمان وتقوٰی پر اسی سے ان حدیثوں کے معنی مفہوم ہوں گے۔ جن میں آتا ہے :-

لا یؤمن احدکم حتی یکون کذا

اور ایمان کی شاخیں ہیں۔ الغرض ہمارے علمائے ظاہر نے صرف اس ایمان پر توجہ فرمائی ہے۔ جو کفر کے بالمقابل ہے۔ اور علمائے باطن نے اِس کے بعد کی منزل کی رہبری کی اور درجات و مدارج قرب کی نشاندہی فرمائی" (مکاتیب سلیمان صد ۱۸۱، ۱۸۵)

اِن اقتباسات سے یہ حقیقت واضح ہوگئی۔ کہ سلوک طریقِ حصول تقوٰی ہی کا نام ہے۔ اب اسے ہم فنِ احسان کے نام سے پکاریں یا اِسے کمالِ اخلاص و ایمان کے حصول کا طریقہ کہیں، حاصل یہی ہے۔ کہ اِس راہ سے احسان وتقوٰی کی منازل طے ہوکر اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا اور قرب خاص نصیب ہوتا ہے حضرت والا قدس سرہٗ ایک طالب کو لکھتے ہیں :-

"حضرت (مولانا تھانوی) رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف سے تصوف یعنی علم احسان و اخلاص کا مقصود و مدعاء تو ذہن میں اچھی طرح آگیا ہوگا۔ یہ اولین چیز ہے، (طریق سے) مقصود بذریعہ اعمال حصول رضا و قرب ہے ایک سائل کو ارقام فرماتے ہیں :-

"...... حقیقی اور شرعی تصوف جس کا صحیح نام احسان ہے. روح دین اور جانِ ایمان ہے۔ یہ اخلاص فی اللہ اور تزکیۂ قلب اور علمِ حصول تقویٰ کا نام ہے۔"

غرض قربِ حق اور سلوک الی اللہ کی وہ راہ جس کا عام نام تصوف ہے اور جس کا مقصد شریعت مطہرہ کے ظاہر و باطن کے کامل اتباع سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب خاص حاصل کرنا ہے۔ اور جسکا مدعا کامل اخلاص و تقویٰ، و احسان اور کمال ایمان کا حصول ہے۔ اِس طریق و فن کو طریق تقویٰ سے موسوم کیا جائے تو زیادہ مناسب و بہتر ہوگا۔ کہ تقویٰ، کا جامع لفظ اسلامی شاہراہ معرفت، کی جامعیت و ہمہ گیری، شریعت و طریقت کی عینیت و یکجائی، اتباع نبوت اور طریق کی مقبولیت و ماموریت من اللہ سب پر حاوی ہے۔ مزید برآں قرآن و حدیث کا ہر صفحہ بلکہ ہر سطر تقویٰ کی اہمیت سے پُر اور تقویٰ کی دعوت سے روشن ہے۔ اس لئے اسلم و احوط یہی ہے کہ فنِ تصوف و سلوک کو تقویٰ، کی منصوص اصطلاح سے پکارا جائے کہ ایک مومن کی ولایت عامہ سے مقربین کی ولایت خاصہ تک قرب و رضائے الٰہی کی جملہ منازل، تقویٰ ہی سے طے ہوتی ہیں اور قرب و اقربیتِ حقہ اور معیت و رضا الٰہی کے لامتناہی مدارج تقویٰ والے اعمال ہی کے مختلف درجات ہیں۔

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ

(آل عمران - ۱۷)

یہ لوگ اللہ کے نزدیک مختلف طبقات میں ہوں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ

(النحل - ۱۲)

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو کہ پرہیزگار ہیں اور وہ لوگ جو احسان کرتے ہیں

سلوک یا مجاہدہ وجہادِ پیہم

دین سراپا سوختن اندر طلب　　　انتہائش عشق آغازش ادب

سلوک یا "حصول احسان وتقوی" کی راہ سراپا جہد وجہاد ہے۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت خدا کے قرب ورضا کی راہوں کا جاننا اور اُس پر آخردم تک چلنا سلوک کا مقصد ہے۔ اور یہ جہد ومحنت سے ہی میّسر آتا ہے۔ اِس بارے میں حضرت سید الملت رحمۃ اللہ علیہ نے سیرۃ النبی (جلد پنجم) میں جو کچھ "جہاد" کے عنوان کی تحت میں لکھا ہے۔ بصیرت وحقیقت رسی کے لئے سرمہ سلیمانی کا حکم رکھتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"عام طور سے اسلام کے سلسلۂ عبادات میں جہاد کا نام فقہا کی تحریروں میں نہیں آتا۔ مگر قرآن کریم اور احادیث نبوی میں اسکی فرضیت اور اہمیت بہت سے دوسرے فقہی احکام اور عبادات سے بدرجہا زیادہ ہے۔ اِس لئے ضرورت ہے کہ اِس فریضۂ عبادت کو اپنے

موقع پر جگہ دیجائے۔ اور اسکی حقیقت پر ناواقفیت کے جو تو بر تو
پردے پڑ گئے ہیں ان کو اٹھایا جائے۔"

"جہاد" کے معنی عموماً قتال اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں۔ مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے۔ 'جہاد' کا لفظ جہد سے نکلا ہے۔ جہاد اور مجاہدہ فعال او مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں۔ اور لغت میں اس کے معنی محنت او کوشش کے ہیں۔ اسی کے قریب قریب اسکے اصطلاحی معنیٰ بھی ہیں۔ یعنی حق کی بلندی اور اسکی اشاعت اور حفاظت کے لئے ہر قسم کی جدوجہد، قربانی اور ایثار گوارا کرنا، او ان تمام جسمانی و مالی، و دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں۔ اِس راہ میں صرف کرنا۔ یہاں تک کہ اس کے لئے اپنی، اپنے عزیز و قریب کی، اہل و عیال کی، خاندان و قوم کی جان تک قربان کر دینا اور مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا ان کی تدبیروں کو رائگاں کرنا۔ ان کے حملوں کو روکنا، اور اس کیلئے جنگ کے میدان میں اگر لڑنا پڑے تو اِس کیلئے بھی پوری طرح تیار رہنا یہی جہاد ہے۔ اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔

افسوس ہے کہ مخالفوں نے اتنے اہم اور اتنے ضروری اور اتنے وسیع مفہوم کو جس کے بغیر دنیا میں کوئی تحریک نہ کبھی سرسبز ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے صرف "دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ" کے تنگ مفہوم کے میدان میں محصور کر دیا ہے۔ یہ بات بار بار کہی اور دکھائی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس تعلیم اور شریعت کو دنیا میں لیکر آئے۔ وہ محض نظریہ اور فلسفہ نہیں بلکہ عمل اور سرتاپا عمل ہے۔ آپ کے مذہب میں نجات کا استحقاق گوشہ گیری، رہبانیت

نظری مراقبہ، دھیان اور الٰہیات کی فلسفیانہ خیال آرائی پر موقوف نہیں۔ بلکہ خدا کی توحید، رسولوں اور کتابوں اور فرشتوں کی سچائی، قیامت اور جزا و سزا کے اعتقاد کے بعد ان ہی کے مطابق عمل خیر اور نیک کرداری کی جدوجہد پر مبنی ہے۔ اسی لئے قرآن پاک میں جہاد کا مقابل لفظ "قعود" (بیٹھنا یا بیٹھ رہنا) استعمال کیا گیا ہے۔ جس سے مقصود سستی، تغافل اور ترکِ فرض ہے۔ سورۂ نساء میں ہے۔

لَا یَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ	مسلمانوں میں سے وہ جن کو کوئی
مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ	جسمانی معذوری نہ ہو۔ اور پھر بیٹھے
غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ	رہیں۔ اور جو خدا کی راہ میں اپنی جان
وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِیْ	ومال سے جہاد کر رہے ہوں
سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِهِمْ	برابر نہیں، اللہ نے اپنی جان و
وَاَنْفُسِهِمْ ط فَضَّلَ اللّٰہُ	مال سے جہاد کرنے والوں کو
الْمُجَاهِدِیْنَ بِاَمْوَالِهِمْ	بیٹھنے والوں پر درجہ کی فضیلت
وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِیْنَ	عطا کی ہے۔ اور ہر ایک سے خدا نے
دَرَجَةً ط وَ كُلًّا	بھلائی کا وعدہ کیا ہے۔ اور جہاد
وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰى ط	کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر
وَفَضَّلَ اللّٰہُ الْمُجَاهِدِیْنَ	بڑے اجر کی فضیلت بخشی ہے

عَلَى الْقَاعِدِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا (نسا۔ ۱۳)

اس بیٹھنے اور جہاد کرنے کے باہمی تقابل سے کھل جاتی ہے کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے، سستی کرنے اور آرام ڈھونڈنے کے سراسر خلاف ہے

یہاں ایک شبہہ کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "جہاد" اور قتال" دونوں ہم معنٰی ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن پاک میں دونوں لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہیں۔ اسلئے جہاد فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں جہاد کرنا) اور قتال فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں لڑنا) اِن دونوں لفظوں کے ایک معنٰی نہیں ہیں۔ بلکہ ان دونوں میں خاص و عام کی نسبت ہے۔ یعنی ہر جہاد، قتال نہیں۔ بلکہ جہاد کی مختلف قسموں میں سے ایک قتال اور دشمنوں سے لڑنا بھی ہے۔ اِس لئے قرآن پاک میں ان دونوں لفظوں کے استعمال میں ہمیشہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اسی سورۂ نساء کی اوپر کی آیت میں اور دوسری آیتوں میں جہاد کی دو صریح قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ جہاد بالنفس[۱] اور جہاد بالمال[۲]، یعنی اپنی جان کے ذریعہ جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعے جہاد کرنا، جان کے ذریعہ جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کی حمایت کیلئے ہر قسم کی جسمانی تکلیف بے خطر اٹھائی جائے، یہاں تک کہ اپنی جان تک جوکھوں میں ڈال دینے، آگ میں جلائے جلنے، سولی پر لٹکائے جانے، تیر اور نیزے میں چھد جانے اور تلوار سے کٹ جانے کیلئے، ہر وقت آمادہ اور مستعد رہے، مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کو کامیاب اور سربلند کرنے کیلئے اپنی ہر ملکیت کو قربان، اپنی ہر دولت کو نثار، اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کیلئے تیار رہے۔ اسی جان اور مال کی باطل محبت، شخص اور قوم کی ترقی و سعادت کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ گر یہ دونوں بت ہمارے سامنے سے ہٹ جائیں، تو ہم "کامل موحد" ہو جائیں اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں

روک سکتی۔ جسمانی اور روحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے۔ اس کے سوا کچھ اور نہیں۔

ترقی وسعادت کا یہ گُر صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا۔ اور آپ ہی نے یہ نکتہ امت کو سکھایا، اسی جہاد کا جذبہ اور اسی کے حصول ثواب کی آرزو تھی جس کے سبب سے مکہ میں مسلمانوں نے تیرہ برس تک ہر قسم کی تکلیفوں کا بہادرانہ مقابلہ کیا۔ ریگستان کی جلتی دھوپ، پتھر کی بھاری سل، طوق وزنجیر کی گرانباری، بھوک کی تکلیف پیاس کی شدت، نیزہ کی انی، تلوار کی دھار، بال بچوں سے علیحدگی، مال و دولت سے دست برداری، اور گھر بار سے دوری، کوئی چیز بھی ان کے استقلال کے قدم کو ڈگمگا نہ سکی۔ اور پھر دس برس تک مدینہ منورہ میں انہوں نے تلوار کی چھاؤں میں گذارے وہ دنیا کو معلوم ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ	مومن وہی ہے۔ جو اللہ اور اس
اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ	کے رسول پر ایمان لائے، اور
ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْ وَ	پھر اس میں وہ ڈگمگائے نہیں۔ اور
جَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ	خدا کے راستہ میں اپنی جان سے
وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ	اور مال سے جہاد کیا۔ یہی سچے اترنے
اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ	والے لوگ ہیں

(حجرات ـ ۲)

فَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا	پھر جنہوں نے اپنا گھر بار چھوڑا

مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا	اور اپنے گھروں سے نکالے گئے
فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا	اور میری راہ میں ستائے گئے۔ اور
لَاُکَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ	لڑے اور مارے گئے۔ ان کے
وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ	گناہوں کو ان سے اتاروں گا۔ اور
الاٰیۃ (اٰل عمران - ۲۰)	ان کو بہشت میں داخل کرونگا۔

جہاد کی قسمیں ۱۔ جب جہاد کے معنیٰ محنت، سعی بلیغ اور جدوجہد کے ہیں تو ہر نیک کام اس کے تحت میں داخل ہو سکتا ہے۔ علمائے دل کی اصطلاح میں 'جہاد' کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے اور اسی کا نام ان کے ہاں "جہاد اکبر" ہے۔ خطیب نے تاریخ میں حضرت جابرؓ صحابی سے روایت کی ہے کہ آپ نے صحابہ سے جو ابھی لڑائی کے میدان سے آئے تھے، فرمایا، "تمہارا آنا مبارک تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو۔ کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہوائے نفس سے لڑنا ہے۔"
حدیث کی دوسری کتابوں میں اس قسم کی اور بعض روایتیں بھی ہیں (بحوالہ کنزالعمال کتاب الجہاد صفحہ ۲۸۵/۲) چنانچہ ابن نجار نے ابوذرؓ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "بہترین جہاد یہ ہے۔ کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرے۔" یہی روایت دیلمی میں ان الفاظ میں ہے۔ "کہ بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کیلئے اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرو۔" یہ تینوں روایتیں گو فن کے لحاظ سے چنداں مستند نہیں ہیں۔ مگر یہ درحقیقت بعض صحیح حدیثوں کی تائید اور قرآن پاک کی اس آیت کی تفسیر ہیں۔

وَالَّذِیۡنَ جَاھَدُوۡا	اور جنہوں نے ہمارے بارہ میں
فِیۡنَا لَنَھۡدِیَنَّھُمۡ	جہاد کیا۔ (یعنی محنت اور تکلیف اٹھائی)
سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ	ہم ان کو اپنا راستہ آپ دکھائیں
الۡمُحۡسِنِیۡنَ	گے۔ اور بے شبہ خدا نیکو کاروں
(عنکبوت - ۷)	کے ساتھ ہے۔

اس پورے سورہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حق کیلئے ہر مصیبت و تکلیف میں ثابت قدم اور بے خوف رہنے کی تعلیم دی ہے۔ اور اگلے پیغمبروں کے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ کہ وہ ان مشکلات میں کیسے ثابت قدم رہے۔ اور بالآخر خدا نے ان کو کامیاب اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا۔ سورہ کے آغاز میں ہے۔

وَمَنۡ جَاھَدَ فَاِنَّمَا	اور جو کوئی جہاد کرتا ہے (یعنی
یُجَاھِدُ لِنَفۡسِہٖ اِنَّ	محنت اٹھاتا ہے) وہ اپنے ہی
اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ	نفس کیلئے جہاد کرتا ہے۔ اللہ
(عنکبوت - ۱)	تو جہاں والوں سے بے نیاز ہیں۔

اور سورہ کے آخر میں فرمایا کہ " ہمارے کام میں یا خود ہماری ذات کے حصول میں یا ہماری خوشنودی کی طلب میں جو جہاد کرے گا۔ اور محنت اٹھائے گا۔ ہم اس کیلئے اپنے تک پہنچنے کا راستہ آپ صاف کردیں گے۔ اور اس کو اپنی راہ آپ دکھائیں گے۔" یہی مجاہدہ، کامیابی کا زینہ اور روحانی ترقیوں کا وسیلہ ہے سورۂ حج میں ارشاد ہوا:-

وَجَاھِدُوۡا فِی اللّٰہِ	اور محنت کرو۔ اللہ میں پوری

حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَاجْتَبٰكُمْ — محنت، اس نے تم کو چنا ہے
وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي — اور تمہارے دین میں تم پر کوئی
الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ — تنگی نہیں کی، تمہارے باپ
مِلَّةَ اَبِيْكُمْ — ابراہیم کا دین
اِبْرٰهِيْمَ۔ (حج – ۱۰)

یہ "اللہ میں محنت اور جہاد کرنا" وہی جہاد اکبر ہے۔ جس پر ملت ابراہیمی کی بنا ہے، یعنی حق کی راہ میں عیش و آرام، اہل و عیال، اور جان و مال ہر چیز کو قربان کر دینا، ترمذی، طبرانی، حاکم اور صحیح ابن حبان میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ "المجاھد من جاھد نفسہ" (بحوالہ کنز العمال کتاب الایمان ج۱ ص۳۹) یعنی "مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔" صحیح مسلم میں ہے۔ کہ ایک دفعہ آپ نے صحابہ سے پوچھا، کہ "تم پہلوان کس کو کہتے ہو" عرض کیا "جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں" فرمایا "نہیں پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے" (صحیح مسلم ج۲ ص۲۹۶) یعنی جو اس پہلوان کو پچھاڑ سکے اور اس حریف کو زیر کر سکے جسکا کھاڑہ خود اس کے سینہ میں ہے۔"

۲: جہاد کی دوسری قسم حضرت سید الملت رحمۃ اللہ علیہ نے جہاد بالعلم قرار دی ہے۔ انشاء اللہ اس کا بیان آگے تبلیغ و دعوت کے ذیل میں آ رہا ہے تیسری قسم جہاد بالمال ہے۔

۳: جہاد بالمال :-

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت عطا کی ہے۔ اس کا

منشا بھی یہ ہے۔ کہ اس کو خدا کی مرضی کے راستوں میں خرچ کیا جائے یہاں تک کہ اِس کو اپنے اور اپنے اہل وعیال کے آرام و آسائش کیلئے بھی خرچ کیا جائے تو اسی کی مرضی کیلئے، دنیا کا ہر کام روپے کا محتاج ہے اسلئے اس جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہیں ہے، دوسری اجتماعی تحریکوں کی طرح اسلام کو بھی اپنی ہر قسم کی تحریکات اور جدوجہد میں سرمایہ کی ضرورت ہے اِس سرمایہ کا فراہم کرنا اور اسکے لئے مسلمانوں کا اپنے اوپر ہر طرح کا ایثار گوارا کرنا جہاد بالمال ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وصحبت کی برکت سے صحابہ کرام نے اپنی عام غربت اور ناداری کے باوجود اسلام کی سخت سے سخت گھڑیوں میں جس طرح مالی جہاد کیا ہے۔ وہ اسلام کی تاریخ کے روشن کارنامے ہیں۔ اور ان سیرابیوں سے دین حق کا باغ چمن آرائے نبوت کے ہاتھوں سرسبز وشاداب ہوا۔ اور اس لئے اسلام میں ان بزرگوں کا بہت بڑا رتبہ ہے......

قرآن پاک میں مالی جہاد کی تنبیہ و تاکید کے متعلق بکثرت آئیتیں ہیں، بلکہ بہ مشکل کہیں جہاد کا حکم ہوگا، جہاں اِس جہاد بالمال کا ذکر نہ ہو، اور یہ امر قابل لحاظ ہے، کہ ان میں ہر ایک موقع پر جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو تقدم بخشا گیا.... اس تقدم کے کئی اسباب اور مصلحتیں ہیں۔

میدان جنگ میں ذاتی اور جسمانی شرکت ہر شخص کیلئے ممکن نہیں۔ لیکن مالی شرکت ہر ایک کیلئے آسان ہے۔

جسمانی جہاد یعنی لڑائی کی ضرورت ہر وقت نہیں پیش آتی ہے۔ لیکن مالی جہاد کی ضرورت ہر وقت اور ہر آن ہوتی ہے۔

انسانی کمزوری یہ ہے کہ مال کی محبت اس کی جان کی محبت پر اکثر غالب آجاتی ہے۔

گر جان طلبی مضائقہ نیست　　　گر زر طلبی سخن دریں است

۴: جہاد کے ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادائیگی میں اپنی جان و مال و دماغ کی قوت کو صرف کرنے کا نام بھی اسلام میں جہاد ہے ....

۵: اس سے ظاہر ہوا کہ جہاد بالنفس یعنی اپنے جسم و جان سے جہاد کرنا، جہاد کے ان تمام اقسام کو شامل ہے۔ جن میں انسان کی کوئی جسمانی محنت صرف ہو، اور اس کی آخری حد خطرات سے بے پرواہ ہوکر اپنی زندگی کو بھی خدا کی راہ میں نثار کر دینا ہے۔ نیز دین کے دشمنوں سے اگر مقابلہ آپڑے اور حق کی مخالفت پر تل جائیں۔ تو ان کو راستہ سے ہٹانا اور اس صورت میں ان کی جان لینا یا اپنی جان دینا جہاد بالنفس کا انتہائی جذبۂ کمال ہے ایسے جان نثار اور جانباز بندے کا انعام یہ ہے کہ اس نے اپنی جس عزیز متاع کو خدا کی راہ میں قربان کیا، وہ ہمیشہ کیلئے اس کو بخش دیجائے، یعنی فانی حیات کے بدلہ اس کو ابدی حیات عطا کردیجائے اس لئے ارشاد ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ	جو خدا کی راہ میں مارے گئے
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ؕ	ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ
بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا	ہیں۔ لیکن تم کو اس کا احساس
تَشْعُرُوْنَ۔ (البقرہ - ۱۹)	نہیں۔

ان جانثاروں کا نام شریعت کی اصطلاح میں "شہید" ہے یہ عشق و محبت

کی راہ کے شہید زندہ جاوید ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شُد بعشق

ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

یہ اپنے اسی خونی گلگوں پیراہن میں قیامت کے دن اٹھیں گے (صحیح مسلم کتاب الجہاد) اور حق کی جو عملی شہادت اس زندگی میں انہوں نے ادا کی تھی، اس کا صلہ اس زندگی میں پائیں گے،

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ (آل عمران ۱۴)

اسی کے ساتھ وہ جانباز بھی جو گو اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اترے تھے۔ لیکن ان کے سر کا ہدیہ دربار الٰہی میں اِس وقت اس لئے قبول نہ ہوا۔ کہ ابھی ان کی دنیاوی زندگی کا کارخانہ ختم نہیں ہُوا تھا۔ وہ بھی اپنی حسن نیت کی بدولت رضائے الٰہی کی سند پائیں گے۔ اس لئے ان کو عام مسلمان ادب و تعظیم کیلئے غازی، کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ	اور جو خدا کی راہ میں لڑتا ہے۔
اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ	پھر وہ یا مارا جاتا ہے۔ یا وہ
فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا	غالب آتا ہے۔ تو ہم اس کو بڑا
عَظِيْمًا (نساء-۱۰)	بدلہ عنایت کرینگے۔
فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا	تو جنہوں نے میری خاطر گھر بار
مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا	چھوڑا اور اپنے گھروں سے
فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا	نکالے گئے، اور ان کو میری راہ

لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ	میں تکلیفیں دی گئیں، اور وہ لڑے
وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ	اور مارے گئے ہم ان کے گناہوں
تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ	کو چھپا دیجئے، اور ان کو جنت میں
ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ	داخل کریں گے، جس کے نیچے
اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ	نہریں بہتی ہوں گی، خدا کی طرف
الثَّوَابِ	سے ان کو یہ بدلہ ملے گا۔ اور خدا
(آل عمران ــ ۲۰)	کے پاس اچھا بدلہ ہے۔

اِن آیات کی تفسیر و تشریح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے۔ وہ احادیث میں مذکور ہے۔ جس میں شہیدوں کی فضیلتیں، اور ان کی اخروی نعمتوں کی تفصیل نہایت مؤثر الفاظ میں ہے۔ اسی شہادت اور غزا کے عقیدے نے مسلمانوں میں مشکلات کے مقابلہ اور دشمنوں سے بے خوفی کی وہ روح پیدا کر دی، جس کی زندگی اور تازگی کا ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی وہی عالم ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو مسلمانوں کو دین کی خاطر جان دینے پر اس قدر جلد آمادہ کر دیتا ہے۔ اور اس حیات جاوید کی تلاش میں ہر مسلمان بیتاب نظر آتا ہے۔ یہ وہ رتبہ ہے جس کی تمنا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر کی اور فرمایا۔ "کہ" مجھے آرزو ہے۔ کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں۔ اور دوبارہ مجھے زندگی ملے اور میں اس کو بھی قربان کر دوں، اور پھر تیسری مرتبہ زندگی ملے اور اسکو بھی خدا کی راہ میں نثار کر دوں۔ (صحیح مسلم کتاب الجہاد)۔

ذرا ان فقروں پر ایک بار اور نگاہ ڈال لیجئے۔ ان میں یہ نہیں ہے۔ کہ میں دوسرے کو مار ڈالوں، بلکہ یہ ہے کہ حق کے راستہ میں مارا جاؤں اور پھر زندگی ملے۔ پھر مارا

جاؤں پھر زندگی ملے اور پھر مارا جاؤں۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را * ہر زمان از غیب جان دیگر است

دائمی جہاد | یہ تو وہ جہاد ہے جس کا موقع ہر مسلمان کو پیش نہیں آتا۔ اور جس کو آتا ہے۔ تو عمر میں ایک آدھ ہی دفعہ آتا ہے۔ مگر حق کی راہ میں دائمی جہاد وہ جہاد ہے۔ جو ہر مسلمان کو ہر وقت پیش آسکتا ہے۔ اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر امتی پر یہ فرض ہے کہ دین کی حمایت، علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبوں کی مدد، زیردستوں کی امداد، سیہ کاروں کی ہدایت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامت عدل ردّ ظلم، اور احکام الٰہی کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے، یہانتک کہ اسکی زندگی کی ہر جنبش وسکون ایک جہاد بن جائے، اور اسکی پوری زندگی جہاد کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آئے۔ سورۂ ال عمران کی جس میں جہاد کے مسلسل احکام ہیں آخری آیت ہے۔

يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (ال عمران ۔ ۲۰۰)	اے ایمان والو! مشکلات میں ثابت قدم رہو اور مقابلہ میں مضبوطی دکھاؤ اور کام میں لگے رہو اور خدا سے ڈرو، شاید کہ تم مراد کو پہنچو۔

یہی وہ جہاد محمدی ہے جو مسلمان کی کامیابی کی کنجی اور فتح وفیروزی کا نشان ہے (سیرۃ پنجم ص۳۹۶ تا ص۴۰۱)

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی ان تصریحات سے واضح ہوجاتا ہے۔ کہ مؤمن

کی زندگی سراپا جہد و محنت، مشقت و جہاد ہے۔ اِس لئے اسلام میں سلوک و معرفت کی راہ بھی دائمی جہد و محنت کا ایک غیر مختتم سلسلہ ہے کہ آخری سانس تک عبدیت کا مجاہدہ ختم نہیں ہوتا ہے

یا بم اورا یا نیابم جستجوئے می کنم
حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم
یا جاں رسد با جاناں یا جاں ز تن برآید

ظاہر و باطن کی یکجائی

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کامل دین لے کر آئے تھے اور آپ نے تقوٰی کی جس راہ کی رہنمائی فرمائی تھی۔ گذر چکا، کہ اسکی جامعیت وکمال میں دین و دنیا اور ظاہر و باطن کی دوئی کی قطعاً گنجائش نہ تھی۔ اسوہ نبویہ (علی صاحبہا الصلوۃ التحیہ) صحابہؓ کا طرزِ عمل اور خیر القرون کا تعامل گواہ ہے۔ کہ اس عصر سعادت میں ظاہر و باطن کے سوتے یکجا بہتے تھے۔ ظاہری علوم کی تعلیم و تعمیل اور باطنی ملکات کی اصلاح و تربیت کیلئے کوئی دوگونہ نظام و سلسلہ رائج نہیں تھا۔ بلکہ جو ظاہر کو سنوارتے تھے اور کتاب وسنت کی ظاہری تعلیم کے مسند نشین تھے وہی علوم باطنیہ، حکمت وحقائق ربانی اور دقائق احسانی کے رمز آشنا اور تزکیہ قلبی اور اصلاحِ باطن کے پیشوا اور ذمہ دار تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ نبوی اصلاح نفوس اور تزکیۂ باطن کا کام اور شریعت کے ظاہری اتباع کا اہتمام توام تھا۔ سہ گانہ فرائض نبوت، تلاوتِ کتاب، تعلیم قرآن وحکمت اور تزکیۂ کا کام یکجا اور یکساں انجام پا رہا تھا۔ اور ہدایتِ ربانی اور میراث نبوتؐ کی کامل تقسیم ظاہر و باطن کی جامع ہستیوں کے ذریعے کروائی جارہی تھی۔ اور اسلام کی جامعیت وکمال تربیت و اصلاح کے پورے نظام میں نمایاں نظر آرہا تھا۔ لیکن قرون متأخرہ میں متعدد وجوہ کی بناپر

یہ یکجائی قائم نہ رہ سکی اور ظاہری و باطنی علوم کے حاملین علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔ تاہم بحمداللہ تعالیٰ ہر دور میں ایسی مستثنیٰ ہستیاں رہیں اور ہیں جو اپنے اندر ظاہر و باطن کا جمال و کمال سموئے ہوتے ہیں۔ اور حقیقتاً وہی صحیح اور کامل وارثان نبوت ہیں

ہمارے حضرت والا سید الملۃ قدس سرہٗ اِس دور میں ظاہر و باطن کی یکجائی کا عملی نمونہ اور اسی وحدت کے داعی تھے۔ چنانچہ ارقام فرماتے ہیں۔

"..........رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے (نبوت کے) ان تینوں فرائض (تلاوت احکام، تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ) کو بحسن خوبی انجام دیا، لوگوں کو احکام الٰہی اور آیات ربّانی پڑھ کر سناتے، اور ان کو کتاب الٰہی اور حکمتِ ربّانی کی باتیں سکھائیں اور اسی پر اکتفا نہ کی، بلکہ اپنی صحبت، فیض تاثیر اور طریق تدبیر سے پاک و صاف بھی کیا۔ نفوس کا تزکیہ فرمایا۔ قلوب کے امراض کا علاج کیا اور برائیوں اور بدیوں کے زنگ اور میل کو دور کر کے اخلاق انسانی کو نکھارا اور سنوارا، یہ دونوں ظاہری و باطنی فرض یکساں اہمیت سے ادا ہوتے رہے۔ چنانچہ صحابہ اور ان کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین کے تین قرنوں تک یہ دونوں ظاہری و باطنی کام اسی طرح توام رہے۔ جو استاد تھے وہ شیخ تھے اور جو شیخ تھے وہ استاد تھے۔ جو مسند درس کو جلوہ دیتے تھے وہ خلوت کے شب زندہ دار اور اپنے ہمنشینوں کے تزکیہ و تصفیہ کے بھی ذمہ دار تھے۔ ان تینوں طبقوں میں استاد اور شیخ کی تفریق نظر نہیں آتی۔

اس کے بعد وہ دور آنا شروع ہوا۔ جس میں مسندِ ظاہر کے درس گو باطن کے کورے اور باطن کے روشن دل ظاہر سے عاری ہونے لگے اور عہد بہ عہد ظاہر و باطن کی یہ خلیج بڑھتی ہی چلی گئی۔ تا آنکہ علوم ظاہر کیلئے مدارس کی چہار دیواری اور تعلیم و تزکیہ باطن کیلئے خانقاہوں اور رباطوں کی تعمیر عمل میں آئی، اور وہ مسجد نبوی جس میں یہ دونوں جلوے یکجا تھے۔ اسکی تجلیات مدرسوں اور خانقاہوں کے دو حصوں میں تقسیم ہو گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس سے علمائے دین کی جگہ علماء دنیا نکلنے لگے۔ اور باطن کے مدعی علم شریعت کے اسرار و کمالات سے جاہل ہو کر رہ گئے۔

تاہم اس دور کے بعد بھی ایسی مستثنٰی ہستیاں پیدا ہوتی رہیں۔ جن میں نور نبوت کے یہ دونوں رنگ بھرے تھے۔ اور غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا۔ کہ اسلام میں جن بزرگوں سے فیوض پہنچے اور پھیلے وہ وہی تھے۔ جو ان دونوں کے جامع تھے۔ امام غزالیؒ جن سے علم معقول و منقول نے جلوہ پایا علم حقیقت نے بھی انہیں کے ذریعہ ظہور پایا۔ حضرت شیخ ابو النجیب سہروردی ایک طرف شیخ طریقت ہیں تو دوسری طرف مدرسۂ نظامیہ کے مدرس، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ امام وقت اور شیخ طریقت دونوں ہیں۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جن کو علماء ظاہر سمجھا جاتا ہے۔ جیسے حضرات محدثین امام بخاری، ابن حنبل، سفیان ثوری وغیرہ وہ بھی اس جامعیت سے سرفراز تھے۔

متوسطین میں علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم رحمہا اللہ تعالیٰ کو ناواقف باطن سے خالی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان کے احوال و سوانح ان برکات باطنی سے لبریز ہیں۔ ابن قیم کی مدارج السالکین وغیرہ کتابیں پڑھیئے تو اندازہ ہوگا۔ کہ وہ آرائش ظاہر اور جمال باطن دونوں سے آراستہ تھے۔

ہندوستان میں جن بزرگوں کے دم قدم سے اسلام کی روشنی پھیلی وہ حقیقت میں وہی تھے، جن کی ذات میں مدرسہ اور خانقاہ کے کمالات کی جامعیت تھی، کہ وہ اسوۂ نبوت سے قریب تر تھے۔ اس لئے اِن کا فیض بعید سے بعید تر حصہ تک پھیلتا چلا گیا، آسمان دلّی کے مہرو ماہ اور تارے شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر شاہ اسماعیل تک کو آپ ایک ایک کر کے دیکھیں تو ظاہر و باطن کے علوم والوں کی یکجائی کا نظارہ آپ کو ہوگا اور اس سے ان کے علمی و روحانی برکات کی وسعت کی حقیقت آشکارا ہو جائے گی، وہ علوم کی تدریس کیوقت "یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ" کا جلوہ دکھاتے تھے اور حجروں میں بیٹھ کر "يُزَكِّيهِمْ" کی جلوہ ریزی فرماتے تھے۔

پھر ان کے بعد ان کے فیض و برکات کے جو حامل ہوئے جنکی نشاندہی چنداں ضروری نہیں کہ "سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ" ان سے دنیا کو جو فیض پہنچا اور دین کی اشاعت و تبلیغ اور قلوب و نفوس کے تزکیہ و تصفیہ کا جو کام انجام پایا وہ بھی ظاہر و باطن کی اسی جامعیت کے آئینہ دار تھے۔ اور آئندہ بھی سنن الہیہ

کے مطابق دین کا فیض جن سے پھیلے گا۔ وہ وہی ہوں گے۔ جن کے اندر مدرسیت اور خانقاہیت کی دو سوتیں ایک چشمہ بنکر بہیں گی۔ "مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ" آنکھوں کا نور شب بیداری سے بڑھتا اور زبان کی تاثیر ذکر کی کثرت سے پھیلتی ہے۔ رات کے راہب ہی اسلام میں دن کے سپاہی ثابت ہوتے ہیں۔ سوانح و تراجم کا سیزدہ صد سالہ دفتر اس دعویٰ کا شاہد ہے۔ زبان کی روانی اور قلم کی جولانی دل کی تابانی کے بغیر سراب کے نمو سے زیادہ نہیں۔ خواہ وہ اسوقت کتنا ہی تابناک نظر آتا ہو۔ مگر وہ مستقل اور مستقبل وجود سے محروم ہے"

(مقدمہ سوانح مولانا محمد الیاس)

ایک مستفسر کو اسی بارے میں ارقام فرماتے ہیں۔

" اس تقریر کو ایک اور نہج سے ذہن نشین کرتا ہوں۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک میں دو صفتیں تھیں۔ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ، (یعنی آپ لوگوں کو کتاب الٰہی اور سنت نبویؐ کی تعلیم دیتے ہیں) وَيُزَكِّيهِمْ (یعنی آپ لوگوں کو عملاً بھی پاک وصاف بنا دیتے ہیں، ان کے رذائل کو دور کر کے ان کو فضائل سے آراستہ کرتے ہیں) ذاتِ پاک میں یہ دونوں صفتیں یکجا تھیں۔ صحابہ میں بھی عموماً یہ دونوں صفتیں یکجا رہیں۔ تابعین میں کچھ کمی رہی، تاہم ان میں بھی خاصی یکجا رہی تبع تابعین میں آکر یہ یکجائی ایک محدود حلقہ میں رہ گئی۔ اس کے بعد سے یہ یکجائی صرف اشخاص میں ہونے لگی ورنہ عام طور پہ حال یہ ہو گیا

کہ یُعلّمھُم یعنی زبانی تعلیم کی صفت تو علماء اور فقہانے اختیار کرلی اور یُزکیھم یعنی تزکیہ کو صوفیا نے اپنا کام بنالیا۔ پہلی چیز مدرسہ میں چلی گئی، اور دوسری خانقاہوں میں، مگر ہر دور میں بحمد اللہ تعالیٰ ایسے کاملین ضرور ہوتے رہے۔ جو ان دونوں صفتوں کے جامع اور حامل تھے۔ اور وہی درحقیقت وارثِ نبوت تھے، مثلاً ہندوستان میں شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان ان دونوں کا جامع تھا۔ ان کے جانشینوں میں بھی یہی جامعیت تھی۔

آج کل یہ ہوگیا ہے کہ "یُعلّمھُم" یعنی تعلیم نبوی کی خدمت علماء کا شغل ہے۔ اور "یُزکّیھِم" یعنی تزکیہ کا شغل صوفیہ کا ہے لیکن حق یہ ہے کہ یہ دونوں صفتیں یکجا ہوں۔

محدثین میں بھی صوفیہ گذرے ہیں امام ابن حنبلؒ، عبد اللہ ابن مبارکؒ امام بخاریؒ و مسلمؒ و ترمذیؒ سب ہی صوفی حقیقی تھے۔ اور اصطلاحاً محدثین میں امام قشیریؒ صاحب رسالہ قشیریہ، ابو نعیمؒ اصفہانی صاحب حلیۃ الاولیاء حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ طریق قادریہ کے بانی حنبلی المشرب اور ٹھیٹھ محدّث تھے۔ اون کی کتاب غنیۃ الطالبین چھپی ہوئی ہے اور آپ پڑھ سکتے ہیں۔ حافظ ابن قیمؒ کی صوفیت پر ان کی کتاب مدارج السالکین فی شرح منازل السائرین گواہ ہے۔ اسی طرح حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ ہیں۔ ان کے مکتوبات کا مطالعہ آپ کر سکتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے اخلافِ صدق محدثینِ دہلی بھی صوفی ہیں۔

اور ان کی تصانیف موجود ہیں۔ مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق سلوک کو صراط مستقیم نام کتاب میں مرتب کیا ہے جو طبع ہوکر بار بار شائع ہوئی ہے۔ اس کو بھی آپ پڑھ سکتے ہیں۔"

خطبہ راندیر کے آخر میں ارشاد فرماتے ہیں۔

" ہمارے زمانہ میں ہمارے مدارس میں دوسری سب سے بڑی کمی یہ ہوگئی ہے کہ ہمارے سلف صالحین کی مجالس اگر 'یعلمہم' اور 'یزکیہم' یعنی تعلیم و تزکیہ دونوں نبوی طریقوں کی جامع تھیں۔ تو اب یہ صرف "یعلمہم" تعلیم کا مظہر رہ گئے۔ اور "یزکیہم" کا نور ہماری درسگاہوں سے مٹتا جارہا ہے۔ اب نبوی طریق مدرسہ اور خانقاہ میں بٹ گیا ہے۔ مدرسہ تزکیہ کے نور سے اور خانقاہیں تعلیم کی روشنی سے خالی ہیں۔ بڑی ضرورت ہے کہ ان دونوں خصوصیتوں کو پھر ایک چہار دیواری میں جمع کیا جائے۔ اس کے بغیر یہ عربی مدرسے مذہبی مدرسے نہیں کہے جاسکتے۔ اور نہ ان کے فارغین کے ذریعہ سے مسلمانوں کی ہدایت کا کام پورا ہوسکتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ نصاب تعلیم میں بھی اس پہلو پر زور دیا جائے۔ اور تربیت میں اس پر سختی سے عمل کیا جائے۔ اور ایسے مدرسین کا انتخاب کیا جائے جو علم و عمل دونوں کے جامع ہوں۔ اور خصوصیت کے ساتھ اہل دل کی صحبتوں اور کتابوں کے مطالعہ کا شوق ان کے دل میں

پیدا کیا جائے۔"

تزکیہ و تعلیم اور ظاہر و باطن کی اسی یکجائی کی تلقین حضرت والا قدس سرہ کی مجالس میں بھی ملتی تھی۔ فقیر کی موجودگی میں ایک مولوی صاحب سے جو سلوک و تصوف کے قائل نہ تھے۔ حضرت والا نے ارشاد فرمایا :۔

" علوم دو طرح کے ہیں ظاہری و باطنی، دونوں قرآن و حدیث سے ثابت ہیں۔ ظاہری و باطنی علوم کا یہ مطلب نہیں کہ ظاہری علم کے بتانے والے اور ہوں اور باطنی کے دوسرے۔ بلکہ اسکی مثال یہ ہے۔ ایک شخص نماز نہیں پڑھتا۔ اسے بتایا جائے، کہ نماز فرض ہے۔ یہ ظاہری علم ہے، باطنی وہ ہے جو اعمال قلب سے متعلق ہے جیسے ریا، کبر، حب جاہ وغیرہ قلب کے امراض ہیں۔ امراض قلب کو امراض باطنی کہتے ہیں اور جو علوم امراض باطنی سے متعلق ہیں انہیں علوم باطنی کہتے ہیں بغض، ریا، کینہ وغیرہ بری چیزیں ہیں ان کا علاج کیونکر کیا جائے، حدیث میں ہے "اِنَّ الحسد یاکل الحسنات" اسی طرح ایک شخص نماز پڑھتا ہے۔ دیکھا جائے، نماز میں اس کی روح بھی ہے یا نہیں۔ بتایا جائے خشوع کیونکر حاصل ہو، جس طرح علم ظاہری ضروری ہے۔ اسی طرح علم باطنی بھی ضروری ہے اور نصوص سے ثابت۔"

یہ بات معلوم ہو چکی۔ کہ حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ دعوت و ارشاد کے دو گونہ پہلو تھے۔

(۱) تلاوتِ کتاب و تعلیمِ کتاب و حکمت (۲) اور تزکیہ (و فیض صحبت)

تعلیماتِ نبوی کے ظاہری علوم جس طرح امت کے پاس کتاب و سنت کی ظاہری تشکل

میں پہنچے اور محفوظ ہیں، اسی طرح تزکیہ، اصلاح نفوس، تطہیر قلوب کی نبوی میراث اور کتاب و سنت کی عملی تشکیل یعنی اسوہ نبویہؐ کا ظاہری و باطنی پہلو صحبت نبویؐ کے سلسلہ ناب اور فیوض برکات نبوی کے باطنی تسلسل کے ذریعہ نسلاً بعد نسلٍ اور قرناً بعد قرن منتقل ہوتا رہا۔ خیر القرون میں جماعت نے جماعت سے فیض پایا۔ اور اس عہدِ سعادت کے بعد جماعتی نظم کے اضمحلال اور بیرونی فتن کے پھیل جانے کی بنا پر "میراثِ نبوتؐ" جماعت کی بجائے افراد یں "اصحاب کاملین" کے ذریعے منتقل ہونے لگی۔ اور بحمد اللہ تعالیٰ ہر دور میں ظاہر و باطن کی جامع، تعلیم و تزکیہ کی دوگونہ صفاتِ نبوی کی حامل شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں۔ اور حکمت تشریعی کے مطابق، اور ختم نبوت کی برکت سے انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک ایسے کامل و جامع الصفات افراد پیدا ہوتے رہیں گے۔ جو نبوی کوثر و سلسبیل کے ان الٰہی چشموں سے انسانیت کے ظاہر و باطن کو پاک و صاف کرتے رہیں گے۔ اور یہی افراد وراثتِ نبوت کے صحیح وارث اور نائبین نبوت ہوں گے جن کے ذریعے مخلوق کی ہدایت وارشاد کا کام لیا جائے گا۔

حضرت سید الملۃ قدس سرہٗ خود اسی جامعیتِ کبریٰ کی مثال اور ظاہر و باطن کی اسی یکجائی اور جامعیت کے داعی تھے۔ اس لئے "سلوک سلیمانی" کا تابندہ گوہر تعلیم و تزکیہ اور ظاہر و باطن کی یگانگت و عینیت ہے۔

نبوی منہاجِ تربیت و تزکیہ اور سلسلہ صحبت کا اصطلاحی نام طریقت، مشیخت، ارادت یا سلوک و تصوّف ہے

سیّدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہدایت ربّانی کی تقسیم کا جامع اور مستقل سبب و ذریعہ تھی۔ اگر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان حکمتِ سرمدی کے موتی بکھیرتی اور آیات الٰہی کی تلاوت فرماتی تھی، اور تعلیم و تبیین احکام و سنت کا فریضہ انجام دیتی تھی، تو اس کے سینۂ مطہر کا فیضان و نور کفر و ضلالت کی ظلمتوں کو کافور کرتا تھا۔ اگر اسکے اعمال قابلِ اتباع اسوۂ مبارکہ تھا۔ تو اسکی صحبت کبریت احمر اور اکسیرِ اعظم تھی۔ جو حق کے متلاشیوں کو زر خالص بلکہ سنگ پارس و کیمیا بنا دیتی تھی، بقول شخصے ؎

دُرفشانی نے تیری قطروں کو دریا کردیا — دل کو روشن کردیا آنکھوں کو بینا کردیا
جو نہ تھے خود راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے — کیا نظر تھی جسنے مردوں کو مسیحا کردیا

آپ کے قلب اقدس کا فیضان قلبی کدورتوں کو دھوتا، نفوس کو رذائل سے پاک کرتا، انہیں سنوارتا، نکھارتا، روشن و تاباں اور نسبت حق کی قبولیت کے قابل بناتا تھا۔ اگر ایک طرف آپ کی تعلیم و دعوت، تلقین و موعظت صحابہؓ کرام کو گمراہی

سے بچایا کہ ہدایتِ ربانی سے فیضیاب کرتی تھی تو دوسری طرف آپ کا فیضِ صحبت، تاثیر قلبی اور روحانی اثر انکی باطنی اصلاح و تربیت کا قوی سبب تھا۔

حضرت سید الملۃ قدس اللہ سرہٗ تحریر فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ہادی اور رہنما فرمایا ہے، یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات مجسم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کیلئے خاص ہو جاتی ہے۔ ان کی بعثت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی فرمائیں۔ اور انہیں ضلالت و گمراہی سے بچائیں۔ جس امت میں مبعوث ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے ہدایت و رہنمائی کے دو چراغ ہوتے ہیں۔ ان دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے..... ایک تو آیات الٰہی جو ان کو سنائی جاتی تھیں اور دوسرے خود رسولؐ کا مستقل وجود، جو اپنی تعلیم، تلقین، فیضِ صحبت اور اثر سے انہیں بہکنے نہ دیتا، اور ضلالت سے مانع آتا تھا..... (اور) اللہ کی کتابِ صامت (قرآن) اسکی کتابِ ناطق (رسولؐ) سے مل کر اپنے فریضہ کو انجام دیتی رہی)

تزکیہ | انبیاء علیہم السلام کا عموماً اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصاً ایک اور امتیازی وصف تزکیہ ہے۔ تزکیہ کے معنی پاک و صاف کرنے کے ہیں۔ نبوتِ محمدیہ کے اس وصف کا ذکر ان آیتوں میں ہے جن میں آپ کی یہ توصیف کی گئی ہے "ایک رسولؐ جو لوگوں پر خدا کی آیتیں تلاوت کرتا ہے۔ اور ان کو کتاب و حکمت کی دعوت دیتا ہے۔ اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے۔" ظاہر ہے کہ آپکا یہ تیسرا وصف دو پہلے اوصاف سے الگ ہے۔ یہ پاک صاف کرنا آیاتِ الٰہی کی تلاوت اور کتاب و حکمت کی تعلیم کے بعد نبی کی عملی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ آپکی تعلیم و تربیت و فیضان صحبت

حسن اخلاق، پند وموعظت اور تبلیغ ودعوت کی تاثیر سے بُرے اچھے، بدنیک اور اشرار اخیار بن جاتے ہیں .... یہ وصفِ تزکیہ وحی والہام کے علاوہ ان کے جسم وجان اور زبان ودل کی کیمیا اثری کا نام ہے۔ خواہ ان کی زبان اسوقت وحیٔ الٰہی سے مترنم ہو یا خاموش، ہر آن آفتابِ حق کی کرنیں مطلعِ نبوت سے نکل نکل کر دلوں کی سرزمین کو روشن کرتی رہتی تھیں۔

اس لئے نبوت کا سینہ صدق وصفا کا آئینہ ہوتا ہے۔ نبی کا جسم پیکر ظلمت کدۂ عالم کا چراغ اور علم وہدایت کا مطلع النور ہوتا ہے۔ جس سے اندھے دیکھتے، گمراہ راہ پاتے ، اور حق کے طالب روشنی حاصل کرتے ہیں۔ خود آپ کو مخاطب فرمایا گیا :-

يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا۔	اے نبیؐ! ہم نے تجھ کو بتانے والا، خوشی سنانے والا، چوکنا کرنے والا، خدا کی طرف اسکے حکم سے بلانے والا اور روشن کرنیوالا چراغ بناکر بھیجا ہے۔
(احزاب - ٦)	

یہ آس پاس کی چیزوں کو روشن کرنے والا چراغ خود رسولؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات ہے .... اور جب آپکی ذات مبارک کی یہ تمام چیزیں —— (جسم وجان، زبان ودل، خلق وعمل، علم وفہم) انوار الٰہی ہیں۔ تو ان انوار میں سے ہر نور کی روشنی میں چلنا ہدایت ہے۔ اور ان میں سے کسی سے قطع نظر کرنا بھی ظلمت کے ایک گوشہ میں قدم دھرنا ہے (سیرت النبی ص ج ۴ ١٨٦ تا ١٨٩ ملخصًا)

نبوت کے "سراج منیر" حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی صفت کا اثر و نتیجہ تھا۔ کہ جو شخص آپکی الٰہی دعوت پر لبیک کہتا ہوا، آپ کی خدمت میں جا پہنچتا تھا۔ سینہ اقدس کی تجلیات و انوار اسے سراپا نور بنا دیتے تھے۔ جو ذرہ بھی طالب بن کر اس مہر جہانتاب کے مقابل ہوا وہ شعلۂ طور تھا۔ چنانچہ صحابہ کرام رض کا پاکیزہ گروہ جب اپنی خداداد استعدادوں اور صلاحیتوں کے ساتھ اس "الٰہی چراغ" کی صحبت میں پہنچا تو ان کا ہر فرد خود مطلع انوار اور پوری بزم چراغاں تھی۔ ہر صحابی اپنی اپنی استعداد و صلاحیت کے بقدر ہدایت الٰہی اور نور ربانی کا جگمگاتا ہوا ستارہ بن کر چمکا۔ جو "مشکوٰۃ نبوت" اور "سراج رسالت" کے انوار کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔ " اصحابی کالنجوم فبایھم اقتدیتم اھتدیتم " (میرے صحابہ ستاروں کے مثل ہیں۔ ان میں سے جسکی بھی پیروی کرو گے ہدایت پالو گے۔ مشکوٰۃ ص۵۵۴) اسی حقیقت کا نبوی اظہار و اعلان ہے۔ جس طرح چراغ سے چراغ روشن ہوتا ہے۔ ہدایت ربانی کے قدسی چراغ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صحابہ کے قلوب منور و روشن ہو گئے۔ ان کی روحیں تجلیات نبوت ﷺ سے وادی ایمن تھیں اور دل رشک سینا، انوار الٰہیہ کی جو قندیل سینہ نبوت ﷺ میں فروزاں تھی۔ اس سے یہ قدسی الصفات ہستیاں یوں چمکیں۔ کہ ہر صحابی رض عالم کیلئے چراغ طور اور ستارۂ ہدایت تھا، اس طرح صحابہ کرام رض کا وہ پاک گروہ وجود میں آیا جو انبیاء علیہم السلام کے بعد انسانیت کا سر امتیاز، معرفت و عرفان کا اوج کمال، اور تقویٰ و نزاہت کا معراج تام تھا۔ ان کے چہرے تقویٰ کے نور سے چمکتے اور ان کے قلوب انوار الٰہیہ سے جگمگاتے تھے۔

سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۔

ان کا ظاہر اعمال و اخلاقِ نبوتؐ کا امین اور ان کا باطن فیضان و برکاتِ رسالت کا حامل تھا، کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح احکام الٰہی کے سب سے بڑے عالم، علوم ربانی کے مُعلم اور اوامرِ خداوندی کے نافذ کرنے والے تھے اسی طرح آپ کا سینہ مبارک اور قلب مطہر خزینۂ ہدایت کا سب سے بڑا حامل، توحید و معرفت کے "نور امانت" کا سب سے بڑا گنجینہ اور "قاسم" تھا۔ صحبت نبویؐ میں آرائشِ ظاہر کے سامان کے ساتھ جمالِ باطن بھی ملتا تھا۔ بقول حضرت سید الملۃ قدّس سرّہٗ :-

"اسلام کے معلم کی نسبت صرف یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے فیض واثر سے پاک وصاف و مصفیٰ بھی بنادیتا ہے۔ وہ ناقصوں کو کامل، گنہگاروں کو نیک، اندھوں کو بینا، اور تاریک دلوں کو روشن دل بنا دیتا ہے۔ (سیرت النبی علیہ السلام ششم صـ۳۸۶، صـ۳۸۷)

کہ حکمت الٰہیہ جن مبارک ہستیوں کو اِس عالم میں اپنی ہدایت کی فیضان رسانی کیلئے چنتی ہے ان کے "قلوب" کو بھی فیضانِ ہدایت کا سبب و ذریعہ بنادیتی ہے "قلوب" کے آئینے جب ایک دوسرے کے مقابل ہوتے ہیں تو "مزکی قلوب"، "کثیف قلوب" کو مصفیٰ و مجلّٰی بناکر انوار الٰہیہ کے قبول کرنے، اور تخم ہدایت (جو یوم ازل میں جذر قلوب[1] میں بکھیر دیا گیا تھا) کے بار آور ہونے کے قابل بنادیتے ہیں

---

[1] حدیث میں ہے۔ ان الامانۃ نزلت فی جذر قلوب الرجال ۔

قلوب، قلوب، سے رنگ پکڑتے ہیں۔ اور روحیں روحوں سے متاثر ہوتی ہیں دل کی تاثیر سے دل زندہ ہوجاتے ہیں۔ اور روحوں کی نورانیت ارواح کو روشن کردیتی ہے۔ جس طرح نبیؑ ظاہری علوم و معاملات میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا خلیفہ اور پیام رسان ہوتا ہے۔ احکام الٰہی کا اجراء اس کی ذات سے اور علوم حقہ کا اعلان اس کی زبان سے کرایا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کا قلب مُزکّیٰ ہدایت الٰہی کے فیضان کا ذریعہ ہوتا ہے۔ جسکی پیہم ضیاپاشیاں اپنے ہم صحبت طالبین کے قلوب کو سنوارتی، نکھارتی اور پاک بنا دیتی ہیں۔ چنانچہ "ربانیین" کی جو جماعت سید عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تعلیم و فیض صحبت سے وجود میں آئی۔ وہ آپ کے ظاہری کمال و باطنی جمال کی دوگونہ حسن کا مرقع اور آپ کی جامعیت کبریٰ کا نمونہ تھی۔ صحابہ کرام کے قبائے تقویٰ کا امتیاز خصوصی صرف نبوتؐ کا اتباع ظاہر میں نہ تھا۔ بلکہ متابعت ظاہری کی دلکشی کے ساتھ فیض نبوت سے ان کے دل روشن، روحیں منور اور نفوس تابندہ تھے۔ ان کے ظاہری اعمال و باطنی احوال منہاج نبوت کے مطابق تھے۔ اور ان کے اخلاق و معاملات عادات و شمائل اتباعِ سنن نبوی سے رنگین تھے۔ ان کی کیفیاتِ قلبی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مطہر کے انوار کا پرتو و عکس لئے ہوئے تھے۔ وہ قلباً اور قالباً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبتِ تامہ اور اپنے علم و عمل، فکر و نظر اور ذوق و حال میں آپ سے خاص مناسبت رکھتے تھے۔

سلسلہ صحبت صحابہ کرام کے ان جملہ کمالات کا سبب حضرت

سید الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وصحبہٖ وسلم کی 'صحبت رمعیت' تھی۔ 'صحابیت' کا امتیاز ہی یہ ہے۔ کہ صحابہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی 'صحبت پاک' وشخصیتِ گرامی سے بے واسطہ فیضیاب ہوئے ہیں 'معیت نبوت' 'وصحبتِ رسالت' نے ان میں ظاہر وباطن کی جامعیت پیدا کردی اور ایمان وتقویٰ کے ذروۂ کمال تک پہنچا دیا۔ اور ہر صحابی کو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ کاملہ کا اپنی اپنی استعداد وظرف کے بقدر نمونہ اور مثنیٰ بنا دیا۔ جن کا ایمان وتقویٰ، اعمال واخلاق حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی سے مستفاد اور جن کا ظاہر وباطن آپ کے فیوض وکمالات، برکات وانوار سے مکمل ومستنیر تھا۔ گویا صفاتِ ربانی کے مظہرِ اتم اور مستورازل کے آخری و اکمل نقاب کشا وحبیب باصفا صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ ظاہر وباطن نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے صحابہ کرام کو قلباً وقالباً الٰہی رنگ میں رنگین بنا کر اپنے یعنی (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے) ظاہری وباطنی اتباع کامل سے منور بنا دیا تھا۔ صحبت کی تاثیر، معیتِ نبوت کے اثر، اور تعلیم وتربیتِ رسالت کی برکت نے صحابہ کو اس قابل بنا دیا۔ کہ خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین کی حیثیت سے تعلیم وتزکیہ کے نبوی فرائض انجام دے سکیں۔ اور آپ سے اخذ کردہ ظاہری وباطنی علوم کو دوسروں کی طرف منتقل کر سکیں۔ اور اپنے فیضِ صحبت، تاثیر قلب، اور فیضان باطن سے دوسروں میں میراث نبوت تقسیم کر سکیں اور اپنے مستفیدین کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر وباطن والے اعمال سے بتوفیق الٰہی مشرف فرما سکیں، اور خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی ذات سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانیت کی دائمی صلاح و فلاح کیلئے جو ہدایات و فیضان ربّانی کا سلسلہ جاری فرمایا ہے۔ اس سلسلہ الذہب کی سب سے مضبوط اور درخشاں کڑی بنا سکیں۔ اور ان کے واسطے سے ہدایتِ نبویؐ تابعین میں منتقل ہوا اور پھر تابعین سے تبع تابعین فیض ہدایت کی امانت کو سنبھالیں اور اسی طرح نسلاً بعد نسلٍ ہدایت ربّانی کا یہ چشمہ "اصحابِ کاملین" کے ذریعے قیامت تک جاری رہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی حجّت بندوں پر پوری ہو اور خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری و باطنی فیوض و کمالات سے سعید ہستیاں تاقیامِ قیامت فیضیاب ہوتی رہیں۔ کہ "ختم نبوت" کے مفہوم میں یہ حقیقت بھی منطوی ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت کی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفاتِ تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ کا اجرا و فیض بھی قیامت تک قائم و دائم رہے گا۔ اور ہر دور میں وراثت نبوت کی جامع "قدوسیوں" کی ایک جماعت نیابت نبوت کے فریضہ کو ادا کرتی رہے گی۔ ارشاد رسالتؐ :-

لا یزال من امتی اُمّۃ قائمۃ بامر اللّٰہ لا یضرہم من خذلھم ولا من خالفھم حتّٰی یاتی امر اللّٰہ وھم علی ذلك۔	ہمیشہ میری اُمت کا ایک طبقہ اللہ کی امر دین پر قائم رہے گا۔ ان کی عدم مدد و مخالفت انہیں نقصان نہیں پہنچائے گی۔ قیامت تک یہ طبقہ اسی طرح امر الٰہی پر قائم (اور اس کی ذمہ داریوں کو پورا کرتا) رہے گا۔

(مشکوٰۃ صفحہ ۵۸۳ بحوالہ بخاری و مسلم)

کا مژدہ اسی حقیقت کی نبوی خبر ہے۔ گذشتہ تاریخ ملت کے اوراق اس دعویٰ پر شاہد عدل ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک سنت الٰہیہ فیضان نبوت کے اس سلسلہ کو جاری رکھے گی۔ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ۔

سیدی حضرتِ والا نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں:۔

" قرن اول میں جماعت سے جماعت متاثر ہوتی تھی۔ پھر جب اسلامی معاشرے میں اضمحلال آیا۔ تو جماعت کی بجائے 'افراد کاملین' پیدا ہونے لگے اور افراد سے افراد متاثر ہونے لگے ...... دنیا ابھی خالی نہیں ہوئی۔ ہمارے آپ کے دل خالی ہو جائیں۔ لیکن ابھی اللہ تعالیٰ کے بندے موجود ہیں۔ جیسے چراغ کو چراغ جلاتا ہے، اسی طرح جن کے دل (گناہوں سے) میلے ہو چکے ہیں۔ پھر ان کو روشن قلوب سے ملا دیں۔ وہ صاف اور روشن ہو جائیں گے قرآن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو 'سِرَاجًا مُّنِیْرًا' کہا گیا ہے۔ اب تک جو صلحاء موجود ہیں ان کے دل اسی چراغ (سراجاً منیرا) سے روشن ہوئے ہیں۔ 'شجرہ' میں ان چراغ جلے ہوؤں کے نام یکجا ہیں۔ جیسے محدثین اپنی سندیں ملاتے ہیں۔ اسی طرح یہ چراغ جلے ہوئے اپنا سلسلہ شجرہ میں ملاتے ہیں۔"

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا۔

" زمین و آسمان کی روشنی تو اللہ تعالیٰ ہیں۔ " اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ " اللہ تعالیٰ کو چھوڑ دیا جائے تو نور کہاں رہ جاتا ہے۔ ظلمت ہی ظلمت رہ جاتی ہے یہ چیز پروپیگنڈہ سے ہاتھ نہیں آتی، زندہ دل بزرگوں کی صحبت اختیار کیجئے۔ جیسے دیئے سے دیا روشن ہو جاتا ہے۔ صحبت سے دل روشن ہو جاتے ہیں۔"

اندھیرا ہے عالم میں چھایا ہُوا چراغِ جہاں قلبِ آگاہ ہے

صحراؤں میں رکھے ہوتے چراغوں میں تو حرکت نہیں۔ اپنے اندر انوار پیدا کیجئے
دنیا ابھی خالی نہیں ہوئی۔ ہمارے آپ کے دل خالی ہو جائیں ۔ لیکن ابھی
اللہ کے بندے موجود ہیں۔

حضرت الشیخ قدس سرہٗ نے ایک مستفسر کے جواب میں تعلیم و تزکیہ کی یکجائی اور صحبتِ نبوت و فیضانِ ہدایت کے الٰہی سلسلہ کی اہمیت ذہن نشین کراتے ہوئے ارقام فرمایا تھا :-

" یہ فن (سلوک) نظری سے زیادہ عملی ہے۔ اس کیلئے ایسے کاملین کی ضرورت ہے جو اپنے حسن اعتقاد اور عمل کے لحاظ سے اسوۂ نبوی ہوں۔ جو اپنے آداب ، اخلاق ، عادات اور اتباعِ اوامر و نواہی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ ہوں۔ جن کی صحبت میں پرتو نبوی کا اثر ہو ، اور جن کا سلسلہ صحبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت تک منتھی ہو ، جس کا اصطلاحی نام شجرہ ہے۔ جس طرح فن روایت میں اس کا نام سلسلہ ہے۔ اِس مفہوم کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔ کہ علم حدیث جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت کا سلسلہ ہے۔ یہ سلوک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا سلسلہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سارا فیض صحبت نبوت کی تاثیر کا نتیجہ تھا۔ ان کے بعد صحابہ کے فیض سے تابعین اُٹھے ، اور تابعین کے فیضِ صحبت سے تبع تابعین کا ظہور ہُوا۔ یہ تین دور ایسے ہیں

جن میں پچھلی جماعت اگلی جماعت سے بحیثیت جماعت کے متاثر ہے مگر ہر دور میں جماعت کم و کیف یعنی تعداد اور حالت میں کم ہوتی چلی گئی۔ تبع تابعین کے بعد جب فتنوں کا ظہور ہوا۔ تو تعداد بھی کم ہو گئی اب جماعت کی صحبت جماعت سے جاتی رہی۔ اب اشخاص کاملین کی صحبت سے اشخاصِ با استعداد کے پیدا ہونے کا سلسلہ ہوا۔ جس کا نام متأخرین نے ارادت یا پیری و مریدی رکھ دیا ہے۔ ورنہ قدماء اور سلف صالحین کی اصطلاح صحبت ہی کی تھی۔ مرید کو صاحب یعنی صحبت یافتہ کہتے تھے۔ جیسا امام محمدؒ اور قاضی ابو یوسفؒ کو صاحبِ امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں۔ اسی طرح حضرت شبلیؒ و جنید کے مرید بھی صحبت یافتہ کہلاتے تھے۔ جیسے یوں کہتے تھے۔ کہ فلاں شخص نے شبلی کی صحبت اٹھائی ہے یا جنید کی صحبت اٹھائی ہے۔"

قرآن کریم نے بھی خلیفہ اول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے 'صاحب' کے لفظ سے یاد فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبہ-۶)

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ آپ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد اس وقت کر چکا ہے۔ جب کہ آپ کو کافروں نے جلاوطن کر دیا تھا۔ جب کے دو آدمیوں میں سے ایک آپ تھے۔ جس وقت کہ دونوں غار میں تھے

جب کہ آپ اپنے ہمراہی (صاحب) سے فرما رہے تھے کہ تم دکھ! غم نہ کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ہمراہ ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی انہیں "صاحبی" فرمایا ہے۔

چنانچہ جامع ترمذی (ابواب المناقب) میں ہے۔

لو کنت متخذا خلیلا	اگر میں اپنی امت میں کسی کو اپنا
لاتخذت ابا بکر ولکن	خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا لیکن
اخی وصاحبی۔	وہ میرا بھائی اور صاحب ہے

بلکہ اپنے جملہ ساتھیوں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "اصحابی" کہہ کر پکارا ہے۔ جیساکہ صحاح کی روایاتِ متواترہ شاہد ہیں۔ اور یہ "صحابہ" اور "اصحاب" کا لفظ خود "صحبت نبوت" کی اہمیت وتحقق پر دال ہے۔

صحبت ومعیت کے ثمرات ہی صحابہ کے فضائل وکمالات تھے۔ چنانچہ "معیتِ نبوتؐ" کے حاملین (صحابہ کرام) (وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ) کا تذکرہ قرآن ان دلستان الفاظ میں کرتا ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ (الفتح ۔ ۴)

ترجمہ:۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ آپکی صحبت یافتہ ساتھی ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں تیز ہیں۔ اور آپس میں مہربان

ہیں۔ ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ کے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔

معلوم ہوا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت وصحبت نے جلال وجمال الٰہی کی صفات کا عکس وظلال (شدت علی الکفار، رحم علی المومنین) محبت وعبادات الٰہی کا شغف وکمال اور طلب رضا وفضل کا اشتیاق صحابہ میں پیدا فرما دیا تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے ارواحِ شیخین رضی اللہ عنہما کے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک سے متأثر ورنگین ہونے کے بارے میں کیا خوب شعر نقل کئے ہیں۔

رق الزجاج ورقت الخمر   فتشابها وتشاكل الامرُ

فكأنّما خمرٌ ولا قدحٌ   وكأنها قدحٌ ولا خمرُ

(تفہیمات الٰہیہ ص۲۴۴، ص۲۴۵، ج ۱)

یہ سب صحبت نبوت کا ثمرہ تھا۔

امام قشیریؒ "صحابیت" کی فضیلت کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد (شرف وفضیلت کے اظہار کے لئے) صحابہ کے سوا اور کوئی لقب ایجاد نہیں ہوا کہ شرف صحبت سے بڑھ کر کوئی شرف نہیں ہوسکتا۔"

علامہ ابونصر الطوسی کتاب اللمع میں لکھتے ہیں

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کو وہ عظمت وخصوصیت حاصل ہے۔ کہ جس شخص کو یہ عزت حاصل ہوگئی۔ اُس کو کوئی دوسرا خطاب

جو اس سے بھی معزز ہو، نہیں دیا جا سکتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ زہّاد، عباد، متوکلین، فقرا، اہل رضا، اہل صبر، اہل تواضع واخبات کے امام ہیں۔ اور یہ سب کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے حاصل کیا ہے۔ تو جب ان بزرگوں کا انتساب صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے جو بزرگ ترین صفات سے ہے۔ تو یہ محال ہے۔ کہ اس بزرگ ترین صفت کے علاوہ ان کو کوئی دوسری فضیلت دی جائے۔ (کتاب اللمع ص۲۲)

غرض یہی صحبت، کی اہمیت ہے۔ جسکی بناپر طریقِ تقویٰ وسلوک کا مدار "صحبت" پر قائم ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے بھی "صادقین" کی معیت وصحبت کا امر فرمایا ہے۔ کہ "متقین" کی صحبت حصول وازدیادِ تقویٰ کا سب سے بڑا اور قوی سبب ہے۔ ارشاد ربّانی ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ	اے ایمان والو اللہ سے ڈرو۔ اور (ایمان وعمل کے) سچوں کے ساتھ رہو۔ (یعنی ان کی صحبت بغرض استفادہ اختیار کرو)

یہ "صادقین" ہی اصل "متقین ومحسنین" ہیں۔ اس لئے حصولِ تقویٰ واحسان اور تحسینِ اعمال واحوال کی جدوجہد میں ان کی معیت وصحبت اکسیر اعظم ہے۔

سورۂ زمر میں ہے :-

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ	اور جو سچائی لے کر آیا۔ اور اس کو سچ مانا، وہی لوگ ہیں تقویٰ والے

هُمُ الْمُتَّقُوْنَ لَهُمْ مَا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ جَزَآؤُا الْمُحْسِنِيْنَ (زمر:۴)

ان کیلئے ان کے رب کے پاس وہ ہے۔ جو وہ چاہیں یہی بدلہ ہے نیکو کاروں کا۔

حضرت الشیخ رحمۃ اللہ علیہ اِس آیت کی تشریح میں ارقام فرماتے ہیں۔

" یعنی تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ اور کام کے ہر پہلو میں سچائی لیکر آئے۔ اور اس ابدی سچائی کو سچ جانے، وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت اور جاہ و عزت کے نقطہ پر نہیں بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے۔ اور خواہ کسی قدر بظاہر اس کا نقصان ہو مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادہ سے نہیں ہٹنا چاہتا" (تبر نجم ثاقب ۱۹۰۴ء)

ایسے سچے (صادقین) متقیوں کی صحبت و معیت مسِ خام کو کندن اور گِل کو گُل بنا دیتی ہے۔ صحبت کی اسی تاثیر کے متعلق شیخ شیرازؒ نے کیا تمثیل دی ہے

گِلے خوشبوئے در حمام روزے | رسید از دستِ محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری | کہ از بوئے دلآویزِ تو مستم
بگفتا من گِلِ ناچیز بودم | ولیکن مدتے با گُل نشستم
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد | وگر نہ من ہماں خاکم کہ ہستم

انسان فطرۃً دوسرے کی صحبت سے متاثر ہوتا ہے۔ خصوصاً اہل اللہ کی صحبت تو سراپا شعلۂ طور ہے۔ جو ماسوا کے تعلقات کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ یہ سنتِ الٰہی، عادت ربانی اور حکمت تشریعی ہے کہ توحید و معرفت الٰہی کا جو بیج ازل میں انسانی قلوب کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس عالم ناسوت میں

اس کا پھٹنا، آبیاری، نشو ونما، اور بار آوری اہل حق کے فیض صحبت و توجہ سے ہوتی ہے۔ اور اس جوہر پاک کا احیاء و سنوار، ترقی و نکھار صاحب دل حضرات کی معیت و فیضان کا نتیجہ ہوتا ہے۔ گویہ فیض و توجہ مستفیض و مرید کی طلب و ارادہ کی شرط پر عادتاً منحصر ہے۔ گویا اللہ تبارک و تعالیٰ صاحب نسبت 'زندہ دل' اشخاص کے قلوب کو اپنی ہدایت و انوار و تجلیات کا عادی آلہ بناکر مستفیض کے دل پر اپنی صفات کا انعکاس اور اپنی نسبت عالیہ کا 'ورود' و 'القا' فرماتے ہیں۔ یہ نسبت باطنی مفیض و مستفیض (مراد و مرید) کی قوت نسبت و استعداد کے بقدر متفاوت ہوتی ہے۔ بہرحال کاملین کی صحبت حیات قلبی اور اصلاح باطنی کا سبب بن جاتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنا نور ہدایت اور فیضان صاحب دل شیخ کے ذریعہ طالبین کے دلوں میں منتقل فرما دیتا ہے۔ اور دلوں کے آئینے انوار الٰہیہ سے جگمگا اٹھتے ہیں ؎

نورِ معشوقِ ازل در دلم از یار افتاد
عکسِ خورشید ز آئینہ بدیوار افتاد

اور دلوں کی کھیتی شیخ کی آبیاری سے ہری ہو جاتی ہے بقول سید الملۃؒ ؎

تیرے اِک چھینٹے سے اے ابرِ بہاری ان دنوں
سبز ہے شاداب ہے سیراب ہے گلزار دل

جس طرح آتشی شیشے کی سوزش کے اثر سے کاغذ جل اٹھتا ہے یا چقماق کی رگڑ سے آگ پیدا ہو جاتی ہے۔ ان ربانی آئینوں (اہل دل کے قلوب) کے مقابل جو دل بھی شوق و طلب و عزیمت اصلاح و عمل لیکر آتا ہے۔ وہ نسبت الٰہی

سے منور و ایمان وتقویٰ کے نور سے مصفّٰی و متجلی ہوجاتا ہے بقول عارف رومیؒ ؎

ہیں کہ اسرافیلِ وقت اند اولیاؒ
مردہ را از ایشاں حیات است و نما
جانہائے مردہ اندر گور تن
بر جہد ز آوازِ شاں اندر کفن

اہل اللہ کے قلوب بھی خدا جانے کیسی قوت رکھتے ہیں جن کی ایک ہی نظر زندگی کو پلٹ دیتی ہے۔

اک نظر میں کچھ سے کچھ ہے میری دنیائے حواس
ہوش جو تھا بیہشی ہے بیہشی اب ہوش ہے (سید الملۃؒ)

بندہ حضرۃ الشیخ قدس سرہ کی خدمت میں ایک خادم نے عرض کی۔ "حضرت دردِ دل کس طرح حاصل ہو" فرمایا:۔

جو آج لذّت دردِ نہاں کا جویا ہے — وہ پہلے سوز سے دل کو تو داغدار کرے
ابھی تو مشق فغاں کنج میں ہزار کرے — اثر کے واسطے کچھ اور انتظار کرے

پھر ارشاد فرمایا۔ محبت نہ ہونے کی حسرت بھی بڑی نعمت ہے ؎

محبت تو اے دل بڑی بات ہے — یہ کیا کم ہے اس کی جو حسرت ملے
یہی زندگی جاودانی بنے — جو آبِ حیات محبت ملے
ترے عشق کے غم کی دولت ملے — تو سارے غموں سے فراغت ملے

اس کے بعد فرمایا۔" اس کی خواہش ہو تو اہل اللہ کی صحبت اختیار کرے

محبت خاصانِ خدا کے قلوب کا خاص نور ہے ...... صحبت سے یہ چیز شدہ شدہ آپ میں بھی آجائیگی"

ایک مرتبہ فقیر نے دار منزل کے غربتکدہ میں جو آج ہزاروں سینہ فگاروں[1] کا حریم شوق ہے۔ عرض کیا "حضرت والا، کیا کسی کا یہ کہنا صحیح ہے ع

نگاہ مستِ ساقی نے میری دنیا بدل ڈالی

فرمایا جی ہاں، صحیح ہے، میرا بھی ایک شعر ہے،۔

تیری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

پھر متبسم نگاہوں سے اپنے مجموعۂ غزلیات "غزل الغزلات سے ایک دوسرا شعر نکال کر پڑھنے کو دیا۔

تیری نظر میں ہے تاثیر مستی صہبا

تیری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے

یہ شعر پڑھ کر ساقی کی پر معنی نگاہیں فقیر کے چہرہ پر تھیں، اور اس کا دل تھا کہ اڑا جاتا تھا۔

شراب دیتے ہوئے اس پہ چشم ساقی تھی

سرور مے میں کہاں سب نشہ نگاہ میں ہے

مدہوشی و سکر کا یہ عالم شیخ کے اس ارشاد سے ہوش سے بدل گیا " آپ نے شعر پڑھ لیا"

---

[1] کیا عربی شاعر نے اسی وقت کیلئے کہا تھا

لاتدع الارواح والماء والبلاء من الدار الا مایشوق ویشغف

(ہواؤں، پانی اور دیگر حوادثات زمانہ نے محبوب کے گھر (الدار) کا کچھ حصہ نہ چھوڑا سوائے اس (نشان) کے جو شوق شغف کو بڑھا تا رہے)

عرض کیا، جی ہاں، اور سرور دل وجان کی رگ رگ میں سرایت کر گیا۔
صحبت کی یہی تاثیر و اثر پذیری ہے جس کی بنا پر عارفِ رومی نے کہا ہے ؎

صحبت نیکاں اگر یک ساعت است
بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است
یک زمانے صحبت با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
گر تو سنگ خارہ و مرمر شوی
چو بصاحب دل رسی گوہر شوی
مہر پاکاں درمیان جاں نشاں
دل مدہ الا بمہر دل خوشاں

گذشتہ مباحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "سلوک و تصوف، اور "سلسلۂ مشیخت و ارادت" حقیقت میں تربیت و تزکیہ نبوی اور صحبتِ رسالت کے سلسلۂ جاریہ ہی کا نام ہے۔ تربیت و اصلاحِ نفوس و قلوب کا یہ نبوی طریق نسلاً بعد نسلٍ صحبت کے ذریعہ پہلوں سے پچھلوں کی طرف منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ اور فطرتی تربیت کے مطابق سابق سے لاحق اور ایک سے دوسرا راہ پاتا رہا ہے کہ ؎

ہیچ کس از خود بخود چیزے نشد ہیچ آہن خنجر تیزے نشد
ہیچ حلوائی نشد استاد کار تا کہ شاگرد شکر ریزے نشد
مولوی ہرگز نشد مولائے روم تا غلام شمس تبریزے نشد (جامی)

اس بنا پر سلوک وطریق کی افادیت مسلّم اور اسکی ضرورت لابدی ہے۔ کہ اس کے مقاصد حسب درجات فرض یا سنت یا مستحب ہیں، اور اس کے ذرائع بعض منصوص اور بعض اجتہادی ہیں۔ اس لئے اس سے کلّی انکار کی عقلاً و شرعاً گنجائش نہیں، بلکہ اسکا اختیار وقبول علی القدر المراتب لازمی و ضروری ہے۔

سلوک فقہہ باطنی یا مستقل فن کی حیثیت میں

گذر چکا۔ کہ اسلام میں ظاہر و باطن کی کوئی تفریق نہیں۔ احکام ظاہری کی جان اعمالِ قلبی ہیں اور باطن کا نکھار و اصلاح ظاہری اعمال کی پابندی کے بغیر محض واہمہ خود فریبی اور حکمتِ تشریعی سے ناواقفیت ہے۔ دونوں لازم و ملزوم اور انسانی اصلاح کامل کے لاینفک اجزا ہیں۔ تعلیم کتاب و حکمت (ظاہری اصلاح) اور تزکیہ (باطنی تکمیل) ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں تاہم دور صحابہ کے بعد جس طرح نبوت کی ظاہری تعلیمات علوم القرآن (تفسیر وغیرہ) علوم حدیث اور علوم فقہ کی صورت میں مدون اور مرتب ہوئیں اور ان میں سے ہر علم فن بن گیا۔ جسکی اپنی اصطلاحیں ہیں اور گو یہ فن اور اسکی اصطلاحیں اس نام اور اس معنی میں عصر صحابہ میں موجود اور مستعمل نہ تھیں۔ لیکن ان کی اصل موجود تھی۔ اس لئے ضرورت اور حقیقت پسندی کی بنا پر امت کے مزاجِ سلیم نے ان علوم کو ہر دور میں قبول کیا۔ اور انہیں تعلیمات نبوی ہی کی تشریح تبیین اور وضاحت تسلیم کیا۔ اسی طرح تزکیہ قلب باطنی اصلاح اور صفائی نفس کے نبوی علمی و عملی سلسلہ نے بھی ایک فن کی صورت اختیار کر لی جس کی اپنی اصطلاحیں اور طرق ہیں۔ اور یہ فن اپنے اصول و فروع میں حقیقتاً

اسلامی شریعت اور دعوت وارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی ایک لابدی جزو اور ضروری حصہ ہے۔ جس کے ذریعہ تقدیر الٰہی تزکیہ اور صحبتِ نبوی کے فیضان کو جاری رکھے ہوئے ہے اور بقول حضرت بہدیؒ

"شرعی علوم ظاہرہ اور یہ فن باہم کسی صورت متضاد نہیں، بلکہ ثانی اول ہی کی اصلاح وتکمیل کا نام ہے۔"

اب اس فن کو اور اسکے ماہرین کو جس نام سے بھی پکارا جائے اس حقیقت سے اختلاف کی گنجائش نہیں کہ اصل فن ہدایت نبوی کے شجر طوبیٰ کی عظیم شاخ ہے جسمیں فنی ضرورت نے خاص اصطلاحات اور عملی مجبوریوں نے خاص مجاہدات کو ناگزیر کردیا ہے۔ لیکن یہ بات بے محابا اور وانشگاف الفاظ میں کہنی ضروری ہے۔ کہ حقیقی اور شرعی سلوک میں کسی غیر شرعی مجاہدہ اور ریاضت کی قطعاً گنجائش نہیں۔ فن کی حقیقت اور اصطلاحات کو سمجھے بغیر اس فن شریف کے متعلق رائے قائم کرلینا تقبیحِ ناشناس کی بدترین مثال ہے۔ اس بارے میں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی ضروری ہے۔ کہ یہ فن نظری سے زیادہ عملی ہے۔ اِس لئے اس کے سمجھنے کیلئے فن کی کتابوں کا مطالعہ ہی کافی نہیں۔ بلکہ کسی صاحبِ ماہرِ فن کی صحبت اور اس کے زیر ہدایت اس کی تعلیمات کی عملی مشق وممارست بھی لازمی ہے۔ جس طرح حضرات محدثینؒ اپنے فن میں کامل ہوتے ہیں۔ اور حدیث اور اس کے متعلقات، طرق ومشکلات علل ورجال اور دگر متعلقہ امور میں ان کی نظر اور فیصلہ ہی کو قابلِ اعتبار سمجھا جاتا ہے۔ یا جیسے حضراتِ مفسرین کرام قرآن کریم کے غوامض ومطالب، سیاق وسباق، شانِ نزول وناسخ ومنسوخ اور اصول تفسیر وقرآنی لغات وغیرہ کے متعلق سند کا

درجہ رکھتے ہیں۔ اور انکی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اور جس طرح ہر فن کے سمجھنے کا منصفانہ عقلی اور صحیح طریقہ ہی یہ ہے۔ کہ اس فن کے مستند ماہرین سے رجوع کیا جائے اور ان سے اس فن کی حقیقت سمجھی جائے کہ استفادہ اور تکمیل فن کا یہ طریق جملہ دنیوی اور اُخروی علوم میں جاری اور رائج ہے۔ اسی طرح عقل وفطرت سلیم کا اقتضا یہ ہے کہ تزکیہ اور علوم باطنی کی تحصیل کیلئے اس کے ماہرین سے استفادہ کیا جائے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ تزکیۂ باطن اور اصلاح نفس کا نبوی طریقہ ومنہاج جب ایک فن کی حیثیت اختیار کر چکا۔ اسے اب ہم تصوف وسلوک کے نام سے یاد کریں، یا فنِ حصولِ احسان وتقویٰ کے نام سے پکاریں۔ یا فن اخلاص کا اور طریقِ تقویٰ کا نام دیں۔ یہ حقیقت ہے۔ کہ صحبت نبوی کے فیوض وبرکات کے اجرا کا سلسلہ اور تزکیۂ باطنی کے فرائض ایک خاص فن کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں جن کی تحصیل وتکمیل اس فن کے آشناؤں اور ماہرین کی تعلیم وتربیت سے ہی ہو سکتی ہے۔ حضرت سید الملت قدس سرہٗ ایک مستفسر کو ارقام فرماتے ہیں:۔

"حضرات محدثین رحمہم اللہ پر بحیثیت محدث ہونے کے صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے حالات وکمالات کے جاننے اور دوسروں کو سنانے کا فرض عائد ہے۔ یعنی (بحیثیت ٹھیٹ محدث) ان کا یہ فرض نہیں کہ وہ بتائیں۔ کہ ان حالات وکمالات کی حقیقت کیا ہے۔ اور ان کے حصول کی تدابیر کیا ہیں۔ کیونکہ یہ بھی ایک فن ہو گیا ہے جس طرح فقہ اور کلام اور فرائض وتفسیر وحدیث ایک ایک مستقل فن ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کی اصطلاحیں ہیں۔ اس کی علمی و

نظری شکلات ہیں۔ جن کے سمجھانے کیلئے فقہا، مفسرین، محدثین اور متکلمین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح فنِ سلوک کیلئے سالکینِ کاملین کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اس فن کی عملی و علمی دقتوں کو رفع کریں۔

...... یہ رسمی بیعت جو ایک مدت سے رواج پذیر ہے۔ یہ محض رسم و عرف ہے۔ اور جس کا مقصد یہ ہے۔ کہ پیر و مرید کا باہمی معاہدہ ہے۔ کہ پیر اپنے علم کے مطابق تعلیم و تربیت اور خیر خواہی میں کمی نہ کرے گا۔ اور مرید اس کی تعمیل میں کوتاہی نہ کرے گا۔ اور اس کی اصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم عمل میں ہے۔ کہ آپ کبھی خاص خاص صحابہ سے اور کبھی حاضر مجلس صحابہ سے امور خیر پر بیعت لیتے تھے۔ تاکہ جن سے بیعت لیجائے۔ ان میں اس معاہدہ کی اہمیت ہو۔ اور وہ اس کی تعمیل میں پوری ہمت صرف کریں۔ اور ان کو یہ خیال رہے۔ کہ میں نے اس بات کا معاہدہ کیا ہے۔ اس کے خلاف کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہو۔ اور چونکہ جس کے ہاتھ پر یہ معاہدہ کیا جاتا ہے اس سے عقیدت اور محبت ہوتی ہے۔ اور یہی عقیدت و محبت اس کے ہاتھ پر معاہدہ کئے ہوئے امور کی تعمیل پر آمادہ کرتی رہتی ہے۔ یہی اس بیعت کا حاصل ہے۔ شیخ اپنے سلسلہ کے ارادتمندوں کو امور خیر کی تعلیم دیتا ہے۔ ان کے حقائق سے باخبر کرتا ہے۔ ان کی تعمیل کا طریقہ بتاتا ہے۔ اور سالک کے ذہنی اور عملی مشکلات کو حل کرتا رہتا ہے۔ مثلاً غرور بری چیز ہے۔ اب یہ امر کہ غرور کی حقیقت کیا ہے۔ اور غرور

کہتے کس کو ہیں۔ اور اس سے بچنے کی تدبیر کیا ہے۔ اور آیا ہمارا فلاں کام غرور کی حد میں داخل ہے کہ نہیں۔ اس کا جواب نہ خالص محدث دے سکتا ہے۔ نہ خشک فقیہ ان کو حل کر سکتا ہے۔ نہ مفسر بتا سکتا ہے اور نہ متکلم ان کی عقدہ کشائی کر سکتا ہے۔ اب ان سوالات کا جواب جو بھی دے سکتا ہے وہ شیخ طریقت ہے جو ممکن ہے کہ محدث بھی ہو، فقیہ بھی ہو، مفسر بھی ہو، یا نہ ہو، ہو تو بہتر ہے۔ نہ ہو تو حرج نہیں مگر متبع ضرور ہو۔ جس نے اپنے بزرگوں سے ان کو سیکھا۔ اور جانا ہے۔ یا اس نے خود کتاب و سنت سے ان امور کی واقفیت پیدا کی ہے اور عمل کر کے اس رتبہ پر پہنچا ہے کہ غرور و تکبر سے اپنی استعداد کے مطابق پاک و صاف ہو گیا۔ اور دوسروں کو بھی اپنی تعلیم و صحبت سے ایسا ہی بنا سکتا ہے۔"

صوفی اور تصوف کا لفظ: ہمارے اس بیان میں صوفیہ سے مراد رسمی صوفی نہیں۔ جو در حقیقت دکاندار ہیں۔ بلکہ وہ متبعینِ سنت مراد ہیں جنہوں نے علماً و عملاً اس راہ کا کمال حاصل کیا ہے اور منزل مقصود تک پہنچے ہیں۔ صوفی اور تصوف کے لفظ سے بھی، بعض لوگوں کو بھڑک ہوتی ہے، سو یہ اصطلاحی نام ہے جو لفظی بدعت ہے جس طرح تفسیر و مفسر، حدیث اور محدّث، فقہ اور فقیہ کی اصطلاحیں ان کے خاص جدید معنوں میں صحابہ کے عہد میں مروج نہ تھیں۔ یہ لفظ اس زمانہ میں اگرچہ بولے گئے ہیں اور یہ عربی زبان کے لفظ بھی ہیں۔ مگر ان کے اصطلاحی معنی ان سے مختلف ہیں۔ یہی حال

تصوف اور صوفی کا ہے۔ خواہ یہ لفظ صوف سے نکلا ہو، یعنی پشمینہ پوشی سے جو زہد کی علامت تھی۔ یا فلسفہ کے لفظ کی طرح یہ یونانی تھیاسوفی سے آیا ہو۔ لفظ کی بحث نہیں۔ تاہم یہ لفظ بے شبہہ بدعت ہے۔ یعنی بنا ہے۔ اور باہر سے آیا ہے۔ مگر اس کی حقیقت بدعت نہیں۔ قرآن پاک کی اصطلاح میں اس کو اخلاص کہیئے اور حدیث کی رو سے اس کو احسان کا نام دیجئے اور کام کے لحاظ سے اس کو اخلاص فی الدین اور تقویٰ کے حصول کا فن کہیئے۔ ولا مشاحۃ فی الاصطلاح

یہ امر بے شبہہ صحیح ہے کہ جس طرح دوسرے فنون میں غیر جگہوں سے چیزیں آکر شامل ہوئی ہیں۔ مثلاً فقہ کیلئے اصول فقہ تیار ہوگیا۔ اور قیاس نے ایک فنی صورت اختیار کرلی، علم کلام و عقائد میں فلسفہ داخل ہوگیا۔ اور منطقی و فلسفی دلائل و حجج و براہین کا شیوع ہوا۔ اسی طرح علم احسان و اخلاص میں بھی بعض باتیں باہر سے آگئی ہیں۔ جن کو خواہ تدبیر کے درجہ میں لاکر مان لیا جائے۔ یا ان سے بھی احتیاطاً پرہیز برتا جائے دونوں پہلو ہو سکتے ہیں۔ مگر اس سے اصل فن پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا۔ اس فن کی جو اصطلاحیں نئی ہیں۔ وہ افہام و تفہیم کی سہولت کی خاطر اختیار کی گئی ہیں۔ ان سے بھڑکنا حماقت ہے۔ جب کوئی چیز فن بن جاتی ہے تو اصطلاحات سے چارہ نہیں ہوتا۔

اب اس فن کے مسائل پر آیئے۔ مسائل اولین یہ ہیں۔

رذائل کیا کیا ہیں۔ ان رذائل کی حقیقت ازروئے قرآن و حدیث کیا ہے۔ اور ان رذائل کی بیخکنی کیونکر ہو۔ ان کے بالمقابل فضائل کیا ہیں۔ ان کی حقیقت کیا ہے۔ اور ان کے حصول کی تدابیر کیا ہیں۔ ہم غیبت سے کیونکر بچیں۔ ریا سے

کیونکر محفوظ رہیں۔ جھوٹ بولنا کیونکر ہم سے چھوٹ جائے۔ اور اس کے بالمقابل صدقِ مقال اور اخلاص عمل کیسے پیدا ہو، توکل، صبر وشکر، استقامت کیسے حاصل ہو، ہمارے قلب سے دنیا کی محبت کیسے نکلے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے بیٹھے۔

وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا (خدا کی طرف سب سے کٹ جا) اور

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔

(ترجمہ:۔ ایسے لوگ جن کو بیع وفروخت وغیرہ دنیا کے اشغال خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے)

یہ حالت ہم کو کیسے حاصل ہو۔ اور ان فرائض قلبی کے ادا کرنے کا طریق کیا ہے نماز میں قنوت یعنی خوف وخشوع کیونکر پیدا ہو۔ اکل حلال کیا ہے۔ تقوی کیسے حاصل ہو ایمان باللہ تعالیٰ کیونکر قوی ہو۔ دوام ذکر کیسے حاصل ہو۔

یہاں تک تو میں نے نفس فن کی حقیقت کا ذکر کیا ہے۔ اور ان غلطیوں کو دور کرنا چاہا ہے جو عام لوگوں میں شائع ہیں۔"

اس تحریر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اصلاح باطن، اور تزکیہ کا فن مستقل حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ جس کے مسائل کا مستقل دائرہ ہے اور اس کے ماہرین ہی اسے کماحقہٗ جانتے اور عملاً حل کر سکتے ہیں۔

غیر شرعی سلوک یا عجمی تصوف

سلوک کے مستقل فن بن جانے سے جہاں علمی وعملی لحاظ سے گوناگوں فوائد حاصل ہوئے وہاں مرور ایام سے چند در چند قباحتیں بھی در آئیں۔ قرون اولیٰ کے بعد جب اسلامی تربیتی نظام پر اضمحلال آیا۔ اور اسلامی جامعیت اسلامی

معاشرہ اور جماعت میں روز بروز کم ہونے لگی اور بجائے جماعت سے جماعت کے متاثر ہونے کے افراد کاملین پیدا ہونے لگے۔ جو اسلامی احکام و تعلیمات کے ظاہر و باطن کے جامع تھے اور ارشاد و تربیت کے نبوی فرائض کو بدرجہ احسن پورا کرتے تھے۔ لیکن سلوک کے مستقل فن بن جانے کے بعد اصحاب کاملین کے علاوہ متصوفین کا ایک ایسا طبقہ بھی وجود میں آنے لگا۔ جو باطنی علوم کا مدعی تھا۔ لیکن شریعت مطہرہ کے علوم و حکم سے ایک حد تک ناآشنا، اور اسلامی احکام سے ایک گونہ ناواقف تھا۔ کتاب و سنت کے نور و برکات سے خالی ہونے کی بنا پر شریعت و طریقت کی دوئی کا فسانہ تراشا گیا۔ جس نے رفتہ رفتہ ایک مہلک نظریہ کی صورت اختیار کر لی۔ مزید برآں تیسری، چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں غیر قوموں کے اختلاط، عجمی عناصر کے گھل مل جانے اور یونانی و ہندی فلسفہ خیالات کے اثر سے منہاج شریعت سے ہٹ کر تصوف کی دگر راہیں بھی رائج ہونے لگیں جس کی بنا پر ایک طبقہ سلوک کی حقیقت کو ہی گم کر بیٹھا، ناآشناؤں کو یہ عجمی پودا نظر آیا۔ اور وہ اسلام میں 'سلوک و طریقت' کے وجود کے ہی منکر ہو گئے۔ غرض صحیح و اسلامی تصوف کے علاوہ 'تصوف' کے نام سے فلاسفہ یونان و عجم کے لادینی و ملحدانہ تصورات نے عجمی "تصوف" کا ایک نظریاتی مدرسۂ فکر پیدا کر دیا۔

جو کبھی یونانی فلسفہ سے بہکا کبھی اس میں ایران و عجم کے اوہام نے بار پایا کبھی ہندی ویدانت و یوگ نے اسے متاثر کیا، تو کبھی مسیحی رہبانیت اس پر چھا گئی۔ یہی وہ نام نہاد عجمی تصوف ہے جس کا اسلامی تصوف سے موازنہ کرتے ہوئے علامہ ندوی

رحمۃ اللہ علیہ نے کبھی لکھا تھا۔

"حقیقی تصوف جسکی نسبت حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ حجۃ اللہ البالغۃ میں لکھتے ہیں۔ کہ زبان شرع میں اس کا نام احسان ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے۔ وہ تو درحقیقت مذہب کی روح، اخلاق کی جان اور ایمان کا کمال ہے۔ مگر محاورہ میں تصوف اور خصوصاً عجمی تصوف ایک قسم کا فلسفہ ہے جس کو عجم نے اسلام کی بربادی کیلئے اختراع کیا۔" (رسالہ معارف دسمبر ۱۹۲۶ء صفحہ ۴۴۴)

یہ عجمی اور ملحدانہ تصوف، حکماء کی فلسفیانہ موشگافیوں، نو افلاطینیت اور یوگ و ویدانیت سے متاثر ہو کر الحاد و زندقہ کی بولی بولنے لگا۔ اور وحدۃ الوجود وغیرہ کی غلط تعبیرات سے صریح شرک اور علمی تعطل بن گیا۔ دوسری طرف جاہل صوفیا نے تصوف کی غلط تعبیرات کا ایسا صور پھونکا کہ اسکی تاریکی میں اصل تصوف کا نور گم ہو کر رہ گیا۔ احکام الہی کی کامل پابندی، سنن نبوی کا اتباع، فضائل اخلاق کا حصول، رذائل کا ترک اخلاص و عبدیت اور احسان و تقویٰ کی تحصیل، قرب و رضائے خداوندی کی لگن، توحید و یقین، محبت و خشیت ربانی کی طلب حضور و ذکر دوام کی فکر و دھن جو تصوف کے اصل عناصر تھے۔ نگاہوں سے گم ہو کر رہ گئے، اور عوام کی اعجوبہ پرستی اور متصوفین کی بے راہ روی نے کشف و کرامات، الہام و وجدانیات ہی کو اصل تصوف اور سلوک کا مقصد قرار دے دیا۔ حالانکہ ان چیزوں کو مقاصد تصوف میں کوئی دخل نہیں۔ یہ صرف انفعالات اور مجاہدات کے ثمرات عاجلہ اور محض راہ کے تماشے ہیں جو اگر کتاب و سنت کے مطابق ہوں۔ تو محمود ہیں۔

لیکن مقصود نہیں۔ کہ اصل مقصد صرف رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ جو صرف عقائد حقہ اور اعمالِ صالحہ کا نتیجہ ہے۔ اور ان اشیاء (کشف وکرامات وغیرہ) کو رضا اور قربِ الٰہی میں قطعاً کوئی دخل نہیں۔ بلکہ بسا اوقات یہ چیزیں مانع طریق اور تنزل کا سبب بن جاتی ہیں۔ کیونکہ سالک ان "بزرگانہ اوہام" "نورانی حجابات" اور "پاکیزہ شعبدوں" میں اس طرح الجھ کر رہ جاتا ہے۔ کہ اصل مقصد بلکہ بسا اوقات راستے ہی کو گم کر دیتا ہے۔ اور تمام عمر ان شعبدہ بازیوں میں سرگرداں اور ان کو حق کا نشان اور رضائے الٰہی کا ثمرہ و انعام سمجھ کر گمراہی اور جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے۔ ؎

رہا نہ حلقہ صوفی میں سوزِ مشتاقی فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ان تمام غیر شرعی عقائد و اعمال کو ناجائز اور ان رسوم و قیود فلسفیانہ تعبیرات و خیالات کو جو کہ بیرونی اثرات کی بنا پر تصوف میں داخل ہو گئے ہیں۔ سخت ناپسند فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ راقم سے مذاقاً ارشاد فرمایا۔ "آپ کو فقیری کا ایک آسان نسخہ بتادوں۔" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ "فرمایا۔ دو پیسے کا گیروا رنگ لے لیجئے۔ اور ان سے اپنے کپڑے کو رنگ لیجئے۔ اور اگر ایک ٹیڑھا سا ڈنڈا مل جائے تو اور بھی اچھا ہے۔ اور 'ھو حق' کرنی شروع کر دیجئے۔ ہو گئی فقیری!..... پھر نہایت درد سے فرمایا۔ "جاہل اور بازاری صوفیوں نے تصوف کا ناس کر دیا۔" ایک مرتبہ لطائف ستہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "تصوف جو سراسر عمل تھا اُسے فلسفہ بنادیا اور یہ یونانی اثر کی بنا پر ہوا" فرماتے تھے۔ اس وقت دنیا میں تین قسم کا تصوف ہے۔ ایک ملحدانہ (یا فلسفیانہ) تصوف، دوسرا

عامیانہ یا بازاری تصوف، تیسرا صحیح اور اسلامی تصوف اور وہی حق ہے۔"

فلسفیانہ تصوف حضرت سیّد الملۃ نور اللہ مرقدہ نے اپنی محققانہ کتاب "خیام" میں "حکیم صوفی، عمر خیّام کے مذہب کی تحقیق کرتے ہوئے 'فلسفیانہ تصوف' پر جو تبصرہ فرمایا ہے۔ وہ پرانا (۱۹۳۰ء کی تحریر) ہونے کے باوجود تاریخی بصیرت' اعماقِ نظر، دقیقہ رسی اور نکتہ فہمی کا نمونہ ہے۔ ارقام فرماتے ہیں :۔

"میں نے اوپر کہا ہے، کہ فلسفیانہ تصوف فلسفہ سے باہر نہیں۔ اصل یہ ہے۔ کہ تصوف کا لفظ اب مدت سے دو معنوں میں بولا جاتا ہے۔ یا یہ کہو۔ کہ تصوّف کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مذہبی تصوّف اور دوسرا فلسفیانہ تصوّف، مذہبی تصوّف سے مقصود مذہبی روح یعنی اخلاص، محبت، زہد، تقویٰ، عبادت اور شریعت پر سنّتِ نبوی کے مطابق عمل ہے اور اسی کا نام حدیث کی اصطلاح میں "احسان" ہے۔ پہلی اور دوسری صدی میں زہّاد اور عبّاد اسی قسم کے تھے۔ عام مسلمانوں سے الگ ان کے کچھ خاص عقائد اور خیالات نہ تھے۔ وہ فلسفہ سے بھی نا آشنا تھے۔ وہ صرف قرآن و حدیث سے توغل رکھتے تھے۔ اور روزہ، نماز، تلاوت قرآن اور نوافل ان کا شب و روز کا شغل تھا۔ اور اخلاص عمل اور خلق کی خدمت پر ان کے ہاں سب سے زیادہ زور تھا۔

اور فلسفیانہ تصوّف سے مقصود الٰہیات کے متعلق حکیمانہ خیالات

رکھنا اور فلاسفہ کی طرح خشک زندگی اختیار کر کے، انکی اخلاقی تعلیمات پر عمل کرنا ہے۔

پہلے تصوّف کا مرکزِ خیال نبوّت ہے۔ اور اس میں انبیاء کے احوال کی پیروی ہوتی ہے۔ اور دوسرے تصوّف کا مرکز 'حکمت' ہے اور اِس میں فلاسفہ اور حکماء کے احوال کی پیروی کیجاتی ہے۔ وشتّان بینھما۔

خیام کا تصوف مذہبی نہیں۔ بلکہ حکیمانہ تھا۔ یعنی اس کے سامنے انبیاء کے احوال نہیں۔ بلکہ حکماء کے حالات تھے۔ اور انہیں کے خیالات تھے۔ تصوّف کی ان دونوں قسموں میں امتیاز نہ کرنے کے سبب سے اسلامی تصوّف کے مغربی مصنفین کو بہت کچھ اختلاط اور التباس پیش آیا ہے۔ عملی تصوف کا آغاز تو اسلام میں زہد و ترکِ دنیا میں غلو سے ہوا۔ لیکن بعد کو اس میں جو نظری تصوف داخل ہوا۔ جس میں خاص خیالات، خاص عقائد اور ایک خاص قسم کے فلسفہ کی آمیزش تھی۔ وہ جدید افلاطونی سکول کی تعلیمات تھیں۔ جو اسلام کے خالص تصوّف میں تیسری صدی کے اواخر سے شامل ہونے لگیں۔ یہی وہ تصوّف ہے۔ جسکو ہم "فلسفیانہ تصوف" کہتے ہیں۔"

اِس فلسفیانہ تصوّف کا ماخذ، یونان کا اشراقی اور اسکا ... یا افلاطونی سکول ہونا بعض قدیم مسلمان حکماء کے نزدیک بھی مسلّم تھا۔ چنانچہ مشہور حکیم ابوریحان بیرونی المتوفی سنہ ۴۴۰ھ کہتا ہے۔

وکان فیھم من یری انّ   ان حکیموں میں بعض ایسے تھے جو

الاشیاء کلها شئ واحد، ثم من قائلٍ فی ذلك بالکمونِ ومن قائل بالقوة وان الانسان مثلاً لم یتفضل عن الحجر والجماد الّا بالقرب من العلة الاولیٰ بالرتبة و الّا فهو هو، ومنهم من کان یری الوجود الحقیقی للعلة الاولیٰ فقط لاستغنائها بذاتها فیه وحاجة غیرها الیها، وان ماهو مفتقر فی الوجود الی غیره فوجوده کالخیال غیر حق والحق هو الواحد الاول فقط، وهذا رای الصوفیة وهم الحکماء فان سوف بالیونانیة الحکمة وبها سُمّی الفیلسوف پیلا سوپا ای محب الحکمة، ولما ذهب فی الاسلام قوم الی قریب من

سمجھتے تھے۔ کہ تمام اشیاء حقیقت میں ایک ہیں۔ پھر ان میں بھی دو فریق ہیں۔ ایک فریق اس کا قائل ہے کہ ان اشیاء کی امتیازی صفت ان میں چھپی موجود رہتی ہے۔ اور دوسرا کہتا ہے۔ کہ اسوقت آن میں موجود نہیں رہتی رہتی بلکہ آئندہ اسکی استعداد ان میں موجود رہتی ہے۔ مثلاً انسان پتھر اور جمادات سے صرف اسلئے ممتاز ہے کہ وہ علتِ اولیٰ (خدا) سے رتبہ میں قریب ہے۔ ورنہ وہ بھی پتھر اور جماد ہی ہے۔ ان میں بعضوں کی یہ رائے تھی کہ حقیقی وجود صرف علتِ اولیٰ کا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے وجود میں غیر کی محتاج نہیں۔ اور اسکے علاوہ دوسرے موجودات اپنے وجود میں اسکے محتاج ہیں۔ اور جو اپنے وجود میں غیر کا محتاج ہو۔ اس کا وجود خیالی ہے۔ اور حق نہیں ہے۔ اور حق وہی

رابھم سموا باسمھم۔ (کتاب الہند ص ۱۶ لیڈن) | ایک اول ہے۔ اور یہ رائے سوفیہ کی ہے اور وہی حکماء ہیں۔ کیونکہ سوف، یونانی میں حکمت، کو کہتے ہیں۔ اور

اسی سے فیلسوف کو یونانی "پیلا سوپا" کہتے ہیں یعنی حکمت کا عاشق، اور چونکہ اسلام میں بعض لوگ انکی رائے کے قریب ہو گئے ہیں۔ اسلئے وہ بھی اسی نام (صوفیہ) سے پکارے گئے۔

علامہ ابن تیمیہؒ المتوفی ۷۲۸ھ جو عقل و نقل اور فلسفہ و مذہب دونوں کے امام تھے۔ اپنے رسالہ فی السماع والرقص میں لکھتے ہیں۔

وابن سینا احدث فلسفة	اور ابن سینا نے ایک فلسفہ پیدا
رکبھا من کلام سلفہ الیونانی	کیا جسکو اس نے اپنے پہلے کے
ومما اخذہ من اھل الکلام	یونانی فلاسفہ اور (مسلمانوں میں سے
المبتدعین الجھمیۃ ونحوھم	بدعتی متکلمین جہمیہ وغیرہ کے خیالات
وسلک طریق الملاحدۃ	سے ملا جلا کر بنایا تھا۔ اور بہت
الاسماعیلیۃ فی کثیر من امورھم	سی علمی اور عملی باتوں میں وہ اسماعیلی
العلمیۃ والعملیۃ، ومزجہ	ملحدوں کے راستہ پر چلا اور کچھ
بشیء من کلام الصوفیۃ	باتیں اس میں صوفیہ کی ملا دیں۔ جو
وحقیقۃ تعود الی کلام اخوانہ	حقیقت میں اس کے ہم خیال اسماعیلی
الاسمٰعیلیۃ القرامطۃ الباطنیۃ	قرامطہ باطنیہ کے خیالات سے
فان اھل بیتہ کانوا من اتباع	ماخوذ تھیں کیونکہ ابن سینا کے

الحاكم الذی کان بمصر کانوا	اہلِ خاندان مصر کے حاکم بامر اللہ
فی زمانہ، و دینھم دین	(فاطمی اسماعیلی) کے پیروؤں میں تھے
اصحاب رسائل اخوان	یہ لوگ اسی کے زمانہ میں تھے۔اور
الصفا۔	ان کا مذہب رسائل اخوان الصفا
(مجموعہ رسائل کبری ابن تیمیہؒ جلد دوم صـ۲۹۸ مطبعہ عامریہ شہرفیہ مصر)	والوں کا مذہب تھا۔

حاجی خلیفہ چلپی کشف الظنون میں تصوف کے ضمن میں کہتا ہے۔

واعلم ان الاشراقیین من	اور جاننا چاہئیے کہ حکمائے الٰہیات
الحکماء الالٰھین کالصوفیین	میں سے اشراقی مشرباً و اصطلاح
فی المشرب و الاصطلاح،	میں صوفیوں کی مانند ہیں خصوصاً ان
خصوصاً المتاخرین منھم	میں سے پچھلے اشراقی، لیکن فرق صرف
الا مایخالف مذھبھم مذھب	ان مسائل میں ہے جن میں اشراقیہ
اھل الاسلام، ولایبعد ان	کا مذہب اسلام کے مذہب کے
یوخذ ھذا الاصطلاح من	مخالف ہے۔اور یہ کچھ بعید نہیں کہ
من اصطلاحھم کما لایخفی	یہ اصطلاح (تصوف) انہی کی اصطلاح
علی من تتبع کتب حکمۃ	(سوف) سے ماخوذ ہو۔جیسا کہ یہ
الاشراق۔	اس شخص سے چھپا نہیں جس نے
	اشراقی فلسفہ کی کتابیں دیکھی ہیں۔

خیر یہ لوگ تو حلقہ تصوف سے باہر کے ہیں۔شیخ فریدالدین عطار جو مشہور صوفی

ہیں۔ اپنے تذکرۃ الاولیاء میں شیخ ابوالحسن خرقانی المتوفی ۴۲۵ھ اور شیخ ابوعلی سینا المتوفی ۴۲۸ھ کی باہمی ملاقات کے تذکرہ کے بعد لکھتے ہیں۔

"تابعد ازاں طریقت (تصوّف) بفلسفہ کشید، چنانکہ معلوم ہست"

(ص ۲۰۷ گب، نصف ثانی)

دبستان المذاہب کا مصنف، فانی کشمیری المتوفی ۱۰۸۱ھ جو خود اسی فلسفیانہ تصوّف کی شراب سے بدمست تھا۔ صوفیہ کے عقائد کے ضمن میں ایک عارف کی زبان سے نقل کرتا ہے۔

"از عارف بحق سبحانی، نامہ نگار شنیدہ: کہ در عقائد صوفیہ صفیہ ہمانست کہ اشراقیاں راست، صوفیہ اکنوں عقائد برمز و اشارات درآمیختہ اند، تا نااہل درنیابد بر سنت انبیاء و اولیاء و قدمائے حکماء (ص ۳۱۸ بمبئی)

ان حوالوں سے یہ واضح ہے کہ فلسفیانہ تصوّف، فلسفہ اشراق، جدید افلاطونی الٰہیات اور اخوان الصفا کی تاویلات ایک ہی سرچشمہ کی دھاریں ہیں (خیام ۳۱۲ تا ۳۱۸)

فلسفیانہ تصوف کا آغاز

حضرت سید الملت قدس سرہ کے نزدیک اسلام میں حکیمانہ یا فلسفیانہ تصوّف کا آغاز چوتھی صدی[1] ہجری میں ہوا ہے۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں۔

---

[1] مشہور فرانسوی مستشرق مینیان (Massignon) بھی چوتھی صدی ہجری تک تصوف کو بیرونی اثرات سے بری سمجھتا ہے۔ اور اسے بنیادی طور پر اسلامی جانتا ہے جو قرآن کے گہرے مطالعہ اور اسکے معانی پر غور و فکر کا نتیجہ ہے دیکھو نکلسن (A Literary History of Arabs) صفحہ ۲۳۱

علوم و حکمت کا مسلمانوں میں شیوع تھا۔ تیسری چوتھی صدی ہجری میں یونانی اور دگر فلسفیانہ علوم نے مسلمانوں پر اپنا سایہ ڈالا۔ تو جہاں دوسرے طبقات و علوم متاثر ہوئے صوفیا کا ایک طبقہ جو فطرۃً یا اکتساباً فلسفیانہ ذہن رکھتا تھا۔ یونانی الٰہیات و عجمی نظریات و حکمت کے پھاٹک میں الجھ کر رہ گیا۔ یا فلاسفہ کا وہ طبقہ جو تصوف و سرّیت کی طرف طبعی میلان رکھتا تھا، نام نہاد 'فلسفیانہ تصوف' کا علمبردار بن گیا۔ اور خالص اسلامی سلوک سے علیحدہ ایک نظریہ، طرز فکر و ریاضت کی طرح ڈالی جو حکیمانہ موشگافیوں، فلسفیانہ نظریات اور نو افلاطونی مشائی و رواقی ریاضات کا مجموعہ تھا۔ درحقیقت فلسفی صوفیہ، مسلمان فلاسفہ، یا حکمائے اسلام کی ایک شاخ ہیں جو اسلام میں فلسفۂ یونان و عجم کے نمائندے تھے، علوم قدیمہ اور فلسفہ یونان ان کا خاص فن تھا۔ اور وہ فلاسفہ کی تعلیمات کو اصل و حقیقت جان کر انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کو ان کے مطابق ثابت کرتے تھے۔ اور دونوں کو حق جان کر ان میں تطبیق دیتے تھے۔ اسلام میں ان حکماء کے ظہور و شیوع کا مسئلہ 'فلسفیانہ تصوف' اور 'فلسفی صوفیہ'، کے آغاز کے سمجھنے کیلئے ضروری ہے۔ اس لئے 'حکمائے اسلام' کے آغاز کے متعلق حضرت سید الملت رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق و تحریر نقل کی جاتی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"اسلام سے پہلے حرّاں واقع عراق میں کچھ حکماء کا گروہ تھا۔ جو" "حکیمانہ تصوف کا آغاز دیلمیوں کے زیر سایہ ہوا جو ۳۲۱ھ سے ۴۲۹ھ یعنی سلجوقیوں کی پیدائش تک برسر عروج رہے" عمر خیام صفحہ ۱۲۳

اس حکیمانہ و فلسفیانہ تصوف کے اسلام میں پیدا ہو جانے کا بڑا سبب یونانی

ایک طرف ایرانی اور دوسری طرف مصری و یونانی فلسفہ میں ماہر تھا۔ اس قسم کا گروہ اسکندریہ (مصر) میں بھی موجود تھا۔ جو ایک طرف عیسائی اصول اور دوسری طرف یونانی فلاسفہ کے خیالات سے متأثر تھا۔ اسلام آیا۔ تو اس سیلاب میں سب ہی غرقاب ہو گئے۔ عباسیہ نے جب عراق کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اور علوم وفنون کے ترجموں کی طرف توجہ ہوئی۔ تو اِس گروہ کے نصیب جاگے۔ ان میں حرّان کے صابی اور سریانی پیش پیش تھے۔ اسلام سے متأثر ہوکر وہ اصول تطبیق جو وہ ایرانی، عیسائی اور دوسرے مذاہب اور فلسفیانہ خیالات کے درمیان برت چکے تھے۔ وہی اسلام کیساتھ برتنے لگے۔ انہیں کے مسلمان ہم خیالوں کے نام 'حکمائے اسلام' قرار پایا۔ ان حکماء کی شریعت کا سب سے مکمل صحیفہ اخوان الصفا کے ۵۱ رسائل ہیں۔ نیز یعقوب کندی الموجود ۲۲۲ھ فارابی المتوفی ۳۳۹ھ ابو علی سینا المتوفی ۴۲۸ھ اور ابن مسکویہ المتوفی ۴۲۱ھ کی تصنیفات ہیں۔ یعقوب کندی کی تو کوئی فلسفیانہ کتاب ملتی نہیں۔ مگر فارابی ۳۳۹ھ کے رسائل اور خصوصاً اس کا رسالہ فصوص اس فرقہ کے خیالات کا آئینہ دار ہے .... فارابی کے بعد ابو علی سینا کی الٰہیات شفاء و اشارات اور ابن مسکویہ کی الفوز الاکبر و الاوسط و الاصغر اور کتاب الطہارت وغیرہ کتابیں ہیں۔" (خیام صد ۳۰۲، صد ۳۰۳)

اِس "حکمائے اسلام" یا مسلمان فلاسفروں" کی جماعت کا مقصد "عقل و نقل"

اور مذہب و فلسفہ میں تطبیق تھا۔ ان کے خیال میں حکماء کے آرا اور انبیا کی تعلیمات یکساں صداقت پر مبنی ہیں۔ اور دونوں برابر کی سچائیاں ہیں، پیغمبروں کی تعلیمات میں اگر کوئی ایسی بات ہے۔ جو بظاہر عقل کے خلاف ہے۔ تو اسکی تاویل کر کے اسکے معنٰی کی تشریح اسطرح کیجائے کہ وہ عقل و فلسفہ کے مطابق ہو جائے۔ یہ فرقہ اسلامی عقائد کی تشریح فلسفیانہ مذاق کے مطابق کرتا تھا۔ اور حکمائے یونان اور انبیاء علیہم السلام کو ایک ہی تنہ کی دو شاخیں تسلیم کر کے ان دونوں کی تعلیمات میں تطابق پیدا کرتا تھا" (خیام صفحہ ۳)

چنانچہ رسائل اخوان الصفاء کے مصنفین لکھتے ہیں۔

"........ ہمارے معزز اہل علم بھائیوں کا مذہب یہ ہے۔ کہ ان شرعی اور عقلی دونوں علوم میں غور کریں۔ اور دونوں کی حقیقتوں کو کھولیں یعنی علوم حکمت (فلسفہ) اور علوم نبوت دونوں کی..... پھر جان لے کہ علم حکمت اور علم شریعت دونوں خدائی علم ہیں، غرض اور مقصودِ اصلی میں دونوں متفق ہیں۔ اور جزئیات میں مختلف ہیں۔ یعنی یہ کہ فلسفہ کی برتریں غرض جیسا کہ کہا گیا ہے۔ یہ ہے کہ انسانی قوت کے مطابق صفات الٰہی سے تشبہ پیدا کیا جائے۔ جیسا کہ ہم نے اپنے سارے رسالوں میں بیان کیا ہے....... اسی طرح نبوت اور شریعت کی غرض بھی نفس انسانی کی تہذیب و اصلاح، اور اس دنیائے کون و فساد کی جہنم سے اسکو رہائی دینا اور دنیائے آسمان کی جنت اور اہل جنت کی نعمت تک پہنچانا ہے....... یہ دونوں کی متحدہ غرض ہے۔

اور یہی علوم حکمت اور شریعت دونوں کا واحد مقصود ہے۔"

(صد ۳۲۹ ج ۲، صد ۳۲۳ ج ۲) (خیام ۔ صد ۳۰۹، صد ۳۱۰)

گذر چکا کہ انہیں 'حکمائے اسلام' کی ایک اہم شاخ 'صوفی حکماء' کی تھی۔ چنانچہ ان کا ایک نمائندہ صوفی حکیم عمر خیّام ہے وہ جس تصوف کا مداح اور پیروکار ہے۔ اسکے اصول و فروع خدوخال، طرز و طریق، فکر و نظر انہیں مسلمان فلاسفہ کی بولی اور صدائے باز گشت ہے۔ چنانچہ وہ اپنے رسالہ کلیات الوجود کے آخری باب میں شناخت خداوندی کے چار طالب "طبقات متکلمین، فلاسفہ اور اسماعیلی باطنیہ اور اہل تصوف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے

بدانک کسانی کے طالبان شناختِ خداوند سبحانہ وتعالیٰ اند، چار گروہ اند، اوّل متکلمانند کہ ایشاں بجدل و حجتہائی اقناعی راضی شدہ اند و بداں قدر پسند کردند در معرفت باری عز اسمہ و دوم فلاسفۂ و حکما اند کہ ایشاں بادلّہ و عقلی صرف در قوانین منطقی طلب شناخت کردند، وہیچ ادلّۂ اقناعی نہ کردند۔ لیکن ایشاں نیز بشرائط منطق وفا نتوانستند کرد و آزاں عاجز آمدند سیم اسماعلیاں اند و تعلیمیانند کہ ایشاں گفتند کہ طریقِ معرفت جز اخبارِ جزِ صادق نیست چہ در ادلّۂ معرفت صانع و ذات و صفات وے اشکالات بسیار است و ادلّہ متعارض، وعقول دراں متحیر و عاجز پس اول تر آں باشد کہ از قول صادق طلبند۔ چہارم اہلِ تصوف بودند کہ ایشان بتفکر و اندیشہ طلب معرفت نہ کردند، کہ بتصفیۂ باطن وتہذیب اخلاق، نفس ناطقہ را از کدورتِ طبیعت وہئیات بدنی منزہ کردند، چوں آں جوہر صافی گشت و درمقابلۂ ملکوت افتاد، صورتہائے آں بحقیقت در آنجابیگہ پیدا شود (بے) ہیچ شکے وشبہتے، وایں طریق از ہمہ بہتر است (چہ معلوم شدہ است) کہ ہیچ کمال از حضرت خداوند منجول

نیست، و آنجائگہ منع و حجاب نیست، پس ہر آنچ آدمی را نبود از کدورتِ طبع باشد چہ اگر حجاب زائل شود وحائل و مانع دور گردد، حقائق چنانک باشد پیدا شود۔

(خیام ۴۲۲، ۴۲۳)

حضرت سید الملۃ قدس سرہ نے خیام میں متعدد مقامات پر اس عبارت کو نقل فرما کر اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ ایک جگہ اس پر تبصرہ فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

" یہ اصول یہ طرزِ کلام، یہ اصطلاح تمام تر اسکندرانی اشراقی الٰہیات یعنی جدید افلاطونی حکما کی ہے اور بالکل یہی رنگ رسائل اخوان الصفاء میں جھلکتا ہے۔ اور یہی " فلسفیانہ تصوف " کی غایت ہے "۔ (خیام صـ ۳۱۹)

ایک دوسرے مقام پر ارقام فرماتے ہیں :۔

" اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ وہ (یعنی خیام) متکلم حکیم نہ تھا۔ فلسفی حکیم بھی نہ تھا، اسماعیلی حکیم بھی نہ تھا۔ اگر تھا تو صوفی حکیم، اور اسی طریق کو وہ پسندیدہ اور صواب جانتا تھا۔ (خیام صـ ۳۱۲)

ایک دوسری جگہ اس عبارت کے شروع و آخر میں اس طرح اظہار رائے فرماتے ہیں

" اِس رسالہ سے خیام کا دوسرا اصولی خیال یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ متکلمین کے مناظرانہ اور حکماء کی فلسفیانہ شعبدہ بازی اور نکتہ پروری کے طلسم کو بے اثر سمجھ چکا تھا اور تصوف کے دریچۂ اشراق سے جھانک تانک کے نظاروں کا اسکو چسکا پڑ رہا تھا .... اس آخری باب سے واضح ہے۔ کہ خیام متکلمانہ مناظروں، حکیمانہ دلیلوں اور حصولِ

تسکین کے اسماعیلی باطنی طریقوں سے تشفی نہ پاکر، تصوّف کے مشاہدات وانوار سے فیض چاہتا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ خیام کے اس آخری باب میں جو کچھ اختصار کے ساتھ ہے۔ وہی امام غزالیؒ کی 'منقذ من الضلال' میں شرح وتفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ انہیں چار فرقوں کا ذکر ہے۔ اور امام کا ان چاروں پر بعینہٖ یہی تبصرہ ہے اور آخر متکلمین، حکماء، اسماعیلیہ کے دلائل وتلقینات سے تسلی نہ پاکر صوفیہ کے گروہ میں داخل ہوجانے کا بیان ہے، اب یا تو اس زمانہ میں اکثر اہل نظر اسی ایک راستہ سے تصوّف کے مقام پر پہنچے تھے۔ اس لئے خیّام وغزالی کی واردات یکساں ہیں۔ یا ایک کی اصلی اور دوسرے کی نقلی ہیں (امام غزالی نے یہ کتاب جو حقیقت میں ان کی سوانح اور واردات قلبی ہیں، تقریباً پچاس برس کی عمر میں غالباً ۴۹۹ھ میں لکھی ہے اور ۴۸۸ھ سے ۵۰۰ھ تک کا زمانہ خیام کے اس رسالہ کلیات الوجود کی تالیف کا ہے) (خیام ص ۲۰۴، ۲۰۵)

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے، کہ عمر خیّام 'صوفی حکیم' تھا۔ اسلئے اسکے سوانح اور اس کا مسلک ومذہب 'صوفی حکماء' کے ایک کثیر طبقہ کے خیالات وطریق کی ترجمانی کرسکتا ہے، مزید برآں اسکے احوال ونظریات سے اسلام میں فلسفیانہ تصوف، کے آغاز ونفوذ کا معمہ ایک حد تک حل ہوسکتا ہے۔ اور انکی روشنی میں فلسفی متصوفین' کے افکار وطرق کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ اسلئے خیام کو فلسفی صوفیہ کی ایک بڑی جماعت کا نمائندہ اور فلسفیانہ تصوف کا حامل سمجھ کر مزید وضاحت

کیلئے حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی چند تحریریں نقل کرتے ہیں۔ غالبًا یہ طوالت و درازنفسی بے محل نہ ہوگی۔ ارقام فرماتے ہیں۔

"خیام کے طریقہ و مذہب کی تفصیل اسکے قدیم سوانح نگار کاتب اصفہانی نے ان الفاظ میں کی ہے۔

"(خیام) خراساں کا امام اپنے زمانہ کا علامہ (تھا) یونان کا علم جانتا تھا۔ اور واحد جزا دہندہ کی طلب کی تلقین کرتا تھا۔ اعمال بدنی کی پاکی کے ذریعہ سے تاکہ نفسِ انسانی پاکیزہ ہو۔ اور یونانی فلسفیانہ اصول کے مطابق اخلاق کے اختیار کرنے کا حکم دیتا تھا (اخبار الحکماء قفطی ۲۴۴ لیپزگ)

"ان چند سطور میں خیام کی جو تصویر کھینچی گئی ہے۔ اس سے زیادہ اس کے خیالات کی کوئی صحیح تصویر نہیں مل سکتی۔ غور کرو۔ یہ وہی شریعت ہے جسکی تلقین اخوان الصفاء میں ہے اور جس کا اجمالی نقشہ ابوعلی سینا کی الٰہیات میں نظر آتا ہے۔ اور اُوپر جاؤ تو یونان کے خالص رواقی اور اخلاقی فلاسفروں کی زندگیوں میں نظر آتا ہے۔ اور بعد کو افلاطونِ الٰہی اور اسکندریہ کے مذہبی فلاسفروں کی تلقینات میں" (خیام ص ۱۳۱)

چنانچہ بقول سید الملۃ قدس سرہ کے :-

"خیام جس زہد و ورع اور پاکیزگی وطہارت کی دعوت دیتا ہے۔ وہ بھی مذہبی نہیں۔ بلکہ یونان و اسکندریہ کے زاہدِ خشک فلاسفروں کی تعلیم کے مطابق ہے۔ قفطی نے کاتب اصفہانی کے ذریعہ اس کے جو خیالات نقل کئے ہیں۔ ان کی حرف حرف تائید اس کے عربی شعر سے ہوتی ہے۔

اصوم عن الفحشاء جهراً وخفیۃ۔ عفافاً وافطاری تبقدیس فاطری

ترجمہ:۔ میں علانیہ اور چھپی ہر برائی سے روزہ رکھتا ہوں (یعنی باز رہتا ہوں)۔
اپنی عفت اور پاکدامنی کی خاطر، اور میرا افطار یہ ہے کہ اپنے خالق کی
تقدیس کروں۔

غرض گناہ اور رذائل سے پرہیز وہ جنت کے حصول یا خدا کیلئے نہیں۔ بلکہ عفت نفس کے لئے کرتا ہے جس کا دوسرا اصطلاحی نام ان کے حکماء کے یہاں تکمیل نفس ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ نفس انسانی تمام تر ناقص ہے۔ اِس عالم امکان میں یہ اپنی تکمیل کیلئے بھیجا گیا ہے۔ اسکی تکمیل علوم عالیہ اور اخلاق فاضلہ کے حصول سے ہوتی ہے۔ اور جو علوم اور اخلاق اسکو حاصل ہوتے ہیں۔ ان کا نام ملکات نفسانیہ ہے یہی ملکات نفسانیہ مرنے کے بعد اس کی جنت یا دوزخ ہیں۔ اگر اچھے ملکات ہیں تو نفس کو سرور حاصل ہوگا۔ یہ جنت ہے اور اگر بُرے ہیں تو اس کو افسوس وحسرت و ندامت ہوگی اور ہمیشہ کڑھتا رہے گا یہ اس کی دوزخ ہے۔"

.... اسلئے ظاہری بہشت کی طلب اور ظاہری دوزخ کے ڈر سے کسی کام کا کرنا حماقت ہے (العیاذ باللہ) (خیام۔ ص ۲۲۸ ۔ ۲۳۰)

یہ تمام خیالات وافکار یونان واسکندریہ کے ملحد فلاسفروں کے ہیں" اسی طرح کمالات انسانی کی انتہا "معرفت" کو قرار دینا، جیساکہ خیام کے اس فقرہ سے ظاہر ہے۔ جو اس نے مرتے وقت کہا"

"خداوندا میں نے اپنے امکان بھر تیری معرفت حاصل کی۔ مجھے بخشدے،

میری یہی معرفت تیرے حضور میں میرا وسیلہ ہے" (بیہقی و شہرزوری)

اسی (حکما و فلاسفہ کے) مذہب و مسلک کی بولی ہے۔

معرفت کا راستہ خیام کے نزدیک ریاضت ہے۔ جیسا کہ اسکے رسالہ 'وصف للموصوف' میں ہے۔

فمن وجد نفسه من المقصرين	تو جو اپنے کو اس علم میں قاصر پائے
في هذا العلم	.... تو
وعليه بالرياضة التامه والا-	اس پر کامل ریاضت اور اللہ تعالیٰ
ستعانة بحسن التوفيق من	کی حسن توفیق مانگنا واجب ہے۔
الله تعالیٰ۔	

یہ تعلیم بھی وہیں کی ہے۔

خدا اور اسکی ذات وصفات اور نبوت و رسالت کے متعلق (صوفی فلسفی) خیام کے وہی حکیمانہ خیالات ہیں۔ جو اخوان الصفا کے رسالوں اور بوعلی سینا کے اشارات و شفا میں ملتے ہیں۔ جیسا کہ رسالہ کون و تکلیف میں اس نے خود ظاہر کیا ہے فیثاغورث کے مسئلہ عدد سے بھی اس کو دلچسپی ہے، جس کو اس نے اپنے رسالۂ کلیات الوجود میں ذکر کیا ہے، اس مسئلہ کے ساتھ رسائل اخوان الصفا کے مصنفین کو بھی وہی عقیدت تھی۔ جس کا ذکر انھوں نے اپنے رسالۂ حساب میں کیا ہے۔

اس کی حکیمانہ توحید اور ارواح و ملائکہ کی حقیقت کا بیان اس رباعی میں ہے،

حق جان جہاں ست و جہاں جملہ بدن ‌ ‌ ‌ ارواح و ملائکہ حواس ایں تن
افلاک و عناصر و موالید اعضا ‌ ‌ ‌ توحید ہمیں است، دگر ہمہ فن

دوسرے حکماء کی طرح وہ بھی انسانیت کا کمال معرفت کو جانتا تھا۔ چنانچہ اپنی موت کے وقت جو دُعا اسکی زبان پر تھی، وہ یہ تھی۔

اللّٰھم تعرف انی عرفتك علی	خداوندا تو جانتا ہے کہ میں نے اپنے
مبلغ امکانی، فاغفر لی فان	امکان بھر تجھکو جانا، تو مجھے بخشدے
معرفتی ایاك وسیلتی الیك	کہ میری یہی معرفت تیرے حضور
(بیہقی وشہرزوری)	میں میرا وسیلہ ہے۔

اُس کی ایک رباعی سے بھی اس کا یہ خیال ثابت ہوتا ہے، کہتا ہے۔

روزے کہ جزائے ہر صفت خواہد بود

قدرِ تو بقدر معرفت خواہد بود

اس سے زیادہ وضاحت ایک اور دوسری رباعی میں ہے۔

ساقی مے معرفت مرا مکرمت است — در شرب بے معرفتاں معصیت است

بے معرفت آدمی چہ کار آید، ہیچ — مقصود ز آدمی ہمیں معرفت است

اس دعاء کے ان الفاظ سے کہ "میں نے تجھکو امکان بھر جانا" یہ اشارہ ملتا ہے۔ کہ وہ خدا کی کلی معرفت کے امکان کا قائل نہ تھا۔ اور سمجھتا تھا، کہ یہ انسان کی دسترس سے باہر ہے۔ یہ عقیدہ اس کی ایک رباعی میں اس طرح ادا ہوا ہے۔

گُنہِ خردم درخورِ اثباتِ تو نیست — واندیشۂ من بجز، مناجاتِ تو نیست

من ذات ترا بواجبی کے دانم — دانندۂ ذاتِ تو بجز ذاتِ تو نیست

خدا کے عالم کل ہونے کا بھی وہ قائل تھا۔ اس کی حسب ذیل رباعی میں یہ خیال کس خوبی سے ادا ہوا ہے۔

سرم ہمہ دانائے فلک می داند ۔ کو موی بموی ورگ برگ میداند
گیرم کہ برزق خلق رابفریبی باا وچہ کنی کہ یک بیک میداند

رسالہ کون میں خدائے تعالیٰ کا نام جس کو وہ الحق ۔ الاول ۔ الواجب ۔ الحق الاول وغیرہ الفاظ سے ادا کرتا ہے بڑے اہتمام وادب سے لیتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ کہ تمام ممکنات اسی واجب تعالیٰ کا فیضان ہے .... وہ خدا کو ہمہ خیر اور سراپا نیک تصور کرتا تھا۔ اور یقین رکھتا تھا۔ کہ اس کے تمام کام بھی خیر محض ہیں۔ دوسرے رسالہ (ثلاثۃ اسئلۃ) میں کہتا ہے۔" اور میں ہر اس شخص کو جس کو حکماء میں سے سمجھتا ہوں۔ یہ وصیت کرتا ہوں کہ وہ اس بارگاہ ربانی کو ظلم و شر سے پاک کرے۔" ....

نبوت و رسالت کے معنی اسکے نزدیک اس شخصیت کاملہ کے ہیں۔ جو سنت عادلہ لیکر اس دنیا کے امن و نظام کو قائم کرتی اور اہل دنیا کو ملوثات دنیا سے پاک کر کے حق تعالیٰ کی طرف دعوت دیتی ہے۔ اور وہ روحانی قوتوں سے مؤید ہوتی ہے رسالہ کون کے آخر میں اس نے نبوت و رسالت کی یہی تشریح کی ہے۔ اور یہی فارابی کے رسائل اور بوعلی سینا کے اشارات میں ہے۔

خیام جبر کا قائل ہے .... مگر یہ پیش نظر رہے۔ کہ خیام کا جبر مذہبی استدلالات پر مبنی نہیں۔ بلکہ فلسفیانہ دلائل پر مبنی ہے۔ خود کہتا ہے۔

نیکی و بدی کہ در نہاد بشر است شادی و غمی کہ در قضا و قدر است
با چرخ مکن حوالہ کاندر رہ عقل چرخ از تو ہزار بار بیچارہ تر است

یہ بالکل اس جدید افلاطونی فلسفہ مشائیہ کے مطابق ہے۔ جسکی تشریح بوعلی سینا نے

لی ہے۔ گویا آسمان کی گردش ہی سے مادی دنیا کے تمام انقلابات ہیں، مگر آسمان اپنی گردش اور اپنے نتائج کے پیدا کرنے میں بالکل مجبور ہے۔ ....

خیامؔ نے اس مسئلہ کی تقریر رسالۂ کلیات الوجود میں پوری طرح کی ہے اور سلسلۃ الوجود کو مفصل بیان کیا ہے ....

عقول، نفوس، افلاک، اور موالید ثلاثہ اس کے نزدیک مبدء اول (خدا) یا واجب الوجود اور ممکنات کے درمیان واسطہ ہیں۔ اور اسکی معرفت کو وہ انسانیت کا ضروری جز جانتا ہے۔ چنانچہ کلیّات الوجود میں کہتا ہے۔

"و ایں قاعدہ راسلسلۃ الترتیب خوانند، ومردم را مردمی آنگہ درست شود کہ ایں سلسلۃ الترتیب بشناسد وبداند کہ ایں جملہ ارباب متوسط اند، چونکہ افلاک وامہات وموالید، وعلتِ وجود او اند، نہ از جنس او ایزد جل جلالہٗ (خیام ص ۳۱۹ تا ص ۳۲۸)

اِن اقتباسات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے۔ کہ فلسفی صوفی خیام کسطرح فلاسفۂ یونان کی الٰہیات میں مؤشگافیوں اور رواقی، نو افلاطونی مشائی طرق کو دگر مسلمان حکماء کی طرح اسلامی عقائد و اعمال سے آمیز کرنے کی کوشش کر رہا تھا، گویا اسکا ذہنی قوام فلسفہ یونان کے تصورات ہی سے بنا تھا۔ اور وہ انہیں کو حق سمجھ کر اسلام کے پاک اور الٰہی نظریات کو ان کے مطابق سمجھ رہا تھا۔ اِس اجمال کی تفصیل اِسکے رسائل و کلام میں ملتی ہے۔ جسکا تذکرہ حضرت والا قدس سرہ نے خیام میں خوب شرح وبسط کے ساتھ کیا ہے۔ (دیکھئے خیام ص ۱۸۳ تا ص ۲۰۸)

غرض اسلامی عقائد کی فلاسفہ یونان کی الٰہیات کے رنگ میں توجیہہ اور

یونانی فلسفہ کے اصول کے مطابق طہارتِ نفس اور حسن اخلاق کی تعلیم اسکا مذہب تھا اور اپنے اسی فلسفیانہ تصوف کے راستہ سے اپنے مقصدِ توحید و معرفت تک پہنچنے کی دل میں امنگ رکھتا تھا۔ اور اسی نہج پر چلتے ہوئے اسی کی دعوت دیتا تھا۔

' فلسفی صوفیہ' کا کثیر طبقہ ' خیام' کی طرح یونانی فلاسفہ سے متاثر تھا۔ ان کے خیالات حکیمانہ اور اخلاق زاہدانہ تھے۔ یہ اسکندریہ کے افلاطونی حکیموں اور یونان کے رواقی فلسفیوں کی طرح اپنے حکیمانہ اصول و خیالات کے مطابق خشک فلسفیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اور ریاضات شاقہ کے ذریعہ سے تزکیۂ نفس اور ترقی روح کے مدارج ڈھونڈھتے تھے...... فارابی المتوفی ۳۳۹ھ ابن مسکویہ المتوفی ۴۲۱ھ اور شیخ الاشراق سہروردی المقتول ۵۸۷ھ وغیرہ اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔" (خیام ص ۳۰۱)

یونانی الٰہیات، نو افلاطونی نظریات، عرفانی، مشائی اور رواقی فلاسفہ کے طریقوں کے علاوہ اس فلسفیانہ یا ملحدانہ تصوّف میں ہندوستانی جوگ اور ویدانت، اور مسیحی رہبانیت کے بعض مجاہدات اور تصورات بھی شامل ہو گئے۔ اسطرح ' عجمی تصوف' کا اجنبی پودا اسلام میں در آیا۔ جسے دیکھ کر صحیح اسلامی سلوک' کے متعلق بھی طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہوئیں۔ اور غلط فہمی اور التباس کی بنا پر اس ملحدانہ اور فلسفیانہ طرزِ فکر و عمل کو اصل اسلامی تصوف، سمجھ لیا گیا۔ اس بنا پر مستشرقینِ یورپ کے ایک بڑے طبقہ نے ' اسلامی تصوّف' کو بھی دگر مذاہب سے ماخوذ اور فلسفہ یونان و عجم کا اثر و نتیجہ بتایا' اور حقیقتِ سلوک سے بیگانہ یگانے بھی تصوف سے متوحش اور بیزار ہو گئے حالانکہ ؎

این بدن تا آں بدن فرق است ژرف

اسلامی سلوک اور فلسفیانہ تصوف میں التباس کی وجہ

اس التباس کی ایک وجہ تو یہ تھی۔ کہ "حکیم صوفیہ" کا یہ طبقہ بہر حال مسلمان تھا۔ خدا اور رسول کا قائل تھا۔ دگر حکمائے اسلام کی طرح ان کے عقائد تھے، ایک حد تک نماز و دگر عبادات کا قائل و عامل تھا۔ خشک اور سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ان کی تزکیۂ نفس کیلئے ریاضت شاقہ (گو فلاسفہ کے اتباع ہی میں سہی) صوفیائے کرام کے مجاہدات کے مماثل تھیں۔ اسلئے حقیقت ناآشنا ظاہر بینوں کو اگر اس تلمیع پر زرِ خالص کا دھوکہ ہوا۔ تو یہ تعجب کی بات نہیں۔ فلسفی متصوفین کا طرزِ فکر و عمل اور فلسفیانہ تصوف ہر چند دگر مذاہب و مکاتیب فکر سے ماخوذ ہو تاہم ایک ایسی جماعت کا عقیدہ و نظریہ اور مسلک و شعار تھا جو مسلمانوں ہی کا ایک گروہ کہلاتا تھا۔ اسلئے اگر بعض طبقات نے اس عجمی ملحدانہ تصوف کو اسلامی تصوف سمجھ لیا، اور فلاسفہ متصوفین، کو صوفیہ حقانی پر قیاس کرنے کی غلطی میں مبتلا ہو گئے تو حیرت کا مقام نہیں کہ ظاہری تشابہ اکثر غلطی کا سبب ہوا ہے۔

فن کی اصطلاحات کا نہ سمجھنا اسی تشابہ اور التباس کا دوسرا سبب ہے حضرت سیدی قدس سرہٗ کا ارشاد ہے۔

"اصطلاحات کے نہ سمجھنے سے اکثر غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے"۔ اور یہ خلط و التباس بھی صوفیہ کی اصطلاحات کے صحیح نہ سمجھنے کی بنا پر ہوا۔

ظاہر ہے کہ دیگر اسلامی علوم کی طرح فنِ تصوّف سلوک' میں بھی باہر سے آکر اصطلاحات شامل ہوئیں. گو فن کی زبان و محاورہ میں ان کی حقیقت اور معنی یکسر بدل گئے، تاہم ظاہری لفظ کی 'بقا' نے اشتباہ و التباس کا دروازہ کھلا رکھا' اور صوفیہ کی اصطلاح میں جس لفظ کے معنی قطعاً دوسرے تھے۔ اسے لفظی اشتراک کی بنا پر دوسرے فن کی اصطلاح کی روشنی میں دیکھا ۔ جانچا اور سمجھا گیا۔ اسلامی فن سلوک میں فلسفہ، کلام اور الٰہیات کے بیرونی ماخذوں سے سینکڑوں اصطلاحات آئیں۔ گو فن میں آنے کے بعد انکے معنٰی اور حقیقت کلیتاً بدل گئی ہو۔ لیکن فن سے نا آشنا حضرات نے انہیں اس معنی میں سمجھا، جو فلسفہ یا دگر علوم میں اس کا مفہوم تھا۔ اس طرح 'فلسفیانہ تصوف' اور 'اسلامی تصوف' کی اصطلاحوں کا لفظی اشتراک بھی اس غلطی کا بڑا سبب بن گیا۔ اس بارے میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے۔ کہ سلوک سراسر عمل ہے۔ اس کی اصطلاحات کی حقیقت محض سننے یا پڑھنے سے سمجھنے میں نہیں آتی ۔ اسلئے جو حضرات سلوک کی شدبد کتابوں سے حاصل کرتے ہیں ان پر یہ دقیق فن نہیں کھلتا۔ اور نہ انکی حقیقت کو الفاظ کا تنگ جامہ اپنے اندر سمیٹ سکتا ہے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ قوم (یعنی اہل فن اور صوفیائے کرام) کی زبان غیروں کیلئے عجمی ہے۔ اب جو لوگ 'فلسفیانہ تصوف' اور 'اسلامی تصوف' کا سرسری مطالعہ کتابوں سے کریں گے۔ وہ 'نا آشنائے تحقیق' حضرات دونوں کو ایک ہی سمجھ لیں گے۔ اور بقول عارف روم 'شیر کا نشیر' پر قیاس کریں گے۔

اسلامی سلوک میں فلسفیانہ اور کلامی اصطلاحات کا ورود اور انکے اثرات

چوتھی یا پانچویں صدی ہجری میں یونانی فلسفہ اور کلامی مباحث کا چرچا اسلامی دنیا کے گھر گھر میں ہوچکا تھا، فلاسفہ اور آئمہ کلام کی تصنیفات نے فلسفہ اور کلام کی اصطلاحات کو گھر گھر پھیلا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر تمام اسلامی علوم میں یہ اصطلاحات پھیل گئیں، فن سلوک و تصوّف بھی اِس عالمگیر اثر سے بچ نہ سکا۔ اور فلسفہ اور کلام کی معتدبہ اصطلاحات اور کلامی مسائل فن میں داخل ہوگئے، الٰہیات و اخلاقی مسائل کی توضیح و تعبیر میں ایک گونہ فلسفہ و کلام کی بولی استعمال ہونے لگی۔ تاہم آئمہ فن اور محققین صوفیہ اول تو ان کانٹوں سے اپنے دامن کو بچاتے رہے لیکن جہاں محاورہ اور زبان کے عام چلن اور عمومی رواج نے ان کے اصطلاحات کا اختیار ناگزیر کردیا۔ ان الفاظ و اصطلاحات کے جامہ میں وہ شریعت کے معارف و حقائق، احسان و تقویٰ کے رموز و دقائق اور اخلاق و معاملاتِ اسلامی اور تزکیۂ نفوس کے اسرار ہی بیان فرماتے رہے۔ تاہم حقیقت ناآشنا، کم فہم حضرات ان مسائل و اصطلاحات کے فنی مفہوم و استعمال

کو درست نہ سمجھ سکے اور طرح طرح کی غلطیوں میں مبتلا ہو کر گمراہی و ضلالت کا شکار ہو گئے۔ کہ ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن۔ اسلامی تصوف کے متعلق شکوک و شبہات کی اکثر راہیں غالباً اسی راستے سے کھلی ہیں۔

فلسفیانہ موشگافیوں اور رجحانات کا سب سے بڑا نقصان جو فن کو پہنچا وہ یہ تھا کہ طریق جو سراسر عمل اور عملی تربیت کا نظام تھا۔ فلسفہ بن گیا، اور فرائض و سنن نبوی کا وہ سلسلہ جو ہر مسلمان کیلئے علی قدر المراتب ضروری و لازمی تھا۔ ایک خاص طبقہ میں محدود اور محصور ہو کر رہ گیا۔ حضرت سیدی قدس سرہٗ نے ایک مرتبہ تنزلات ستہ کا تذکرہ کرتے ہوئے حسرت سے فرمایا۔

"تصوف جو سراسر عمل تھا، اسے فلسفہ بنا دیا۔ اور یہ یونانی اثر کی بنا پر ہوا۔"

حضرت سید الملت قدس سرہ کے سامنے ہمیشہ اسوۂ نبوت کا پیکر جمال اور دین حق کی سادہ و حسین تمثال تھی۔ اور فلسفہ کے نقصانات اور کلامی مباحث کی نارسائی سے پوری طرح باخبر تھے۔ اسلئے تصوّف میں ان کے دخول و شیوع پر افسوس اور ان کے استعمال کو ناپسند فرماتے تھے۔ متکلمانہ مسائل اور فلسفیانہ اصطلاحات سے بچنے کی تاکید فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض مسائل کو اسلامی روح کے منافی اور فن سے قطعاً خارج تصور فرماتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"ہندوستان میں ہندوؤں کے جوگ اور ویدانت کے اثر سے اس میں بہت سے ایسے مسائل شامل ہو گئے۔ جو اسلام کی روح کے تمام تر منافی ہیں۔ حتیٰ کہ وحدت وجود، وحدتِ شہود و لطائف و دوائر کے

مباحث و اعمال بھی اصل فن سے قطعاً الگ ہیں۔ جو یا تو علم کلام و فلسفہ یا اوہام و خیالات و احوال سے وابستہ ہیں۔ جن کا تعلق نفسیات سے ہے (رسالہ معارف اعظم گڑھ ص ۱۶۱ ج ۵۳ نمبر ۲)

ایک سالک نے تنزلات ستہ کے سمجھنے کے متعلق استفسار کیا اور یہ بھی پوچھا کہ کیا اس مسئلہ کو محض عقلاً سمجھ لینے سے عبادات میں خشوع و خضوع اور حضوریٔ قلب میسر آتا ہے۔ کیونکہ اِس میں عبد و معبود کا تعلق معلوم ہو جاتا ہے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواباً ارقام فرمایا۔

"تنزّلات ستہ وغیرہ کے مسائل علم کیلئے آپ سمجھ لیں تو اچھا ہے۔ ورنہ درحقیقت وہ فلسفہ یا علم کلام کے مسائل ہیں۔ سلوک کیلئے وہ ضروری نہیں۔۔۔۔۔۔ ممکن ہے کسی کو اس راہ (تنزلات ستہ وغیرہ کے جاننے اور عمل) سے (خشوع و خضوع وغیرہ) مل جائے ورنہ ہمارے سلسلہ میں دوائر اور لطائف اور تنزلات وغیرہ کے مسائل معمول بہا نہیں (تذکرہ سلیمان ص ۴۹۵)

تذکرۂ سلیمان کے لائق مؤلف برادرِ طریق مولوی غلام محمد صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"متکلمانہ مسائل اور فلسفیانہ اصطلاحات کے متعلق حضرت متنبہ فرمایا کرتے تھے کہ اِن سے بچنا چاہیئے۔ کیونکہ:۔

"بہت سی باتیں کلام و فلسفہ کی راہ سے تصوف میں داخل ہوگئیں اور پھر عین تصوّف سمجھی جانے لگیں۔ خصوصاً فلسفیانہ اصطلاحات

کو دینی اہمیت دی گئی۔ اور پھر ان کی بنیاد پر الہیاتی مسائل کی تشریح و توضیح کی گئی۔ اور اسی کو تصوف یا فن احسان قرار دیا گیا۔ اِس اصطلاحی تصوف کے شیوع سے بڑی گمراہیاں پیدا ہوئیں، اور "نبوت" و "مہدیت" کے دعویدار پیدا ہوگئے

وحدۃ الوجود و شہود اور تنزلات ستہ کے بارے میں ارشاد تھا کہ:۔

"اول تو یہ مدار طریق نہیں، پھر ان میں بعض تو حال کا درجہ رکھتے ہیں۔ (جیسے وحدۃ الوجود و شہود) اور بعض محض افلاطونی فلسفہ کی متبدل شکلیں ہیں (جیسے مسئلہ تنزلات ستہ) ان کی طرف توجہ نہ ہونا چاہئے"

اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ:۔

"سلطان الاذکار، شغل احد، کشف قبور اور اس قبیل کی چیزیں تصوف نہیں۔ بلکہ تصوف کا آرٹ ہیں۔ آرٹ میں حقیقت کہاں؟ تصوف کا مقصود تو رضائے الٰہی اور اتباع سنت ہے۔ ہاں اس سلسلہ میں از خود کوئی بات حاصل ہو جائے تو وہ اور بات ہے"

اِس سے بھی بڑھ کر یہاں تک فرماتے تھے کہ:۔

"مثنوی مولانا روم بھی تصوف نہیں، بلکہ فلسفہ تصوف ہے اور صرف فلسفہ سے بگڑے ہوئے دماغ کا علاج نہ کہ ہر ایک کا۔"

(تذکرۂ سلیمان ص۳۳۱، ۳۳۲)

غرض حضرۃ الشیخ قدس سرہٗ سلوک کو اپنے اصلی اور نکھرے ہوئے نبوی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ حضرت سیدیؒ کے نزدیک طریق جملہ بیرونی آلائشوں

اورآمیزشوں سے پاک نبوی تربیت کا قدسی سوتا تھا۔جس میں کسی غیرالٰہی فلسفۂ عمل کی گنجائش نہ تھی۔کہ نبوت کا تربیتی سلسلہ اپنی ذات میں کامل ومکمل اور

لہ تاہم مثنوی کی اہمیت اور اپنے دائرہ میں اس کی تاثیر وفیض کے معترف وقائل تھے۔چنانچہ ایک ناقد مستفسر کو تحریر فرماتے ہیں۔

"مولانا رومی کی مثنوی جس مرض کی دوا ہے۔ آپ بحمداللہ اس کے مریض نہیں۔ اس لئے اس کی قدر آپ کی نگاہ میں نہیں، مگر جو اس مرض کے مریض ہیں۔ ان کیلئے وہ قرابادینِ صحت وشفا ہے اور تجربہ اس پر شاہد ہے۔

حضرت حکیم الامتؒ کے آثار علیہ کی تحت میں لکھتے ہیں۔

"طریق اور سلوک کے اسرار ورموز اس قدر دقیق اور نازک ہیں۔کہ ذرا ان کے سمجھنے میں بے احتیاطی کیجائے تو ہدایت کی بجائے وہ ضلالت کا ذریعہ بن جائیں۔اِس سلسلہ میں حضرت مولانا رومی کی نے کی جو مثنوی معنوی کے نام سے سرو ونواز حقیقت ہے خاص اہمیت ہے" اور اسلئے وہ اس سلسلہ کے اکابر کے خانقاہی درس میں رہی ہے۔حضرت حاجی امداداللہ صاحب رحمہ اللہ کو اس سے خاص ذوق تھا۔اور وہ بھی خاص خاص لوگوں کو اسکا درس دیتے تھے...... (رسالہ معارف اعظم گڑھ صہ ۱۰۸ نمبر۲ ج ۵۳)

ایک دوسری جگہ حضرت تھانویؒ کی خدمات کے سلسلہ میں تحریر فرمایا۔

"ایک اور سمت مولانا روم کی مثنوی کے دفتر کھولے گئے جن کے سپرد صدیوں سے حقائق ودقائق کے خزانے ہیں۔" (مقدمہ تجدید تصوف وسلوک صہ ۱۴)

جامع ومانع ہوتا ہے۔ وہ نفوس انسانی کی تربیت وآرائش، روحانی تزکیہ اور قلبی تطہیر

وزیبائش میں نہ یونانی فلسفہ کا محتاج ہے نہ نوافلاطونی نظریات واشراقی حکمت کا دست نگر، نہ وہ رواقی اور مشائی دستور وریاض کا پابند ہے نہ اسے ہندی ویدانت کی ضرورت ہے۔ اور نہ ہی اسے جوگ ومسیحی ریاضات ورہبانیت کی حاجت ہے۔ وہ ایک الٰہی نخل ہدایت ہے۔ جو اپنی خالص اسلامی سرزمین میں پھلتا پھولتا اور بار آور ہوتا ہے تعلیمات نبوی کے باہر اسکا کوئی وجود نہیں۔

غیر نبوی الٰہیات کی ملحدانہ بھول بھلیاں توحید ومعرفت الٰہی کے راز کو الجھا تو سکتی ہیں۔ لیکن ایمان ویقین کی نورانی وادی کو نہیں پاسکتیں، فِیۡ کُلِّ وَادٍ یَّھِیۡمُوۡنَ، ان کا حال تو ہوسکتا ہے۔ لیکن ربانی طمانیت قلب، کا گوہر مقصود انکی رسائی سے باہر ہے۔ اور خوارق مکاشفات ومواجید کی ساحرانہ شعبدہ بازیوں کا ظہور ان سے ہوسکتا ہے۔ لیکن موسوی ید بیضا، کی روشنی انہیں میسر نہیں آسکتی کہ سلوک وتصوف سے مقصود شریعت مطہرہ کے ظاہری وباطنی احکام کے اتباع کامل سے رضائے حق اور اللہ تعالیٰ کا قرب خاص حاصل کرنا ہے۔ اور تزکیۂ وصفائی باطن سے مراد بھی وہی صفائی قلب اور روح کی پاکی ہے۔ جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متزکی، اور پرانوار تعلیمات پر عمل کرنے کے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہو۔ اِس لئے اسلامی سلوک وتصوف میں کسی ایسے فلسفیانہ عقیدہ وطرز فکر کی گنجائش اور ریاضات ومجاہدات کی حاجت نہیں۔ جو مسلک رسالتؐ و تعلیمات نبویؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہٹا ہوا ہو۔ غیر شرعی تصورات ومراقبات، ریاضت وطرق سے حاصل کی ہوئی نام نہاد" روحانی صفائی، اور قلبی طہارت قطعاً دھوکہ وفریب، حقیقتاً ظلمت وسیاہی اور شرعاً مردود اور عنداللہ غیر مقبول

ہے۔ اسی قسم کی غیر شرعی مجاہدات سے حاصل کی ہوئی نورانیت نما ظلمت اور طہارت نما گندگی ذات ربانی سے دوری کا سبب، ان کے قرب و رضا سے بعد کا ذریعہ اور معرفت وایقان سے محرومی کی وجہ تو یقیناً ہے۔ لیکن مقصودہ و مطلوبہ تزکیۂ باطن اور صفائی نفس ہرگز نہیں۔ اسی مفہوم کی تعبیر حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے کمالِ بلاغت اور ایجاز کے ساتھ اس شعر میں فرمائی ہے۔

شعلے اٹھیں ہزار تجلّی مگر کہاں
یہ آگ ہے ضرور مگر طور کی نہیں

مبتدعانہ و عامیانہ تصوّف

اسلامی سلوک و تصوف جانِ ایمان اور روح دین ہے لیکن بقول حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ "طریق و سلوک کے اسرار و رموز اس قدر دقیق و نازک ہیں کہ ذرا ان کے سمجھنے میں بے احتیاطی کیجائے تو ہدایت کی بجائے وہ ضلالت کا ذریعہ بن جائیں عارف شیراز نے کیا خوب کہا ؎

ہزار نکتہ باریک تر زمو اینجاست نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

خدا کی شان ہدایت ربانی کا وہ قدسی سلسلہ جو سینہ نبوت کے فیوض و برکات کا حامل اور تزکیہ کی سنت کا علمبردار اور کمالِ احسان و تقویٰ کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اسے حقیقت ناآشنا متصوفین اور مبتدعین کے گم کردہ راہ طبقہ نے کسبِ دنیا کے فنون میں سے ایک فن سمجھ لیا، اور اس کے مبادی، غایات، مقاصد و اصول کو بھلا کر اسے ایک ایسا مدرسۂ فکر و نظر اور طریقۂ عمل بنا لیا جو قابلِ رد و بطلان خرافات و بدعات کا مجموعہ ہے اور اسلامی سلوک کے جہانتاب چہرہ پر ایسے تو بر تو حجابات ڈال دیئے کہ ایک بڑے طبقہ کی نگاہوں سے سلوکِ نبوت کا حسن و جمال چھپ کر رہ گیا اور ایک ایسا منہاج و طریق جو ہر مسلمان کی ظاہری و باطنی اصلاح کا کفیل تھا، اس کی حقیقت تر دامن رنگے ہوئے نام نہاد صوفیہ کی جہالت و حق ناشناسی اور اعمال غیر شنیعہ کی بناء پر اکثر طبقات امت کی نگاہوں

سے گم ہوکر رہ گئی، اور انہوں نے تصوف کو غیر اسلامی اعمال واشغال یا دنیاداری ونفس پروری کا دھندہ سمجھ لیا۔ اور وہ اصل سلوک کی برکات سے محروم ہو گئے۔

اس راہ میں سب سے بڑی ضلالت فن کے غایات و مقاصد اور اسکی روح در حقیقت کے نہ سمجھنے سے آئی، یونانی وعجمی، ہندی وایرانی علوم، الہیاتی نظریات، اخلاقی تصورات اور ذہنی وفکری سرمایہ نے جب مسلمانوں میں بار پایا، اور مختلف مذاہب وادیان کے مجاہدات رہبانی، کلیسائی اشراقی و رواقی جوگیانہ اور ویدک ریاضات مسلمانوں کی نگاہوں میں آئے۔ اور جب عجمی نفس کشی، ترک دنیا، تجرد، گوشہ گیری، عزلت نشینی اور قطع علائق کے مناظر کو انہوں نے دیکھا تو متعززین ومتصوفین کا ایک طبقہ اس تلمیع و دھوکہ پر اصل وحقیقت کا گمان کر بیٹھا۔ اور رفتہ رفتہ اسلامی تصوف و سلوک کے جو مقاصد تھے یکے بعد دیگرے انکی نگاہوں سے گم ہوتے چلے گئے۔ اور کسی نے سلوک کو محض ایک 'نظریہ' اور 'طریقہ فکر' سمجھ لیا، کسی نے 'مراقبات' پر قناعت کرلی کسی نے 'ترک دنیا'، 'عزلت نشینی' اور قطع علائق کو مقصد گردانا۔ کوئی 'اوراد و وظائف' کے ایک خاص نصاب ہی کو حاصلِ طریق سمجھا، کسی کی 'نظر' مکاشفات ومواجید' 'الہام ورؤیا' کے 'نورانی حجابات' میں اٹک کر رہ گئی، کوئی اسے باطنی سینہ بسینہ راز سمجھا، کسی نے ہمہ اوست، کی غیر شرعی تعبیرات کو اپنا مدعا قرار دیا، کوئی 'اعراس وقوالی، مزارات کی حاضری کو ہی تصوف سمجھا۔ کسی نے متعین 'صوفیانہ' رسوم واشغال میں کمال جانا، کوئی ذرائع کو مقصد سمجھنے کی مہلک غلطی میں گرفتار ہوگیا۔ اور کسی نے شریعت وطریقت کی دوئی کا فسانہ تراش لیا۔

غرض سلوک کے جو غایات و مقاصد تھے ایک کثیر طبقہ اسے بھلا بیٹھا۔ اور خود تراشیدہ غیر شرعی، رسوم و قیود، اشغال و طرق، نظریات و تصورات کو سلوک قرار دے دیا۔

حضرت سید الملت قدس سرہ اپنے شیخ باکمال حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کی جو سوانح لکھنا چاہتے تھے اس کے مقدمے میں شیخ وقت علامہ تھانویؒ کی تجدیدی مساعی کا تذکرہ کرتے ہوتے "حقیقتاً تصوف کا مکتشف اعظم اور فنِ حصول احسان و تقویٰ کا مجدد کامل" کے عنوان سے تصوف و سلوک کی کسمپرسی و غربت کا جو نقشہ کھینچا ہے قابل دید ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"......... یہ کہنا گویا صحیح ہے کہ اس (حضرت تھانوی) کو تمام دوسرے علمی و عملی کمالات دیئے ہی اسلئے گئے تھے کہ اس فن (تصوف و سلوک) کی تجدید ہو۔ جو دنیا میں کسمپرسی کی حالت میں اور ہندوستان میں بہ حالتِ غربت تھا، جسکی حقیقت پر توبرتو پردے پڑ گئے تھے اور جس پر بدعات کی ظلمت غالب آگئی تھی۔ اور جو دکاندار صوفیوں کے ہاتھوں دنیا داری اور کسب معاش کے فنون میں سے ایک فن کی حیثیت میں آگیا تھا اور جہاں اسکا وجود تھا بھی، وہ یا محض چند فلسفیانہ خیالات کا مجموعہ ہو کر رہ گیا تھا یا اوراد و وظائف کے ایک نصاب کا، سلف صالح نے اس فن کے جو ابواب و مسائل منقح کر کے لکھے تھے، وہ بالکل ہی فراموش ہو گئے تھے۔ اور خصوصیت کے ساتھ سلوک کی حقیقت و غایت بالکل چھپ گئی تھی۔ اور جہاں کسی قدر اس کا نام و نشان تھا، وہاں علم میں وحدۃ الوجود یا

یا وحدۃ الشہود کی ناقابل افہام وتفہیم بلکہ ناقص تعبیر پر، اور اعمال میں صرف ذکر وفکر و مراقبہ کے چند اصول پر پوری قناعت تھی، بدعات نے دین کا نام اور رسوم نے سلوک وتصوف کی جگہ حاصل کرلی تھی طریقت اور شریعت کو دو متقابل حریف ٹھہرا کر ان میں سے ایک کو گرانے کی کوشش کیجا رہی تھی۔ عام صوفیوں کی زبانوں پر چند جاہلانہ فقرے اور چند مبتدعانہ اصول واعمال رہ گئے تھے، جن کو طریقت کا نام بخشا گیا تھا۔

صوفیانہ خانوادوں کی جہالت اور موروثی گدی نشینی کی متواتر رسم نے اللہ تعالیٰ کی بخشش اور اجتباء اور مقبولیت کو بھی ایک صنعت گری کا کارخانہ بنا رکھا تھا۔ خانقاہوں کا کام صرف اعراس وفاتحہ کا اہتمام اور سماع ورقص وقوالی کا انصرام رہ گیا تھا، مقررہ دنوں اور مہینوں میں کچھ لوگ جمع ہوکر فاتحہ خوانی کرلیں، مٹھائی کھالیں اور ایک جگہ بیٹھ کر کسی سازندہ کے ترانے پر ہوحق کرلیں، اور زیادہ بڑھیں، تو وحدۃ الوجود کی اُڑ یکچر کر شوخی وبیباکی اور رندی کے اشعار ومضامین پڑھ لیں، اور سر دھن لیں، چند سینہ بسینہ راز تھے، جن کو بے سمجھے بوجھے بار بار دہرایا جارہا تھا، تصحیح عقائد، تحسین عبادت، اتباع سنت، اصلاح اعمال اور ادائے حقوق عباد جو اصل دین اور صحیح سلوک تھا وہ ہر جگہ سے مٹ چکا تھا، علمائے ظاہر چونکہ باطن کے منکر تھے، یا باطن سے ناآشنا تھے، اسلئے ان کے پند ونصائح کی حیثیت صوفیوں میں تقبیح ناشناس سے زیادہ نہ تھی۔ اور یہ سمجھا جاتا تھا، کہ وہ چونکہ طریقت کے اصل راز سے واقف نہیں، اسلئے ان کی بات سننے کے قابل نہ تھی، اور علمائے ظاہر چونکہ باطن سے منکر یا ناآشنا تھے، وہ ان دکاندار

صوفیوں کو دیکھ کر اصل فنِ سلوک کو ضلالت اور گمراہی قرار دینے لگے تھے اور اس کے اصول و مسائل کو خلافِ شریعت اور مخالف کتابُ سنت سمجھتے تھے۔

یہ نہیں کہا جاتا۔ کہ علمائے حق اور صوفیائے برحق کا مطلق وجود ہی نہ تھا۔ بے شبہ جابجا صحیح و صالح بزرگوں کے سلسلے قائم تھے کہیں کہیں ان کے فیوض و برکات بھی جاری اور ان کی تعلیم و تربیت کی برکت بھی عیاں تھی، لیکن یہ جو کچھ تھا۔ خواص کیلئے تھا۔ اور محدود حلقوںمیں تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اشخاص کی تلقین و ہدایت تو ہو رہی تھی مگر تدوین فن، ترتیب اُصول تحقیق مسائل، تالیف رسائل، اصل سلوک کے مضامین کو کتاب و سُنت کی اور سلف صالحین اور اولیائے کاملین کی تشریح و توضیح سے ملا کر دیکھنے کے کام کہیں نہیں ہو رہے تھے۔ اور نہ خطب و مواعظ اور تحریر و تقریر کے ذریعہ عوام کے خیالات کی اصلاح کی کوشش کیجا رہی تھی، اور نہ ردِّ شبہات، دفع شکوک، رفع اوہام کیلئے، کوئی سلسلہ تھا۔ اور نہ سالکین کی ظاہری و باطنی تربیت کی کوئی ایسی درسگاہ تھی۔ جس میں راہ کی مشکلات کو علمی اور فنی طریق سے تبایا اور سکھایا جاتا ہو۔ اور نہ کہیں کوئی ایسی مسند بچھی تھی، جہاں شریعت و طریقت کے مسائل پہلو بہ پہلو بیان ہوتے ہوں۔ جہاں تفسیر و فقہ و حدیث کے ساتھ امراضِ قلب کے علاج کے نسخے بھی تبائے جاتے ہوں، جو کتاب و سنّت میں موجود ہیں۔ جہاں ایک طرف قال اللّٰہ و قال الرسول کا ترانہ بلند ہو، اور دوسری طرف عبودیت و بندگی کے اسرار اور اتباعِ سنت کے رموز بھی

سکھائے جاتے ہوں۔ جس قلم سے احکام فقہی کے فتاوے نکل رہے ہوں اسی قلم سے سلوک وطریق کے مسائل بھی شائع ہو رہے ہوں، جس منبر سے نماز و روزہ اور حج و زکواۃ کے فقہی مسائل و انکشاف بیان کئے جا رہے ہوں۔ اُسی منبر سے اُن کی روحانی حقیقت اور ان کی قلبی ادا کاری کے طریق بتائے جا رہے ہوں، (اللہ تعالیٰ نے اس صدی میں اس کام کیلئے حضرت حکیم الامت مجدد ملت و مرشدی و مولائی مولانا شاہ اشرف علی) علیہ الرحمۃ کا انتخاب فرمایا۔ اور وہ کام ان سے لیا گیا۔ جو چند صدیوں سے معطل پڑا ہوا تھا...... (اور ان کی) اس تعلیم و تربیت، تصنیف و تالیف، وعظ و تبلیغ کی بدولت عقائد حقہ کی تبلیغ ہوئی مسائل صحیحہ کی اشاعت ہوئی، دینی تعلیم کا بندوبست ہوا، رسوم و بدعات کا قلع قمع ہوا، سنن نبوی کا احیاء ہوا، غافل چونکے، سوتے جاگے، بھولوں کو یاد آئی، بے تعلقوں کو اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا ہوا، رسول کی محبت سے سینے گرمائے اور اللہ کی یاد سے دل روشن ہوئے، اور وہ فن جو جوہر سے خالی ہو چکا تھا۔ پھر سے شبلیؒ و جنیدؒ اور بسطامیؒ و جیلانیؒ اور سہروردیؒ و سرہندیؒ بزرگوں کے خزانوں سے معمور ہو گیا رحمہم اللہ تعالیٰ۔ اور یہ وہ شان تجدید تھی۔ جو اس صدی میں مجدد وقت کیلئے اللہ تعالیٰ نے مخصوص فرمائی تھی ؎

این سعادت بزور بازو نیست ـــ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(مقدمہ تجدید تصوف وسلوک ص ۱۴ تا ۱۶ یدایو)

اِس سلسلے میں ایک دوسری جگہ ارقام فرماتے ہیں۔

"...... فقر و تصوف، علم و فن اور تمدن و سیاست زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمان اپنی غرض و غایت اور اصول مبادی کو چھوڑ کر ہندی و عجمی و یونانی و افرنگی تصورِ حیات کی تقلید میں مصروف ہو گئے۔ اور اب تک مصروف ہیں اور اسی کی رونق کو اپنے کاشانہ کی عظمت جانتے ہیں۔ فقر و تصوف میں ہندی و یونانی تصورات جوگ و استشراق کی تقلید ہے، علم و فن میں عجمی و یونانی مذاق کی پیروی ہے۔ تمدن و سیاست میں ایرانی و رومی رنگ کی آمیزش ہے ....

سلوک اور فقر و تصوف جو درحقیقت اعلیٰ دین اور اعلیٰ اخلاق کا اصطلاحی نام تھا۔ وہ ترکِ عمل اور چند رسوم و رواج کا مجموعہ ہو کر رہ گیا، اور پیدائش سے لیکر موت تک کے تمام طرقِ حیات پر بدعات اور رسومِ شرک و کفر کے تو بر تو پردے پڑے ہیں، جن کی بزرگوں کی متروکہ وراثت کے نام سے، ہم اب تک بقا کے درپے ہیں۔"

مبتدعانہ تصوف کے متعلق ایک ناقد سائل کو جواباً تحریر فرماتے ہیں۔

"مبتدعانہ تصوف پر آپ کی تنقید تمام تر درست ہے۔ وحدۃ الوجود کے مسئلہ کی غلط تعبیر نے بہت سی گمراہیاں پیدا کی ہیں۔ لیکن حقیقی اور شرعی تصوف جس کا صحیح نام احسان ہے۔ روح دین اور جان ایمان ہے یہ اخلاص فی اللہ اور تزکیۂ قلب اور علم حصول تقویٰ کا نام ہے۔"

سلوک و تصوف اصلاح نفس کا راستہ ہے۔ اور یہ اصلاح کیونکہ مجاہدہ کے بغیر ممکن نہیں جس کیلئے شرعی مجاہدات قطعاً کافی ہیں لیکن مبتدعانہ تصوف میں کئی بدعات

اور غیر شرعی مجاہدات، مجاہدہ، کو مقصود اصلی سمجھ لینے کی بنا پر در آئے کیونکہ مذاہب باطلہ میں عام خیال یہ تھا۔ کہ بندہ جس قدر اپنے اوپر تکلیف اٹھاتا ہے۔ اسی قدر خدا خوش ہوتا ہے اور وہ اسکی بڑی عبادت شمار ہوتی ہے۔ اسلئے لوگ اپنے جسم کو بڑی بڑی تکلیفیں دیتے تھے۔ اور سمجھتے تھے، کہ جسقدر جسم کو آزار زیادہ دیا جائیگا۔ اسی قدر روح میں زیادہ صفائی اور پاکیزگی آئے گی۔ چنانچہ یونانی فلسفیوں میں اشراقیت، عیسائیوں میں رہبانیت اور ہندوؤں میں جوگ اسی اعتقاد کا نتیجہ تھا۔ کوئی گوشت نہ کھانے کا عہد کرلیتا۔ کوئی ہفتہ میں یا چالیس دن میں ایک دفعہ غذا کرتا تھا، کوئی سرتاپہ برہنہ رہتا اور ہر قسم کے لباس کو تقدس کا ننگ سمجھتا تھا۔ کوئی چلہ کی سردی میں اپنے بدن کو ننگا رکھتا تھا۔ کوئی عمر بھر تک یا سالہا سال تک اپنے کو کھڑا رکھتا تھا یا بیٹھا رہتا تھا اور سونے اور لیٹنے سے قطعاً پرہیز کرتا تھا۔ کوئی اپنا ایک ہاتھ کھڑا رکھتا تھا کہ سوکھ جائے، کوئی عمر بھر تاریک تہہ خانوں میں اور غاروں میں چھپ کر خدا کی روشنی تلاش کرتا تھا، کوئی تجرد اور ترکِ دنیا کر کے اہل و عیال اور زن و فرزند کے تعلق سے نفرت رکھ کر خدا کی محبت کا غلط مدعی بنتا تھا۔ (سیرۃ النبی ج ۵ ص ۴۱)

غرض طرح طرح سے اپنے جسم کو تکالیف دے کر اور لذائذ دنیوی سے کلیتاً محروم رہ کر روح کی بالیدگی اور نفس کے مٹانے کی کوشش کر کے خدا کی رضامندی تلاش کیجاتی تھی۔

سلوک و تصوف پر جب بیرونی اثرات نے سایہ ڈالا۔ تو بعض حقیقتِ سلوک سے ناآشنا طبقات نے اِس قسم کی ریاضات کو مقصد سمجھ کر اپنالیا، اور اسلامی سلوک کی سیدھی سادی شاہراہ "عجمی نفس کُشوں" سے تنگ اور محدود ہو کر رہ گئی۔ محقق صوفیہ نے بعض اوقات خاص حالات میں بعض طالبین کی تربیت میں محض عارضی علاج اور تدبیر کے طور پر بعض مباح مجاہداتِ شاقہ اور اشتغال غیر مسنونہ کو اختیار کیا ہے۔ لیکن حقیقت

ناآشنا ظاہر بین جاہل صوفیہ ان معالجات وتدابیر اور رسوم ہی کو اصل سلوک مقصدِ تصوف اور طریق کا جزو لاینفک سمجھ بیٹھے اور اپنے کاشانہ کی رونق اسی متاع کاسد کو سمجھے۔ اور بقول سیدی قدس سرہٗ "تصوف کا ناس کر دیا"

اسی طرح مکاشفات، مواجید، کرامات، الہام اور رویاء وغیرہ غیر اختیاری امور کو سلوک کا حاصل اور مقصد قرار دے دیا۔ یہاں تک کہ تصوف کی عامیانہ کتابیں اور عام صوفیہ کی مجالس محض کشف وکرامات کے قصوں سے معمور ہو گئیں حالانکہ یہ اُمور قطعاً مقاصد تصوف میں سے نہیں طریق کے ثمراتِ عاجلہ ہیں جو اگر کسی کو شریعت کے اتباع میں اور اس کے مطابق حاصل ہوں تو محمود ہیں۔ لیکن مقصود نہیں۔ کہ اصل مقصد کمالِ اتباع نبوتؐ سے رضائے حق کا حاصل کرنا ہے۔

غرض گوناگوں اسباب وعوامل نے متبدعانہ اور عامیانہ سلوک کو ایسے رنگ میں رنگ دیا۔ کہ وہ بطلان وگمرہی کا قابل رد مجموعہ بن گیا۔ جس کے آئینہ میں مہر نبوت کی کوئی جہانتاب کرن نظر نہیں آتی۔

اس کا یہ مقصد نہیں۔ کہ اسلامی سلوک وتصوف کا چشمۂ حیواں اس ظلمات میں قطعاً خشک اور گم ہو کر رہ گیا۔ بحمداللہ تعالیٰ ہر زمانہ میں اہل حق صوفیہ اور سالکین کا ایک ایسا طبقہ ہمیشہ موجود رہا، جنکے سینے انوارات نبوت سے روشن، جنکے قلوب فیوض وبرکاتِ رسالت سے مستنیر اور جنکی خلوت وجلوت شریعت وطریقت کی یکجائی ویگانگت اور کمالِ اتباع سنت کا منظر پیش کرتی رہی۔ اور یہی لوگ حقیقت میں ورثائے نبوت تھے اور انہی کے ذریعہ سے ہر زمانہ میں ہدایت کا الٰہی سرچشمہ جاری رکھا گیا۔ اور قلوب کی

کھیتیاں سیراب وشاداب ہوتی رہیں۔ ہدایت ربانی کی انہیں متبع سنت قندیلوں کے نور سے کاشانہ اسلام کی روشنی باقی رہی، اور نیابتِ نبوت کے فرائض بطریق احسن پورے ہوتے رہے۔ اور انسانیت ہدایت ربانی، برکات نبوت، تعلیم کتاب وسنت، تزکیہ و تربیت سے فیضیاب ہوتی رہی، صحبت نبوت کا یہ الٰہی سلسلہ اور تزکیہ قلوب و تطہیر نفوس کا ربانی نظام 'ختم نبوت' کی برکت سے دائمی و ابدی ہے۔ الحاد و زندقہ بدعات و رسوم کی آندھیاں اس 'سراج منیر' کو گل نہیں کر سکیں۔ اور یہ خدائی چراغ 'ربانیین' کے قلوب میں برابر روشن اور عالم کو اپنے نور سے منور کرتا رہا ہے۔ اور انشاالله تعالیٰ ہمیشہ روشن کرتا رہے گا۔ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُورِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ

ان زندہ اور مبارک ہستیوں کے علاوہ اسلامی سلوک و تصوف کا تحریری سرمایہ بھی کم وبیش ہر زمانہ میں حیطۂ تحریر میں آتا رہا ہے۔ جس سے صحیح اسلامی تصوف کی حقیقت متلاشی اشخاص کو ملتی رہی ہے۔

حضرۃ الشیخ نوراللہ مرقدہ مولوی مسعود عالم ندوی مرحوم کو ارقام فرماتے ہیں :۔

"ابھی اتفاق سے مجموعہ احادیث نجدیہ نظر سے گزرا، جس میں امام ابن حنبل کی کتاب الصلوٰۃ اور ابن قیم کی الوابل الصیب فی الکلم الطیب دو کتابیں بھی ہیں۔ ان دو بزرگوں نے جو کچھ کہا ہے۔ اس سے زیادہ تصوف حقیقی سے کچھ اور مراد نہیں اگر کچھ رموز وارشادات ان کی تائید میں کسی نے کہہ دیئے ہیں۔ تو وہ حواشی ہیں باقی شرکیات و بدعات تو ان کا ذکر ہی کیا، لیکن جسطرح مسلمانوں کو دیکھ کر اسلام پر آج حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ ایسے ہی بازاری دکاندار رنگے ہوئے صوفیوں کو

دیکھ کر تصوف کو بدنام نہ کیجئے"۔ (مکاتیب سلیمان ص۱۶۶)

ایک دوسرے گرامی نامہ میں انہی کو لکھتے ہیں۔

"سلوک کے متعلق آپ نے بدعت وسنت کی جو بحث نکالی ہے یہ محض خشک مزاج اہل حدیث کا شیوہ ہے۔ آپ ابن قیم، مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، مولوی سید احمد بریلوی، شاہ اسمٰعیل شہید وغیرہ کو کیا کہیں گے، کیا وہ بھی متبعین بدعت میں تھے، صراط مستقیم ہی کو غور سے پڑھ لیجئے" (مکاتیب سلیمان ص۱۵۱، ۱۸۰)

ایک اور مکتوب میں مسعود عالم صاحب کے تصوف کے متعلق بعض شبہات کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

(ذکر وشغل میں) غیر ماثور طریقے ہرگز اختیار نہ کریں۔ مگر ماثور وغیر ماثور کی تحقیق کرلے

شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مردِ فقہ وحدیث کلام واسرار ورموز شریعت ہیں۔ تصوف کی کتابوں میں ان کا پایہ ان کے دوسرے علوم کے مطابق نہیں ہے اس لئے ان سے نہ گھبرائیے۔ اور نہ ان کی صوفیانہ کتابوں کی طرف توجہ کیجئے" (مکاتیب سلیمان ص۱۶۹)

تاہم اس بات سے انکار کی گنجائش نہیں۔ کہ اسلام میں فلسفیانہ اور مبتدعانہ سلوک کی پیدائش اور شیوع نے صحیح اور اصل اسلامی سلوک کے متعلق بھی طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا کر دیئے۔ یگانوں اور بیگانوں کے حقیقت ناآشنا متعدد طبقات کیلئے حق وباطل میں فرق کرنا مشکل ہوگیا۔ اشتباہ والتباس کی بنا پر اصل ونقل میں تفرقہ اور تمیز کی لکیر کھینچنی دشوار ہوگئی، اور وہ ملحدانہ اور عامیانہ تصوف کے تو بر تو اندھیروں

میں حقیقی اسلامی سلوک کی روشنی کے پانے سے قاصر رہے اور اس مہلک غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے ۔کہ فلسفیانہ اور مبتدعانہ نام نہاد تصوف کے نظریات و تصورات و اشغال و اعمال اور رسوم ہی اصل اسلامی سلوک' کا سرمایہ ہے ۔نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقت طریق سے ناواقف مستشرقین اور ان کے مقلدین وہمنواؤں نے تصوف کو غیر اسلامی بیرونی عقائد و تصورات، مسیحی رہبانیت، یونانی فلسفہ، نوافلاطونی نظریات اشراقی و رواقی ریاضات ہندی جوگ و ویدانت اور عجمی خیالات سے ماخوذ بتایا، اور 'سلوک' کو اسلام کی ذاتی ملکیت ماننے سے انکار کردیا۔ خود مسلمانوں کا ایک کثیر طبقہ فلاسفہ متصوفین اور رنگے ہوئے صوفیہ کے ملحدانہ اور مبتدعانہ عقائد و اعمال کو دیکھ کر سلوک سے متوحش و منحرف ہوگیا۔ اور اسے بدعت سمجھ کر اسے 'شجرِ ممنوعہ' قرار دے دیا، اور طریق (جو جان ایمان، روح دین، اور کمالِ تقویٰ و احسان کا دوسرا نام تھا) ـــ کی برکات سے محروم ہو کر رہ گیا۔ یورپ میں اسلامی تصوف کے ماہر مستشرقین میں آنجہانی نکلسن اور ماسینیان فرنساوی اس موضوع پر سند و امام سمجھے جاتے ہیں۔ ان دونوں کی تحریروں نے خاص کر ماسنیان کی تحقیقات نے ناواقف مستشرقین کی اسلامی تصوف کے متعلق غلط فہمیوں کا ایک حد تک ازالہ کردیا ہے۔ تاہم ہنوز ایک کثیر طبقہ اسلام میں اسے ایک اجنبی اور آوردہ پودا ہی سمجھتا ہے۔

جون ۱۹۲۳ئہ میں ڈاکٹر نکلسن کے ایک مضمون کا ترجمہ رسالہ معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوا تھا (یہ مضمون ڈاکٹر صاحب موصوف نے ۲۵ فروری ۱۹۲۳ئہ کو مسلم الیوسی ایشن کیمبرج میں پڑھ کر سنایا تھا۔) اس میں نکلسن نے لکھا تھا کہ :-

"میرے خیال میں تصوف ابتداءً اور اصولاً اسلامی ہے۔ البتہ اثنائے ترقی

میں جن جن چیزوں سے ملا ان سے متأثر ضرور ہُوا۔"

حضرت الشیخ علّامہ ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس زمانہ میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"ہم مسلمان ڈاکٹر صاحب کے اس خیال کے ممنون ہیں کہ "اسلامی تصوف" دوسرے مذاہب کا سرقہ نہیں۔ جیساکہ عام طور پر نا آشنائے تحقیق علمائے یورپ کا بیان ہے۔ بلکہ وہ اس کو اسلام کی ذاتی ملکیت سمجھتے ہیں۔ اور اس کا مأخذ وہ قرآن وحدیث کو خیال کرتے ہیں۔ لیکن اتنا مانتے ہیں۔ کہ بعد کو اِس اسلامی تصوف میں دوسرے مذاہب کے تصوّف کے بھی کچھ اجزا شامل ہوگئے ہیں۔ یہ خیال صحیح ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اِس نظریہ کے اثبات کیلئے پورے مواد کو استعمال نہیں کیا

آئمہ تصوف علمائے اسلام کی کتابیں مثلاً امام قشیریؒ کا رسالہ قشیریہ ابو طالب مکیؒ کے قوت القلوب، امام غزالیؒ کی احیاء العلوم، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی غنیتہ الطالبین شیخ سہروردی کی فتوح الغیب، شیخ ابونصر سرّاج کی کتاب اللمع، شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات وغیرہ کتابوں کا ایک ایک حرف اس نظریہ کیلئے دلیل وبرہان ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغۃ میں بذیل باب الاحسان اس باب میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ مطالعہ کے لائق ہے" (معارف صفحہ $\frac{405}{6}$ ج ۱۱ ماہ جون ۱۹۲۳ء)

مخدومی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی کتاب "تصوف اسلام" جب پہلی مرتبہ چھپی تو اس پر سید صاحبؒ نے مئی ۱۹۲۵ء میں تبصرہ لکھا تھا۔ یہ کتاب مولانا دریابادی کے ان تبصروں اور مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو انہوں نے وقتاً فوقتاً مندرجہ ذیل کتابوں اور ان کے

مصنفین کرام پر لکھے (۱) کتاب اللمع (شیخ ابونصر سراجؒ) (۲) کشف المحجوب (شیخ علی عثمان ہجویریؒ)
(۳) رسالہ قشیریہ (امام قشیریؒ) (۴) فتوح الغیب (شیخ عبدالقادر جیلانیؒ)
(۵) عوارف المعارف (شیخ شہاب الدین سہروردیؒ) (۶) منطق الطیر (شیخ عطارؒ) (۷) لوائح (مولانا جامیؒ)

حضرت سید صاحبؒ تبصرہ میں لکھتے ہیں :-

ان (مذکورۃ الصدر) کتابوں کے مصنف اپنے اپنے عہد کے مشہور شیخ اور فن تصوف کے مستند ترین معلم اور امام ہیں۔ اس لئے ان کتابوں میں تصوف کی جس طرح تشریح کی گئی ہے۔ اور جن حقائق کو سپرد قلم کیا گیا ہے۔ اور تصوف کے جن مقامات و منازل کو انہوں نے بتایا ہے (زیر تبصرہ کتاب میں) ان کو نہایت بسط کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ان تفصیلات سے یہ چیز آئینہ ہو جاتی ہے۔ کہ خواص کے نزدیک اصل تصوف کیا ہے۔

اس کے ضروری اجزاء کیا ہیں۔ اور اس کی تعلیمات کیا ہیں ...... آج کل جب تصوف ایک قسم کا فلسفہ اور نظریہ اور چند الفاظ کے گورکھ دھندے کا نام رکھ لیا گیا ہے اس کو شاعرانہ تخیل اور قصص و حکایات کے ذریعہ سے صرف زبان و قلم کی لذت کا سامان کر دیا گیا ہے اور یہ سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے۔ کہ یہ حقیقتِ باطنی ہے اور شریعتِ ظاہری اور چیز ہے۔ ان کتابوں کے مطالب کی روشنی میں معلوم ہوگا۔ کہ تصوف سراپا عمل ہے۔ اور قلب و روح کے علم و عمل اور مغز شریعت کی اصل تعلیم و تعمیل ہے ...... (اور ان کتابوں سے) یہ بھی کھل جاتا ہے۔ کہ ان بزرگانِ دین کے ناموں سے جو کچھ کہا جاتا ہے۔ اور جو کچھ حقیقت میں وہ کہتے ہیں۔ ان میں کتنا فرق ہے۔

ان (کتابوں کے) مصنفین میں سے ہر بزرگ (اپنے اپنے مرتبہ کے لحاظ سے اولیائے

کاملین میں داخل ہیں)۔ ان میں سے متعدد بزرگ تصوف کے متعدد خانوادوں اور طریق تعلیم کے بانی ہیں ......" تصوف اسلام" کے فاضل مصنف نے .... ان کے (جو) معتبر سوانح، اور عالمانہ حالات اور ان کی تعلیمات و کیفیاتِ روحانی کو ..... پیش کیا ہے اس سے یقین آجاتا ہے کہ تصوف اسلام کا حقیقی سرچشمہ یقیناً کتاب الٰہی اور سنت نبویؐ ہے۔" (رسالہ معارف ص ۳۹۴ و ۳۹۵ نمبر ۵ ج ۱۵)

یہ تو نومبر ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۵ء کی بات تھی۔ ماہ فروری ۱۹۴۴ء میں حکیم الامتؒ کے آثار علمیہ کے عنوان سے جو مقالہ سپردِ قلم فرمایا۔ اس میں شیخ وقت حکیم الامت مولانا تھانویؒ رحمہ اللہ تعالیٰ کی سلوک کے بارے میں تجدیدی مساعی کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"علم سلوک و تصوف روح شریعت کا نام ہے۔ جس میں اخلاصِ دین اور اعمال قلب کے احکام اور دقائق سے بحث کی جاتی ہے۔ قدماءِ صوفیہ نے اس فن پر جو کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً رسالۂ قشیریہ امام قشیریؒ، قوت القلوب ابوطالب مکیؒ، کتاب اللمع ابونصر عبداللہ بن علی سراج الطوسیؒ، کتاب الصدق ابوسعید خزازؒ، فتوح الغیب شیخ سہروردیؒ اور غنیۃ الطالبین شیخ عبدالقادر جیلانیؒ۔ انکو پڑھنے سے اس فن کی جو حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ افسوس ہے۔ کہ مصنوعی اور دوکاندار صوفیہ اور مبتدعہ کی تلبیس نے اس پر ایسا پردہ ڈال دیا تھا۔ کہ وہ کبھی تو بدعات کا مجموعہ، بلکہ بطلان و ضلالت کا ذخیرہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر ہندوستان میں ہندؤں کے جوگ اور ویدانت کے اثر سے، اس میں بہت سے ایسے مسائل شامل ہو گئے جو اسلام کی روح کے تمام تر منافی ہیں۔ حتّٰی کہ وحدت وجود و وحدت شہود و لطائف و دوائر کے مباحث و اعمال بھی اصل فن سے الگ ہیں۔ گویا

تو علم کلام و فلسفہ یا اوہام و خیالات و احوال سے وابستہ ہیں۔ جنکا تعلق نفسیات سے ہے
اصل شے جو اخلاص فی الدین، طلبِ رضا، حصولِ قرب اور اعمال و اخلاق قلب و مقامات ہیں۔ اور جن سے مقصود رذائل سے پاکیزگی، اور فضائل سے آراستگی ہے تمام تر متروک ہوگیا تھا........ جاہل پیروں اور دکاندار صوفیوں نے ایک مسئلہ یہ گھڑا ہے۔ کہ شریعت اور طریقت دو چیزیں ہیں۔ اور اس زور شور سے اِس کو شہرت دی۔ کہ عوام تو عوام خواص تک پر اس کا رنگ چھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ تمام تر لغو اور بے معنٰی ہے۔ حضرت حکیم الامت نے تمام عمر لوگوں کو یہی تلقین فرمائی کہ طریقت عین شریعت ہے احکام الٰہی کی باخلاص تمام تعمیل و تکمیل ہی کا نام طریقت ہے۔ وگرہیچ، اور یہی خواص امت کا مذہب ہے۔ اور جس نے اس کے سوا کہا۔ وہ دین کی حقیقت سے جاہل اور فن سلوک سے ناآشنا ہے۔ اس بارگاہ کے ایک حلقہ بگوش کا شعر ہے

اب تو مے نوشی ہے عین شرع بر فتوائے شیخ
اب وہی ہوگا فقیہہ شہر جو مے نوش ہے۔"

(معارف ص ۱۰۶/۱۰۷ نمبر ۲ ج ۵۳، ماہ فروری ۱۹۴۴ء)

غرض اصل اسلامی سلوک کو حضرت الشیخ قدس سرہ خالص اسلامی تعلیمات پر ہی مبنی اور مشتمل سمجھتے تھے۔ اسلئے جب بعض طبقات نے اسلامی تصوف جوگ اور ویدانت سے ماخوذ بتایا۔ تو حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے کمالِ حمیت و متانت کے ساتھ تحریر فرمایا:۔
" اِسی طرح اسلامی تصوف کو 'جوگ' اور 'ویدانت' سے ماخوذ بتانا محض یورپ کی آواز کی نقالی ہے۔ جس کو اسکا دعویٰ ہو۔ اس کو چاہیئے کہ ائمہ تصوف کے

رسائل و مسائل کے حوالہ سے اس کو ثابت کرے۔ اگر کسی نے 'جوگ' کا ایک آدھ شغل اختیار کر لیا ہو۔ تو اس سے پورا علم اور پورا فن تو جوگ نہیں ہو جائیگا۔ کیا طبیبوں نے اگر بیدک کے ایک دو نسخے اپنی کتابوں میں لکھ دیئے۔ تو اس سے پورا فن طب 'بیدک' ہو جائیگا۔"

(مقدمہ مولانا سندھی اور انکے خیالات پر ایک نظر ص۱۰ الف)

سلوک کی جامعیت اور اجتماعی حقوق و فرائض

گذشتہ اوراق میں بنی آدم کی جس شاہراہِ معرفت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ سلوک کی ہمہ گیری و جامعیت اور وسعت ہے۔ جس میں انسانی زندگی کا جز و کل سمایا ہوا ہے۔ اور جو اس کی ہر حرکت و سکون اور فکر و عمل پر چھایا ہوا ہے۔ اور اس کے تمام انفرادی و اجتماعی، ظاہری و باطنی، مادی و روحانی حقوق و فرائض، کوائف و وظائف کو گھیرے ہوئے ہے۔ سلوک محض چند عبادات و اذکار، رسوم و اوراد کا نام نہیں۔ بلکہ انسان کا سلوک زندگی کے ہر شعبہ اور گوشہ میں طے ہوتا ہے۔ اور اسکی ساری زندگی پیہم مجاہدہ، سراپا عبدیت اور ہمہ تن دین بن جاتی ہے ؎

ہمہ دیر تختہ گل ز جبین سجدہ ریزم
کہ نیاز من نگنجد بدو رکعت نمازے

اس لئے احکام الٰہی کا وہ حصّہ جو انسانی اجتماعی زندگی سے متعلق ہے سلوک کے دائرے سے خارج نہیں ہو سکتا۔ اور اس طریق کے راہی کیلئے اجتماعی حقوق و فرائض کی ادائیگی سے مفر اور انسانی و ملّی ذمہ داریوں سے گریز کی صورت ممکن نہیں۔ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو کوہ و دشت کی عزلت نشینی میں جنت کا سراغ نہیں بتایا۔ بلکہ انہوں نے احد کے کارزار

میں جنت کی خوشبو سونگھی۔ اور 'الجنۃ تحت ظلال السیوف' کا مژدہ سنا، اسلام کی رہبانیت — (اگر اسی کا نام رہبانیت ہے) — ترک عمل و سعی نہیں، بلکہ دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کیلئے جہد و جہاد ہے۔

رھبانیۃ ھذہ الامۃ الجہاد — اس امت کی رہبانیت اللہ کے راستے

فی سبیل اللہ (کنز العمال بحوالہ احمد عن انس ص۲۵۷ ج۲) میں جہاد و کوشش ہے۔

مصلحت در دینِ عیسیٰ غار و کوہ — مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کا اسوہ اسی سلوک کا عملی نمونہ اور اسی طریق کا داعی تھا۔ اسلامی صحیفہ آسمانی نے معیتِ نبوت کا ثمرہ و نشان قوت و رحمت، عبودیت و عبدیت، افتقار و ابتغاءِ فضل و رضوان کے انہیں مظاہر کو بتایا ہے۔ جو جلال و جمال کی صفاتِ الٰہیہ کا جامع اور کامل عکس و ظلال تھا ارشاد ہے:۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ۭ وَالَّذِیْنَ	محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔
مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ	اور جو لوگ آپکی معیت میں (اور آپکے صحبت یافتہ)
بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا	ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں تیز ہیں۔ اور
يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا	آپس میں مہربان ہیں۔ اے مخاطب تو انہیں
سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ	دیکھے گا۔ کہ کبھی رکوع کر رہے ہیں کبھی سجدہ
اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي	کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی
التَّوْرٰىةِ (الفتح ـ ۴)	جستجو میں لگے ہیں۔ ان کے آثار بوجہ تاثیر

سجدہ کے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔ یہ ان کے اوصاف تورات میں ہیں۔

گویا اسلامی طریق کی جامعیت کی نشانی توراۃ میں بھی یہی بتائی گئی تھی کہ امت محمدیہ کا سلوک خلق سے گوشہ گیری اور عزلت نشینی نہیں ہوگا۔ بلکہ کمالِ بندگی و عبودیت، تعلق مع اللہ، محبت الٰہی اور ذات حق میں اشتغال انہی بندوں میں رہتے ہوئے نصیب ہوگا۔ اور دلدارِ ازل کی محبت، طلب اور سرشاری انہیں بندوں کے حقوق سے غافل نہیں کرے گی۔ وہ جلال و جمالِ ربانی کا مظہر بن کر نائبِ حق کی حیثیت سے انسانوں کے حقوق کی ذمہ داریوں کو نبھائیں گے ؎

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود — فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب

کہ اسلام رہبانیت کا داعی نہیں بلکہ 'ربانیت' (اللہ والاپنے) کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن کریم کس بلند آہنگی سے پکارتا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ	کسی آدمی سے یہ بات نہیں ہوسکتی
وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ	کہ اللہ تعالیٰ اسے کتاب اور فہم اور
لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ	نبوت عطا فرماویں۔ پھر وہ لوگوں
اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا	سے کہنے لگے۔ کہ میرے بندے بن
كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا	جاؤ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر، ولیکن کہے گا کہ
كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (آل عمران-۱۸)	تم لوگ اللہ والے (ربانی) بن جاؤ بوجہ اسکے تم کتاب سکھاتے ہو اور بوجہ اسکے کہ تم پڑھتے ہو

اور اللہ والوں کے اوصاف اس کی ربانی کتاب میں محض انفرادی تزکیۂ و خلوت نشینی نہیں بلکہ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے عرصۂ پیکار میں شمشیر و سنان سے دو بدو ہونا، قتال اور دائمی جہد و جہاد بھی ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے ۔

وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قٰتَلَ لا	اور بہت نبی ہو چکے ہیں جن کے ساتھ ہو کر
مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ ج فَمَا	بہت بہت اللہ والے لڑے ہیں
وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي	سو نہ تو ہمت ہاری انہوں نے ان
سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَ	مصائب کیوجہ سے جو ان پر اللہ کی راہ
مَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ	میں واقع ہوئے اور نہ وہ دبے،
الصَّابِرِينَ (آل عمران۔۱۵۰)	اور اللہ تعالیٰ کو ایسے مستقل مزاجوں سے محبت ہے

اسلئے اسلام کی بقا و حفاظت، اشاعت و فروغ، اور اقامت دین کی جملہ شرعی انفرادی و اجتماعی کوششیں "تزکیۂ نفس اور اصلاح باطنی سے لیکر دعوت و تبلیغ تک، اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے جہد و جہاد سے لے کر سیاست عادلہ و قتال فی سبیل اللہ تک سلوک ہی کی گھاٹی کی مختلف منازل ہیں۔ انہیں اسلامی سلوک کے دائرے سے خارج سمجھنا دین و شریعت، سلوک و طریقت اور اسلام کی جامعیت و ہمہ گیری سے ناآشنائی کی دلیل ہے۔ اِس بنا پر سلوکِ سلیمانی میں ارشاد و ہدایت و تزکیہ باطنی کے علاوہ دعوت و تبلیغ، اسلامی سیاست عادلہ کی رہنمائی اور مجاہدانہ اور سپاہیانہ زندگی کی تلقین بھی شامل تھی۔ جس کا خانقاہی زندگی میں عموماً گذر نہیں ہوتا۔

سلوک کی ہمہ گیری وجامعیت کی وجہ

یہ حقیقت واضح ہو چکی۔ کہ اسلامی سلوک صرف ' انفرادی مجاہدۂ، نفس واصلاح باطنی میں محصور نہیں۔ بلکہ اسلامی شاہراہ معرفت جملہ انفرادی و اجتماعی احکام پر محیط اور تمام ملی و دینی ذمہ داریوں اور حقوق و فرائض پر حاوی ہے۔ سلوکِ (سلیمانی) کی یہی ہمہ گیری ہے جو اسے دگر مسالک و طرق سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔ بات یہ ہے کہ امت مسلمہ کا اپنا خاص مزاج اور انسانی ذمہ داریوں کے متعلق خصوصی نظریہ ہے۔ جس کی بنا پر گوشہ گیری، تجرد، رہبانیت، مخلوق سے کنارہ کشی اور انسانی حقوق و فرائض سے گریز اس کیلئے ممکن نہیں۔ یہ امت خلافتِ ربانی اور نیابتِ نبوت کی دوگونہ ذمہ داریوں سے گرانبار ہے۔ اس نے نائب حق بن کر عالم میں احکام الٰہی کو نافذ اور شریعت مطہرہ کو رائج کرنا ہے۔ اور جملہ انبیاء اور خاص کر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین کی حیثیت سے تمام اقوام و ملل کو اسلام سے روشناس اور دین حق سے آگاہ کرنا ہے۔ اب قیامت تک اس امت کی ذمہ داری ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ حیات کو ساری دنیا میں پھیلائے اور عام کرے۔ امت محمدیہ کے ان دوگونہ فرائض کی سمجھے بغیر اسلامی سلوک کے جملہ پہلوؤں کو سمجھنا مشکل ہے۔ اسلئے اسکی وضاحت ضروری ہے۔ حضرت والا قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں :۔

"...... اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے اور اسماء وصفات و خواص کا علم عطا فرما کر اس کو اپنی بقا کی ضرورتوں کی بہم رسانی کا علم بخشا، لیکن خود اس کی حیثیت ملائکہ عالم کو یہ بتائی گئی۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً میں زمین میں اپنا ایک نائب اور نمائندہ بنا رہا ہوں

نائب اور نمائندہ وہی ہوتا ہے جو اصل کے دیئے ہوئے احکام کو جاری کرتا اور اس کے بخشے ہوئے اختیار کو کام میں لاتا ہے۔ اور ان احکام کے اجراء و اختیار میں لانے کیلئے جو ساز و سامان ضروری ہوتا ہے۔ وہ اصل سے عاریتًہ اس کو ملتا ہے اور امانتًہ اس کے پاس رہتا ہے۔ پس انسان کو عقل و قدرت، ہوش و خرد اور علم و معرفت کا جو سامان ملا ہے۔ وہ اصل کی نقل اور مالک سے مستعار ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ اسی مبتدا کی خبر ہے اور صوفیہ کے اس قول کی شرح ہے کہ عالم میں جو کچھ ہے۔ وہ سب اسمائے الٰہی کے مظاہر ہیں...... اور ان میں سے انسان اللہ تعالیٰ کے شئون و صفات کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ اور اس طرح تخلقوا باخلاق اللہ کا منشاء اسے پورا کرنا ہے۔ (خطبہ ندوہ)

اس نظریہ خلافت کی رو سے اگرچہ سارے بنی آدم اس نیابت الٰہی کے شرف کے مستحق ہیں۔ مگر اہل سعادت وہی ہیں۔ جو ان میں سے اس نظریہ کو مانتے اور اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کا ذمہ دار جانتے ہیں۔ اور نیابت کی بلندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی اور سرافگندگی کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس نیابت اور عبدیت کے دوگونہ فرائض کے اصلی نمائندے تو انبیاء علیہم السلام ہیں۔ مگر ان کی تبعیت میں اپنے اپنے وقت ان کی امتیں بھی شامل رہی ہیں، لیکن اب جب کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کیلئے خاتم الانبیاء ہو کر تشریف لائے ہیں۔ اور اب آپ کے بعد کوئی دوسرا

قیامت تک آنے والا نہیں   تو امتِ محمدیہ بھی اپنے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تبعیت میں دنیا کی آخری امت ہو کر دنیا میں آئی ہے۔ اس لئے قرآن پاک اور حدیث نبوی میں اسکا لقب خاتم الامم اور آخر الامم ہے .... (یہ) امت محمدیہ جو آخری امت ہے اس لئے پردہ عدم سے باہر لائی گئی ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے آخری شاہد کے طور پر اس دنیا میں کام انجام دے۔ اور ہر نبی کے دعوٰی کی شاہد، حمایتی، مددگار اور گواہ رہے۔ وہ دنیا کی ساری قوموں کی نگراں کار بنا کر بھیجی گئی ہے۔ اسکا فرض ہے۔ کہ وہ قیامت تک قوموں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے۔ اب نبیوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کیونکہ دینِ الٰہی کامل ہو چکا۔ پیغام الٰہی کی ہر حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی، اور اسکی تبلیغ۔ اور اشاعت کا فرض امت محمدیہ کے سپرد ہو گیا۔ اب یہ تنہا اسکے ذمہ ہے کہ قیامت تک تمام دنیا میں کلمۂ الٰہی کی بلندی، حق کی اشاعت دین کی تبلیغ نظام عدل کی برقراری، امر بالمعروف، اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے۔ رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے امام و پیشوا اور وہ ساری امتوں کی امامت اور پیشوائی کرے، قیامت کے دن اس کی یہی فضیلت تمام انبیاء کی امتوں پر شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگی .... اس امت محمدیہ کی ساری امتوں پر شہادت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس امت کے شاہد عادل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اب قیامت تک کیلئے نبی ہو کر ساری امتوں کیلئے آخری نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اِس لئے دنیا کی ساری امتیں خواہ وہ اپنے کو کسی سابق نبیؑ کی طرف منسوب کریں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دعوت ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں اس فرض کو انجام دیا۔ اور اپنے آس پاس کی ساری امتوں تک اپنے پیغام کو پہنچا۔ آپ کے بعد آپ

کے خلفاء اور صحابہ نے اس فرض کو انجام دیا۔ ان کے بعد عہد بعہد قیامت تک اِس پیغام الٰہی کی دعوت و تبلیغ امت محمدیہ کا فرض قرار پایا۔ اب جب تک دنیا آباد ہے۔ ہر ملک میں ہر قوم میں، دنیا کے ہر گوشہ میں اِس پیغام الٰہی کی دعوت و تبلیغ الی یوم القیام امت محمدیہ کا فریضہ ہے" (امت مسلمہ کی بعثت معارف ص۲۴۵ تا ۲۵۸ ج ۵۷ ملخصاً)

ایک دوسرے مقام پر ارقام فرماتے ہیں:۔

"اسلام ایک پیغام الٰہی، اور اس پیغام کی حامل امت مسلمہ ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے۔ جسکی طرف سے نہ صرف عام مسلمانوں نے بلکہ مسلمان علماء اور مشائخ تک نے اعراض و تغافل برتا، اور اس حقیقت کو بالکل بھلا دیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے۔ کہ مسلمان اپنے کو انہیں معنوں میں قوم سمجھنے لگے جن معنوں میں دنیا کی قومیں اپنے کو قوم سمجھتی ہیں۔ ان میں سے کوئی تو وطنیت کے سہارے اپنی قومیت کی دیوار کھڑی کرتا ہے۔ کسی نے نسل کو قومیت کا معیار سمجھا، اور ان میں سے جو سمجھ رکھتے ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان قوم قومیت اور نسل سے نہیں۔ بلکہ مذہب کی بنیاد پر ہے۔ حالانکہ حقیقت اس سے بھی زیادہ آگے ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمان وہ جماعت ہے۔ جو اللہ کی طرف سے ایک خاص پیغام لے کر دنیا میں آئی ہے۔ اس پیغام کو قائم رکھنا اور اس کو پھیلانا، اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دینا اسکی زندگی کا تنہا فریضہ ہے۔ اس پیغام کے ماننے والوں کی ایک برادری ہے۔ جس کے حقوق ہیں اور یہی ان کی قومیت ہے۔ اس حقیقت کے ظاہر ہونے کے بعد مسلمان قوم کا سب سے بڑا فرض اس پیغام الٰہی کی معرفت، اس کی بجاآوری اسکی تعلیم

"اس کی دعوت اور اسکی اشاعت اور اس کے حلقہ بگوشوں کی ایک پوری برادری کا قیام اور اس کے حقوق کو بجالانا ہے....."

"قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کے نصوص سے یہ ثابت ہے کہ امت مسلمہ اپنے نبی کی تبعیت میں امم عالم کی طرف مبعوث ہے۔ اس امت کو باہر ہی اسلئے لایا گیا ہے۔ کہ وہ دعوت و تبلیغ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کو انجام دے، جیساکہ یہ آیت پاک کھلے لفظوں میں ظاہر کر رہی ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

تم اے مسلمانو بہترین امت ہو جو لوگوں کیلئے ظاہر کیگئی۔ اچھے کاموں کو بتلاتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو

اس آیت نے بتایا۔ کہ امت مسلمہ دنیا کی دوسری امتوں کیلئے باہر لائی گئی ہے۔ اس کی پیدائش کی غرض بھی یہی ہے۔ کہ وہ امم عالم کی خدمت کرے اور ان میں خیر کی دعوت اور معروف کی اشاعت اور منکر کی ممانعت کرے۔ ایسی حالت میں اگر یہ امت اپنے اس فرض سے غفلت برتے تو وہ اپنی زندگی کے مقصد کے پورا کرنے سے عاری ہے۔" (مقدمہ سوانح مولٰنا الیاس)

امت محمدیہ کے اسی فریضہ اور مقصدِ حیات کا نام بعض علمائے محققین کی اصطلاح میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ثانیہ ہے، جو مذکورہ بالا آیت سے بھی مفہوم میں آتی ہے اور حدیث صحیح میں اسی بعثت ثانیہ کی تصریح ان الفاظ میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا:۔

فانما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین — تم آسانی پیدا کرنیوالے بناکر مبعوث ہوئے ہو۔ نہ کہ تنگی کرنیوالے بناکر

اس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ ایک پیغام کی حامل ہے۔ اور اپنے رسول کی طرف سے دعوت و تبلیغ پر مامور ہے۔ وہ پردۂ عدم سے اس لئے باہر لائی گئی ہے۔ کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی اصلاح و تزکیہ کی خدمت انجام دے۔ اور اپنے نبیؐ کے پیغام حق کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلائے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا حجۃ الوداع میں اخیر حکم۔

فلیبلغ الشاھد الغائب — میرے پیغام کو جو یہاں موجود ہیں اس تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں۔

یہ حکم صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک کیلئے محدود نہیں۔ بلکہ قیامت تک کیلئے جاری و ساری فرمایا گیا ہے۔ کہ ہر حاضر العلم دوسرے غیر حاضر العلم کو اسی طرح پہنچاتا رہے۔"

(امت مسلمہ کی بعثت معارف ص۲۵۷ ج ۵۷)

ایک اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

" امت مسلمہ فرائض نبوت میں سے دعوت خیر اور امر معروف اور نہی منکر میں نبی کی جانشین ہے۔ اسلئے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو کار نبوت کے جو تین فرض عطا ہوئے ہیں۔ تلاوت احکام، تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ، یہ تینوں فرض امت مسلمہ پر بطور کنایہ عائد ہیں چنانچہ قرناً بعد قرنٍ اکابر آئمہ امت نے ان تینوں فریضوں کی ادائیگی میں پوری توجہ اور کوشش مبذول فرمائی ہے۔ اور انہیں کے مجاہدات کا نور ہے۔ جس سے کاشانہ اسلام میں روشنی ہے۔ نبوت کے یہ تینوں فرض اس آیت میں یکجا ہیں۔

رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ — ایک رسول انہیں میں سے جو اللہ کی آیتوں کو پڑھ کر سناتا ہے۔ اور انہیں پاک کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک ایسی امت جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی خلافت، انبیا علیہم السّلام اور خاصکر اپنے نبی سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت اور جملہ انسانیت کی طرف بعثت کے منصب جلیلہ سے نوازی گئی ہو۔ جو تمام عالم کے انسانوں کی قیامت تک نگراں بنائی گئی ہو۔ جسے وجود ہی دنیا میں نظام عدل کے قائم کرنے، احکام الٰہی کے پہنچانے اور جملہ اقوام و ملل کیلئے خیر و بھلائی کا نمونہ بنکر امام و پیشوا بننے کیلئے بخشا گیا ہو۔ جسکا فریضۂ منصبی ہی ہدایت رسانی خلق، اشاعت احکام، اقامت دین، امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہو۔ جسکا وظیفہ انسانیت کے قلوب و نفوس کا تزکیہ و تصفیہ، اخلاق عالیہ کی حفاظت اور الٰہی رنگ کا عالم میں نکھار ہو۔ کس طرح عزلت، گوشہ گیری، اور رہبانیت کی زندگی گذار سکتی ہے؟ اس منصب رفیع اور ان مقاصد و فرائض کا تقاضا اور لازمہ ہی جہد و جہاد، دعوت تبلیغ نفر و قتال لاعلاء کلمۃ اللہ، شریعت مطہرہ کا نفاذ، احکام ربانی کا اجراء، اسلامی سیاست عادلہ کا قیام اور اقامت دین کے متعلق جملہ امور کی کوشش ٹھہرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ امت محمدیہ مرحومہ کا سلوک زندگی کے سارے شعبوں میں طے ہوتا ہے۔ اور اسکی شاہراہ معرفت حیات انسانی کے جملہ انفرادی و اجتماعی تقاضوں، معاملات اور حقوق و فرائض کی گھاٹی میں سے ہو کر گذرتی ہے۔ اور اسی بنا پر رہبانیت، عزلت، خلق سے گوشہ گیری کی اسلامی تصوف میں گنجائش نہیں۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی تعلیمات اسی "جامع سلوک" پر مشتمل تھیں چنانچہ آئندہ اوراق میں اسی جامعیت کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کیجائے گی۔

سیاست و تعمیر ملت

"سیاست ایک دھوپ چھاؤں ہے۔ وہ دم بدم بوقلموں کی طرح رنگ بدلتی ہے" کہ ہر زمانہ کے خیالات یکساں نہیں ہوتے، حالات وظروف بدلتے ہیں حسن وقبح کے انسانی معیار میں تغیّر آتا ہے۔ جو کل حق نظر آرہا تھا۔ وہ آج باطل دکھائی دیتا ہے۔ اور جو آج غلط ہے۔ وہ کل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ انسانی علم کی کوتاہی و نارسائی، مستقبل و مغیبات سے ناآشنائی، حصولِ جاہ واقتدار اور مال و دولت کی حرص وآز سے ملکر ہر روز نئے نئے سیاسی نظریوں کو وجود بخشتی ہے۔ لیل ونہار کی ہر گروش کے ساتھ سیاسی افکار وخیالات، نظریات وطُرق میں تغیر وتبدل اور آتار چڑھاؤ جاری رہتا ہے۔ اہل سیاست اپنے مزعومہ فکری وسیاسی نظاموں کی کامیابی اور حصول قوت واقتدار کیلئے ہر قسم کی جدوجہد میں مشغول رہتے ہیں۔ اور اس کے لئے ہر قسم کے اسباب و وسائل بروئے کار لاتے ہیں۔ غرض اس تماشہ گاہ عالم میں سیاست کی رنگا رنگی ہر روز ایک نیا منظر پیش کرتی ہے اور زمانہ کے ہر موڑ کے ساتھ سیاست بھی اپنا رُخ بدلتی ہے۔ اسکے مقابل میں دین جو حقِ مطلق اور صداقتِ دائمی ہے۔ وہ ناقابلِ تغیر ہے ؎

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری　　بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی وشامی

اسلئے اہل دین کیلئے ہر تغیر پذیر سیاسی نظریہ کی پرکھ کا معیار دین کے غیر متغیر حقائق ہیں اور ہر سیاسی فکر ونظریہ اور اسکے طریقِ کار کے حسن وقبح کی کسوٹی دین کی غیر متبدل حقیقت ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ ہر نظریۂ فکر دین کے معیار پر کامل اتر سکتا ہے۔ اور نہ ہر سیاسی نظام دین کہلایا جاسکتا ہے۔ نہ ہر غلبہ وتفوق کی کوشش کو 'اسلامی سیاست' کہا جاسکتا ہے اس بنا پر اہل دین وسالکین کیلئے ہر قسم کی سیاسی تگ ودو، کوشش وجستجو میں شرکت واشتغال بغیر اسکی حقیقت ومآل جانے ممکن نہیں گو اسلام کی جامعیت اور ہمہ گیری نے "سیاست" کو "شجرہ ممنوعہ" قرار نہیں دیا۔ اور نہ ہی عیسائیوں کی طرح "قیصر وخدا" کی دو علیحدہ علیحدہ مملکتوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور نہ ہی "سیاست" اسلامی حیطۂ عمل اور دائرہ سلوک سے خارج ہے۔ تاہم خالص "اسلامی سیاست" کا شجر طیبہ اپنی ہی زمین میں برگ وبار لاتا ہے۔ اور اسلامی دعوت کی ہمہ گیری اسے پروان چڑھاتی ہے۔

حضرت سید الملت قدس سرہ کا ارشاد ہے۔

" اسلامی سیاست دعوت کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ دعوت میں سیاست خودبخود آجاتی ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالیات کے وزیر اور سیاسی قوتیں جمع نہیں کیں۔ نہ یہ کہا کہ آؤ ملکر حکومت کریں۔ صرف کلمہ کی طرف لوگوں کو بلایا۔ دین کی دعوت دی، سیاست ذیل میں خودبخود آگئی۔ گو اسلام میں سیاست اور دعوت علیحدہ نہیں ہے۔ لیکن سیاست کے منافع اور ضرر سے دعوت پر بھی اثر پڑتا ہے . . . . . ؟

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں :-

" یہ ایک افسوناک حقیقت ہے۔ مگر حقیقت ہے۔ کہ اسلامی دعوت کی وسعت جو انسانی زندگی کے ہر گوشہ تک وسیع تھی۔ وہ گھٹتے گھٹتے صرف چند عقائد اور چند عبادات

تک محدود ہو کر رہ گئی۔ بنی امیہ نے اپنے عمل سے سیاست کو دین سے خارج کر دیا اور عباسیہ نے تہذیب و تمدن و آداب کو بھی دین کی ہمہ گیری سے الگ کر لیا۔ اس کے بعد ایرانی و ترکی و تاتاری سلاطین نے قرآن کے ساتھ آئین نوشیروانی اور تورۂ چنگیزی کا اضافہ کیا۔ وہ دین تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکھتے تھے۔ مگر ان کی سیاست اور خراج و باج کے آئین قیصر و کسریٰ اور چنگیز و ہلاکو کے دستور و قواعد پر مبنی تھے۔ اس لئے ہماری یہ پچھلی سلطنتیں مسلمانوں کی تو ضرور تھیں۔ مگر اسلام کی نہ تھیں۔ یعنی ان کے فرمانروا مسلمان تھے۔ مگر ان کی حکومت کا قانون اسلامی نہ تھا۔ جس طرح آج انگریزی عہد میں بھی محمڈن لاء جاری ہونے سے کوئی سلطنت اسلامی نہیں ہو سکتی تھی۔ تو کل صرف نکاح و طلاق و وقف وغیرہ کے اجرا سے سلطنت اسلامی نہیں ہو سکتی۔

الّا یہ کہ اس کے استعمال میں ہم ایک نوع کا مجاز و تساہل برتتے ہیں۔

یہ کہنا صحیح نہیں۔ کہ مسلمانوں نے اس اسلامی حقیقت کی تبدیلی کو آسانی سے مان لیا۔ جنگ جمل، جنگ صفین حضرت عبداللہ بن زبیر اور حجاج کی لڑائی، معرکہ کربلا، واقعہ حرہ جس میں اہل مدینہ نے بنوامیہ کے خلاف لڑائی لڑی، واقعہ قراء جس میں علماء عراق نے بنوامیہ کے خلاف معرکہ آرائی کی۔ واقعہ نفس ذکیہ جس میں سادات و علمائے حجاز نے مل کر عباسیہ کے خلاف پرزور بغاوت کی، یہ اور اس کے سوا دوسرے واقعات نے جن میں اصلاح و انقلاب کے علمبرداروں کو کامیابی نہیں ہوئی، خونریزی اور فتنوں کا دروازہ کھول دیا۔ اس لئے پچھلے متکلمین اور فقہا نے یہ اصول بنا لیا، کہ ہر اصلاح طلبی میں یہ دیکھنا چاہئیے کہ فتنوں کے نئے دروازے تو نہیں کھلتے اور حالات بد سے بدتر تو نہیں ہو جائیں گے

ان اصلاح طلبوں اور انقلابیوں کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انقلاب سے پہلے انہوں نے انقلاب کی دعوت کا دور اپنے اوپر نہیں گذارا، اور زمین میں ہل چلانے سے پہلے زمین میں تخم ریزی شروع کردی، آخر اُسی زمانہ میں ابو مسلم خراسانی کی تحریک جس سے عباسیہ حکومت کا آغاز ہوا۔ اور اسماعیلیوں کی تحریک جس سے دولت فاطمیہ پیدا ہوئی اور محمد بن تومرت کی تحریک جس سے موحدین مراکش کی سلطنت قائم ہوئی کس طرح دعوت کی راہ سے بڑھی اور پھلی اور پھولی اور مدتوں قائم رہی۔

زمانہ کے انقلابات نے آج بہت سے امکانات پیدا کردیئے ہیں۔ ہر جگہ شخصی سلطنتوں کے تخت خالی ہوگئے۔ دستوری اور جمہوری اور عوامی سلطنتوں کے آئین پر حکومتیں قائم ہورہی ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسلامی اصول سلطنت پر کوئی سلطنت قائم کیوں نہیں ہوسکتی۔" (معارف اعظم گڑھ ص۲۵۱ ج ۶۰ نمبر۴)

اِس طویل اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ کہ اسلام میں سیاست دین سے علیحدہ نہیں۔ لیکن اس کے وجود میں آنے اور اسے بروئے کار لانے کیلئے دعوت اور صحیح ذہنی وفکری تربیت کی ضرورت ہے۔ جس کے بغیر کسی سیاسی تحریک میں حصہ لینا پوری طرح خوش آئند نہیں ہوسکتا۔ اس لئے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ہر سیاسی انقلاب سے پہلے مسلمانوں کی صحیح دینی تربیت کو ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ ارقام فرماتے ہیں :-

"جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ پیش نظر سیاسی انقلاب خواہ کتنا ہی خوش آئندہ ہو۔ ان کا اعلیٰ مطمع نظر نہیں بن سکتا۔ ان کا اصلی مقصد حیات تو اشخاص کا عروج وزوال، پارٹیوں کی شکست وریخت وزارتوں کا عزل ونصب، اور زمینوں کا

رد و بدل نہیں۔ بلکہ عقائد و اصول کی تصحیح، مقصدِ حیات کی تعیین اور مسائل زندگی میں اسلامی نظام کی سچی تقلید اور پیروی ہے۔ اور اس کی برقراری کیلئے دلوں میں سچی تڑپ اور ناقابلِ سکون اضطراب، غرض ہم کو نئے سرے سے ایک نئی عمارت کا کام کرنا ہے۔

بحمد اللہ کہ مسلمان نوجوانوں میں اس حقیقت کا ادراک ہو رہا ہے۔ اور یہ آواز پہلے کی طرح اب نامانوس نہیں رہی ہے .... (کہ) رجوع الی الاسلام، یعنی زندگی کے ہر اصول میں اسلام کی طرف بازگشت ہی ہماری ہر بیماری کا علاج ہے۔

اس لئے حکومت کا خواب دیکھنے والوں کو پہلے اسلام کا خواب دیکھنا چاہیئے کہ اسلام کیا ہے۔ اس کا نظام کیا ہے۔ اس کے احکام کیا ہیں۔ اور اس کے مطابق ہمارے افراد کی زندگی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے۔ تو ہمارے اندر وہ انقلاب کیسے پیدا ہو۔ جو ہم کو ترکستان کی راہ سے ہٹا کر حجاز کی طرف لے جائے۔ جو ہم کو یورپ کی نقالی کی بجائے خود اپنی اصلیت مفقودہ کی تصویر ہم کو دکھا دے۔ تاکہ ہم خلافتِ موعودہ کے مستحق ٹھہریں۔

جب تک ہمارا مقصود صرف اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامت دین نہ ہوگا۔ اور اسی کیلئے روٹھنا اور مٹنا اور مرنا اور جینا نہ ہوگا۔ ہم اسی طرح ممبریوں اور وزارتوں اور لیڈریوں کیلئے آپس میں لڑتے، مرتے اور کٹتے رہیں گے۔ کیونکہ ہم نے اپنا مقصود انہیں شخصی اعزازات اور اسی جاہ و منصب کے حصول کو بنا رکھا ہے۔ اور اسی کا نام ہم نے اسلامی ترقی رکھ چھوڑا ہے۔

ضرورت ہے کہ عقائد و عبادات کے ساتھ اسلامی سیاسیات، اسلامی اقتصادیات

اسلامی طریق تجارت، اسلامی اصول مضاربت (یعنی سرمایہ اور مزدوری کے طریق تعاون) اسلامی طریق کاشتکاری، اسلامی طریق کارخانہ داری، کسانوں اور مزدوروں کے اسلامی حقوق، اسلامی لین دین اور معاملات کے مسائل اور دیگر تمام ضروری امور زندگی کے متعلق خالص اسلامی حل لوگوں کے سامنے رکھا جائے۔ اور اس کے قبول وعمل کی دعوت دیجائے، جس سے اسلام کی نشأۃ ثانیہ ہو اور مسلمان مسلمان بن کر دنیا میں ظاہر ہوں (معارف ص ۲۴۲/۲۴۱ بحوالہ ج ۵۸)

سیاسی سطحی و وقتی ہنگامہ آرائیوں سے بچاکر ملت کی صحیح تعمیر کی دعوت دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"جماعت کی تعمیر صرف جذبات، جوش وخروش اور ہنگاموں سے نہیں ہوتی۔ بلکہ کسی مقصد کے ساتھ عشق کی سی وابستگی اور اس کے حصول کی راہ میں جان ومال وعزت ہر چیز کی قربانی کا حوصلہ ہونا چاہیئے۔ اور اس راہ میں موانع کی جو تکلیں پیش آئیں۔ ان کے ازالہ اور برداشت میں صبر وضبط اور عزیمت واستقلال اور حصول مقصد کے بعد اس حاصل شدہ مقصد کی بقا کیلئے اخلاق کی بلندی، عیش وآرام کی زندگی سے پرہیز، مال ودولت اور جاہ وعزت کی حرص ومحبت سے آزادی، مختلف عناصر کے مختلف افراد کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ، اور مقصد کی بقا کو ہر ذاتی منفعت اور ہر شخصی فائدہ مندی سے برتر جاننا اور رکھنا اور اسی کیلئے جینا اور اسی کیلئے مرنا، جب تک کسی جماعت کے افراد میں اکثریت اور اغلبیت کے ساتھ یہ اوصاف پیدا نہ ہوں گے۔ اول تو کوئی جماعتی مقصد حاصل نہیں ہوسکتا اور ہو بھی جائے تو وہ باقی نہیں رہ سکتا۔

اب ہم کو دیکھنا ہے۔ کہ آیا ہماری اس وقت کی جماعتوں میں یہ اوصاف پیدا ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں ہیں۔ تو پیدا کرنا چاہیئے۔ اگر ہیں تو ان میں مزید ترقی اور پختگی کی فکر کرنی چاہیئے۔ اور ہمارے رہنماؤں کو چاہیئے کہ وہ اپنی مختلف تحریکوں اور تعلیموں میں ان اصولوں کی تعلیم کے سبق دیا کریں۔ جماعتیں بھی بچوں ہی کی خاصیتیں رکھتی ہیں۔ اور ان کی تعلیم و تربیت کے اصول بھی انہی جیسے ہیں۔

اسلام میں بدر کا معرکہ جو ۳۱۳ مسلمانوں کا کارنامہ ہے ہر وقت پیدا کیا جا سکتا تھا۔ مگر بدر کے وقوع کے لئے تیرہ[۱۳] برس کے انتظار کی ضرورت پیش آئی، اور جب تک ٹھوک بجا کر اور آزمائشوں کی آگ میں تپا کر ان کو دیکھ نہیں لیا گیا۔ ان کو معرکوں میں نہیں لایا گیا۔ اس سے اندازہ ہوگا۔ کہ جماعتوں کی تعمیر صرف ضد اور ہٹ اور سب و شتم اور طعن و طنز اور شور و غل اور مختلف نعروں کے شعر پڑھنے اور چیخنے سے نہیں ہوتی۔ بلکہ مقصد کی بلندی، مقصد سے عشق نما دلبستگی اس کے حصول و بقا کیلئے اعلیٰ اخلاق، پختہ سیرت اور مضبوط کیریکٹر پیدا کرنا ضروری ہے۔ تاریخ میں اس کی بکثرت مثالیں ہیں۔ کہ جماعت نے اپنے وحشیانہ جوش اور شجاعت سے کسی مقصد کو حاصل کر لیا، لیکن چونکہ اس کی بقا کیلئے جو اخلاق اور کیریکٹر چاہیئے ان کے نہ ہونے سے وہ مقصد ان کے ہاتھوں سے بہت جلد کھو گیا ابھی ہندوستان کی تاریخ میں اودھ کی سلطنت، روہیلوں کی ریاست

سکھوں کی شاہی، اور مرہٹوں کی پیشوائی میں عبرت کی داستانیں چھپی ہیں۔ (معارف ص۱۶۲، ۱۶۳/ ج ۵۷/ نمبر ۳)

۱۹۴۵ء کے تاریخی الیکشن کے موقع پر مسلمانانِ ہند کو تلقین فرماتے ہیں:۔

"آج کل مسلمانوں میں الیکشن کا بحران ہے۔ اس بحران میں جس طرح نامعقول طریقوں سے لوگ اپنی قوت کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ حد درجہ نامناسب ہے۔ انتہا یہ ہے۔ کہ اس سلسلہ میں سب وشتم، لعن وطعن اور زود وکوب سے بھی پرہیز نہیں کیا جا رہا ہے۔ یہ طریق عمل استدلال کی قوت ظاہر کرنے کی بجائے اس کی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے۔ مذہب اور دین کی حمایت کا نام لے کر عوام کو جوش دلانا اور اس سے اپنا کام نکالنا غلط رہنمائی ہے۔ جس سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہونچے گا۔ ضرورت اسکی ہے۔ کہ مسلمانوں کو ضبط، صبر، ڈسپلن، تنظیم، استقامت، تحمل، برداشت، ایثار، باہمی ہمدردی، عملی وحدت اور اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی جائے۔ جو سیاست کی جنگ کے سب سے کارگر ہتھیار ہیں۔ صرف زبانی جوش وخروش، گرما گرم محفلی اور اخباری بحث اور براہ راست دست وگریبان ہونا قوم کی طاقت نہیں۔ ہماری بحثوں کا موضوع مسائل کا صواب وخطا ہونا چاہیئے۔ نہ کہ اشخاص کے محاسن و معائب کا اظہار۔" (معارف ص۳۶۶/ ج ۰/ ۵۶/ نمبر ۵)

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

قومیں کاغذوں اور مسودوں سے نہیں بنتیں۔ وہ دلوں کے بدلنے اور

ذہنیتوں کی اصلاح اور تعلیم و تربیت سے بن سکتی ہیں۔

ایک دوسرے گرامی نامہ میں ارشاد فرماتے ہیں:-

"ضرورت دل و دماغ کے انقلاب کی ہے۔ جو صحیح دعوت فکری سے ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی سے ظاہر ہے۔ اس کے لئے شور و غل اور ہنگامہ اور دعوت جنگ و نبرد کی راہ غلط ہے۔ ہمارے علماء جدید ذرائع و وسائلِ کار سے ناواقف ہیں۔ جوش سے کام لیتے ہیں ہوش سے نہیں۔ جہاد بالسیف سے زیادہ ضروری کام ان حالات میں جہاد بالقلم ہے۔ ان حضرات میں سراسر جوش ہی جوش ہے۔ جو اس زمانے میں چنداں مفید نہیں۔ دلوں کا انقلاب غیظ و غضب جوش و خروش اور جذبہ انتقام اور استعجال سے نہیں پیدا ہوتا۔"

ملت کی تعمیر میں تعلیم کی جو اہمیت ہے اس کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں:-

"ہم نے پہلے بھی کہا ہے۔ اور اب پھر کہتے ہیں۔ کہ مسلمان وقت سے پہلے طوفان کا اندازہ کریں۔ اور یہ سمجھ لیں کہ ان کو ایسی تعلیم درکار ہے جس سے مسلمان مسلمان بھی باقی رہیں۔ اور اس راہ میں جو غفلت سرکاری مدارس کے پہلے دور میں ان سے ہو چکی ہے۔ وہ اس آنے والے دور میں نہ ہو...... تعلیم کی اہمیت بہت بڑی ہے۔ یہی وہ سانچہ ہے۔ جس میں ملت کے نوجوان افراد ڈھل کر نکلتے ہیں۔ ان کی ذہنی تربیت، اخلاقی نشوونما، دماغی استعداد اور قلبی قوتِ یقین، یعنی ساری ذہنیت اس کے ذریعہ بنائی اور بگاڑی جا سکتی ہے۔ امت کو جیسے افراد کی ضرورت ہے۔ وہ اسی

کے ذریعہ تیار ہوتے ہیں اور ہوسکتے ہیں۔ خوب سمجھئے کہ ہندوئیت کی طرح اسلامیت کوئی قومیت یا وطنیت نہیں ہے۔ بلکہ وہ ذہنی تیقین اور اعمال و اخلاق کے ایک خاص طریق کا نام ہے۔ جس کی بقا تعلیم و تربیت کے سوا اور کسی ذریعہ سے ممکن ہی نہیں۔ اسکی بقا کیلئے تعلیم و تربیت کے ایک خاص نظام کی ضرورت ہے۔ جو مسلمانوں کے مسلمان رہنے اور بننے میں مددے"

قیام پاکستان کے بعد حضرت علامہ محمد یوسف صاحب البنوری مدظلہٗ کو بھوپال ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"معلوم نہیں جہاں آپ ہیں۔ (یعنی پاکستان میں) کیا صورت حال ہے۔ کیا معنوی صورتیں مسلمانوں میں ابھر رہی ہیں۔ یا صرف شور و غل اور ریا و نمائش ہے۔ یہ وقت جوش و خروش کا نہیں ہوش کا ہے مسلمانوں کو۔ اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ کے مطابق صالح ہونا چاہیئے اور "وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ" کے مطابق ایمان و عمل صالح میں ترقی کرنی چاہیئے اس وقت . . . مسلمانوں میں نظم و ضبط، ثبات قدمی۔ اطاعتِ امر اور جد و جہد و سعی محنت ایثار و اخلاق پیدا کرنے اور حب مال، حب جاہ اور حب نفس کے خبائث کو اپنے اندر سے نکالنے کی ضرورت ہے۔ کاش میری یہ آواز مسلمانوں تک پہنچ سکتی"

اس خط میں ۱۹۴۷ء کے خونچکاں ہنگاموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

ارشاد فرماتے ہیں۔

از ماست کہ بر ماست مسلمانوں پر جو کچھ وبال ہے۔ وہ ان کے اعمال کی سزا ہے۔ کاش اب بھی قلوب میں انابت ہو۔ اور مسلمان سمجھیں کہ ان کا مقصد اول اقامت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔ خواہ وہ تخت سلطنت پر ہو یا بوریائے فقر پر۔ ان کو شیطان سے اس لئے مخاصمت نہیں کہ یہ شیطان کا تخت زمین پر کیوں بچھا ہے بلکہ اس لئے یہ مخاصمت ہے کہ اس تخت شیطنیت پر شیطان کیوں بیٹھا ہے وہ کیوں نہیں بیٹھے ہیں۔

مندرجہ بالا مباحث سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی۔ کہ حضرت والا قدس سرہ سیاست کی خالص دنیاوی عصری ہنگامہ آرائیوں، سطحی شور و غل، اقتدار کی تگ و دو کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصل کام مسلمان بننا اور بنانا تھا۔ جس کے لئے مسلمانوں کی صحیح اخلاقی و معنوی، مذہبی و دینی تعلیم و تربیت کی اہمیت و اہتمام کو ملت کی تعمیر و بقا کیلئے ضروری سمجھتے تھے۔ اس اعلیٰ مقصد کی طرف وہ مسلمانوں کے رخ کو بھی پھیرنا چاہتے تھے اور ہر اس سیاست کو غلط سمجھتے تھے جو مسلمانوں کے بنیادی مقاصد و عقائد کو زک پہنچائے۔ مسلمانوں کو وہ ایک بامقصد اور خاص طرز حیات و پیام کی حامل امت سمجھتے تھے۔ اور اس کی توانائیوں، قوتوں اور استعدادوں کو صرف اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کیلئے خاص کر دینا چاہتے تھے۔ اسی بنا پر علماء اور اہل فکر طبقہ کا موجودہ عملی دنیاوی سیاست میں کلیتاً الجھ جانا پسند نہیں فرماتے تھے۔ حضرت قدس سرہ

کے نزدیک اس طبقہ کو محض قوم کی فکری و ذہنی رہنمائی اور صحیح اسلامی اخلاقی و روحانی تربیت کرنا چاہیئے۔ اور "عملی سیاست" کے خارزار میں الجھے بغیر ملّت کو اسلامی سیاست، شرعی مقاصد، دینی اعمال و کردار کی تلقین و تبلیغ کرتے رہنا چاہیئے۔ چنانچہ ایک خط میں اپنے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

"سیاسات کے باب میں ابھی تک عزلت گزینی پر قائم ہوں۔ اور اسی میں اپنی فلاح سمجھتا ہوں۔ امت کی خدمت صرف سیاست ہی میں منحصر نہیں۔

مسعود عالم ندوی کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"سیاسیات" میں میرے خیالات آپ لوگوں سے الگ نہیں۔ لیکن اگر رسالہ (الضیاء) کو چلانا ہے۔ تو اس کو شجرہ ممنوعہ قرار دینا پڑے گا۔ الخیر کلّہ لیس فی السیاسۃ، انما ھو نوع من الخیر، فترکہ لیس ترک الخیر کلہ (مکاتیب سلیمان ص۳۶)

انہیں کو ایک دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"اخبار ہلال کا طلوع مبارک! مگر ضرورت ہے کہ صرف قوم و ملک کا سیاسی جذبہ کارفرما نہ ہو۔ کچھ اللہ تعالیٰ کا خوف و خشیت ہمارے دلوں کے اندر ہو، اور اسکی رضا اور رجا کا بھی دل میں خطرہ ہو۔ افسوس ہے کہ جو ہم میں نظری طور سے ملحد نہیں وہ عملی طور سے ملحد ہوتے جا رہے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کا درد ہندوستانی قومیت کے منافی نہیں"۔

تقسیم ہند سے پیشتر کے چند سالوں میں ہندوستان کا سیاسی مطلع جس طرح غبار آلود تھا۔ اور سیاست جس طرح مسلمانانِ ہند کے دل و دماغ، ذہن و قوی پر چھائی ہوئی تھی۔

اس کا آج تصور بھی مشکل ہے۔ حسن و قبح کا مدار، اشخاص کی مدح و ذم کا معیار سیاسی مسالک بن چکے تھے، حضرت والا قدس سرہ کی اس زمانے کی تحریر میں سیاسی اصابت رائے، فکری پختگی، ذہنی بلندی، دینی بصیرت اور اسلامی نظریہ زندگی کی معتدل اور جامع ہدایات ہیں۔ جو ہمیشہ مسلمانوں کیلئے مشعل راہ رہینگی۔

۱۹۴۵ء کے ہنگامہ خیز زمانہ میں کلکتہ میں ایک نئی جمیعۃ علمائے اسلام قائم ہوئی تھی۔ جس کا مسلک پاکستانی نظریہ کی حمایت تھا۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ اسکے متعلق اپنی رائے کا اظہار یوں فرماتے ہیں:۔

"پچھلے مہینہ کلکتہ میں ایک نئی جمیعۃ علمائے اسلام کی بنیاد پڑی ہے۔ جہانتک اس کے مطبوعہ نظامنامہ کا تعلق ہے۔ وہ بڑی اہمیت کی مستحق ہے۔ اور اس سے بہت کچھ توقعات قائم کی جاسکتی ہیں، لیکن کاش یہ معلوم ہوتا کہ صرف کوئی ہنگامی محرک تو اس ساری گردشِ افکار کا محور نہیں ہے۔ ان کاموں کیلئے ضرورت ہے۔ چند جانباز مخلصوں کی جو اس کے نصب العین کو اپنی زندگی کا مقصد بنائیں اور پیہم سرگرمیوں سے اپنے وجود کا یقین دلائیں۔ ورنہ سیاسی تماشوں میں ایسے سوانگ بہت دیکھنے میں آئے ہیں۔ جمیعت کو ثابت کرنا چاہیئے کہ وہ ایسی نہیں ہیں اور اس سے جو توقعات قائم کیجائیں وہ پوری ہونگی اور وہ "متبوع" ہوکر رہے گی تابع نہیں۔

آجکل مسلمان اہل سیاست میں علماء کو برا بھلا کہنے کا عام رواج ہو رہا ہے۔ اب علمائے جمیعت علمائے اسلام نے ہمت کر کے ان کی تائید میں آواز بلند کی ہے۔ اور اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ علماء عموماً مسلمانوں کی موجودہ اکثری سیاست سے

علیحدگی برت رہے ہیں۔ تو کیا اب یہ امید کی جائے کہ ہمارے دوستوں کے گذشتہ طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی ہو گی۔ کسی قوم کی حالت کا اس سے زیادہ برا منظر اور کیا ہوگا۔ کہ اس کا مشغلہ غیبت، بدگوئی اور باہمی طعن و طنز ہو۔

اس زمانہ میں جب الیکشن کا بازار گرم ہے۔ سیاسیات نے قومی اور تعلیمی و علمی اداروں کو بھی اپنے ساتھ الجھالیا ہے۔ لیکن یہ صورتِ حال خود ان تعلیمی و علمی اداروں کیلئے موزوں نہیں۔ یہ ادارے وہ کارخانے ہیں۔ جن کے سپرد قوم کے دماغوں کی تیاری کا کام ہے۔ اگر گولہ بارود بنانے والے کارخانوں کے مزدور اور جنگی تربیت گاہوں کے معلم بھی فوج میں بھرتی ہو جائیں تو کیا ایسی قوم جو تقسیم عمل کے اصول سے اس طرح اعراض برت رہی ہو۔ کبھی لڑائی کے سلسلہ کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکتی ہے؟

مجلس دار المصنفین بھی ایک علمی ادارہ ہے۔ اس ادارہ میں بھی طرز سیاست کے لحاظ سے لوگ مختلف الخیال ہیں۔ تاہم ہمارے ارکان مجلس اس باب میں متحد ہیں کہ ادارہ کو سیاسیات کے الجھاؤ سے پاک رکھا جائے۔ اس کو علمی سرگرمیوں کا بازیچہ نہ بنایا جائے۔" (معارف ص ۲۴۸/۲۴۹ ج ۵۶ ع ۲)

مسعود عالم صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میں بھی اعظم گڈھ سے دور ہونے کے باعث الیکشنوں کے ہر گرد و غبار سے محفوظ رہا۔ ابھی دیوبند گیا تھا۔ ایک دن رہا۔ مدرسہ کانگرس کا قلعہ

بن رہا تھا حسنِ نیت اور اخلاص پر اعتماد ہے۔ مگر مدارس کا اس کشاکش میں پھنسنا کسی طرح علم و دین کیلئے پسندیدہ نہیں۔ ایک طرف علیگڑھ کے طلبہ لیگ کا علم لے کر اور بالمقابل دیوبند کے طلبہ کانگرس کا جھنڈا لیکر صوبہ بھر میں پھیلے ہیں۔" (مکاتیب سلیمان ص۱۹۴، ۱۹۵)

حضرت علامہ سید محمد یوسف صاحب بنوری کو لکھتے ہیں:۔

" ادھر میرٹھ میں قیام کے سبب سے دو دو چار روز کیلئے دیوبند، سہارنپور، تھانہ بھون اور دہلی ہو ہو آیا۔ ہر جگہ سیاسیات کے الجھاؤ سے اصحاب عمائم اور اہل درس و تدریس کو پراگندہ خاطر پایا، اللہ تعالیٰ امت محمدیہ پر رحم فرمائے:۔

انہیں کو ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"سیاسیات سے یکسو ہو کر علم اور دین کی خاطر ہم اپنی کوششوں کو یکجا کریں۔"

ایک خط میں مسعود عالم صاحب کو ۷/ستمبر ۱۹۴۶ء کو اس وقت کی سیاست کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

" ملت اسلامیہ کی اکثریت کی ناکامی کا سانحہ بڑا المناک ہوگا۔ مسلک کی صحت و خطا سے بحث نہیں، یوں ہی ایک بات قلم سے نکل گئی ع

" گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے "

حضرت سید الملت رحمۃ اللہ علیہ کی طبعیت پر اس بات کا بہت ہی اثر تھا۔ کہ امت مسلمہ اکثری حیثیت سے اپنے مقاصد اپنے منصب خلافت اور مقام امامت کو بھلا کر فکر و نظر، علم و عمل میں متبوع بننے کی بجائے دوسرے کی تابع اور ناقل

بنتی چلی جارہی ہے۔ بلکہ بن گئی ہے۔ امت کو اس کے مقام رفیع کی یاد دہانی، اسلامی نظریہ خلافت کی طرف رجوع اور دینی سیاست عادلہ کی طرف عود کی تلقین اپنے حکیمانہ اور پر درد الفاظ میں ہمیشہ فرماتے رہے۔ چنانچہ ایک جگہ حکیم الامتؒ کی مساعی جمیلہ کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں۔

"حقیقت میں ترقی جس کی اس وقت دم بدم پکار ہے۔ اونچے محلوں، بھرے خزانوں، بیش قیمت لباسوں، گراں بہا سامانوں، بڑی بڑی تجارتوں، اعلیٰ ملازمتوں اونچی تنخواہوں، شاہانہ احتراموں، اعزازوں اور خطابوں کا نام نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کے ساتھ بلند اخلاق، شریف عادات اور پاک وصاف قلب کا نام ہے۔ جو آب و گل سے وابستہ اور فانی کا طالب نہ ہو۔ اور حرص و ہویٰ، حبِّ مال اور حب جاہ کا گرویدہ نہ ہو۔ جس میں اخلاص کے ساتھ خالق کی رضا کے لئے خلق کی خدمت کا جذبہ ہو۔

فقر و تصوف، علم و فن اور تمدن و سیاست زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمان اپنی غرض و غایت اور اصول و مبادی کو چھوڑ کر ہندی و عجمی و یونانی و افرنگی تصور حیات کی تقلید میں مصروف ہو گئے۔ اور اب تک مصروف ہیں۔ اور اسی کی رونق کو اپنے کاشانہ کی عظمت جانتے ہیں۔ فقر و تصوف میں ہندی و یونانی تصورات جوگ و استشراق کی تقلید ہے۔ علم و فن میں عجمی و یونانی مذاق کی پیروی ہے۔ تمدن و سیاست میں ایرانی و رومی رنگ کی آمیزش ہے۔ کیا عجیب بات ہے کہ وہ دین جو قیصریت و کسرائیت کے رنگ کو مٹانے آیا تھا۔ اسی کے نام لیوا چالیس برس کے بعد خود ہی قیصریت و کسرائیت کے رنگ میں آہستہ آہستہ ایسے رنگ گئے کہ اس کے امراء و حکام خلفائے راشدین

کی جگہ قیصر و کسریٰ کی جانشینی پر فخر کرنے لگے۔ وہی تعیش، وہی سونے چاندی اور ریشم حریر اور طاؤس و رباب کی زندگی مسلمان امراء و حکام کی زندگی کا مقصد بن گیا، بیت المال ان کا ذاتی خزانہ ہوگیا، اور سلطنت ان کی موروثی ملکیت جاگیرداری و زمینداری۔ اسلامی اصول کی بجائے قیصر و کسریٰ کے طرز کی پیروی جاری ہوگئی۔

یہ تو عہد گزشتہ کا حال تھا۔ عہد حاضر میں یورپ کے تمدن اور سیاست کی نقالی ہماری اسلامی سلطنتوں کا فخر ہے۔ ہمارے دارالسلطنتوں کے سامنے پیرس کے خاکے ہیں ہماری خواتین کے سامنے انگلستان و فرانس کی عریانی اور رنگینی اور بے حجابی ہے۔ ہمارے نوجوانوں کی نگاہوں میں رقص و سرود اور ظاہری پوشاک و وضع کی اور طرز ماند و بود میں فرنگی مآبی زندگی کی کامیابی کا سب سے اعلیٰ تخیل ہے۔ غرض مسلمانوں کے دل و دماغ اور ذہن و تصور سے زندگی کی وہ غایت اور حیات کا وہ مقصد جو اسلام نے پیش کیا تھا۔ یکسر مخفی اور پوشیدہ ہے۔

علم و فن پر غور کیجئے تو ہماری قدیم تعلیم اب تک یونان کی تقدیم پارینہ کی پرستش میں اور تعلیم جدید یورپین ضلالت و گمراہیِ خیال کی عکاسی میں مصروف ہے اور سوائے تقلید و نقالی کے کوئی مجتہدانہ تصور ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ہمارے سامنے جب اعلیٰ تمدن اور اعلیٰ سلطنت داری کا تخیل آتا ہے۔ تو یورپ کی ایک ایک سلطنت اپنی پوری ہوشربائی اور باطل آرائی کیساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اور یہ حقیقت ہمارے سامنے سے گم ہوجاتی ہے۔ کہ اسلام کا تصورِ سیاست اور تصورِ تمدن اور تصورِ علم و فن اپنا خاص ہے۔ اور اسی کو دوبارہ پیدا کرنا اور دنیا کے سامنے لانا ہماری قومی و ملی غرض و غایت ہے۔

"........ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دیں۔ کہ وہ (اُس آئینہ[1] میں اپنے خط و خال کو دیکھ کر) اپنی شکل کو پہچانیں، اور غلط اور گمراہ دنیا کے پیرو اور مقلد بننے کی بجائے دنیا کے امام و پیشوا بنیں، اور ایک نئے تمدن نئے طرز حیات نئے مقصد زندگی اور نئے آئین سلطنت کی بنیاد ڈالیں۔

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم ÷ فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم

اور اس وقت کی غمزدہ اور مصیبت سے بھری ہوئی امن کی جویا اور سکینیت کی پیاسی دنیا کو امن و سلامتی کا پیغام دیں۔ اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی تکمیل کریں۔ جو دنیا د آخرت کی صلاح و فلاح کی کفیل ہو۔ اور سیاست اور ملک داری کو حرص و ہوی جھوٹ اور دغا اور مکر و فریب سے آزاد کریں۔

اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد　　من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

اسلام نے ببانگ دہل بتایا ہے۔ اور تاریخ نے اس کی تائید کی ہے کہ حکمرانی کے استحقاق کیلئے اخلاقی جوہر لازم ہے۔ حب مال اور حب جاہ یہ دو لبالب زہر کے پیالے ہیں۔ جو شربت زلال کی شکل میں حکام اور لیڈران کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر کسی نے اس کی طمع میں آکر ان کو پی لیا تو نہ صرف ان کی بلکہ پوری ملت کی موت کا باعث بن جاتے ہیں۔ اِس لئے وہ **حکومتِ صالحہ** جس کی دعوت اسلام کا آئین دیتا ہے۔ وہ ایثار و اخلاص اور خدمت خلق کے للٰہی جذبات سے

---

[1] اسلامی تعلیمات کا وہ آئینہ　جسے حکیم الامۃ حضرت تھانویؒ نے امت کے سامنے پیش کیا اور جسے نئے انداز میں مخدومی مولانا عبدالباری ندوی نے سلسلہ تجدیدات و اصلاحات کے نام سے چار جلدوں میں مرتب فرمایا۔ (یعنی جامع مجددین / تجدید تصوف و سلوک / تجدید تعلیم و تبلیغ / تجدید سیاسیات و قومیات) آخری جلد کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئی) م-ا

تعمیر پاتی ہے۔لیکن ان جذبات کی آفرینش اور مال وجاہ کی محبت سے قلوب کی حفاظت اس تقویٰ کے بغیر ممکن نہیں۔ جو قرآن سے ہدایت یابی کی پہلی شرط ہے۔ "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" بے انصافی، کینہ پروری، رشوت خوری، پرمٹ فروشی، بلیک مارکٹنگ جن کی بدولت ہندوستان و پاکستان کے ہنیا دیں ہل رہی ہیں۔وہ حاکموں عہدہ داروں اور وزیروں اور سوداگروں اور تاجروں اور زمینداروں اور کسانوں کی انہیں اوصاف عالیہ سے خالی اور محروم ہونے کے سبب سے ہیں۔ اور اس کا اصل سرچشمہ اس خشیت الٰہی اور جزائے "یوم الدین" سے بیگانگی ہے۔ جس سے قلوب تزکیہ وتصفیہ کے آبِ صافی سے پاک وصاف ہوتے ہیں۔

اجتماعی کاموں کو چھوڑ کر انفرادی کام بھی تزکیۂ قلب اور تصفیۂ اخلاق کے بغیر فوزِ حقیقی سے محروم رہتے ہیں۔افراد کے قلوب جب تک عناد وحسد، بغض وکینہ، عجب وغرور، ریا ونمائش سے خالی اور اخلاص وایثار، توکل واعتماد علی اللہ اور صبر وثبات سے معمور نہیں ہوتے۔ دنیا میں کامیابی سے اور آخرت میں اجر و ثواب سے ہمکنار نہیں ہوتے، اور یہ ایسے اصول ہیں۔ جو ایک طرف اصول و تعلیمات دین اور دوسری طرف اجتماعی وانفرادی مبادی نفسیات سے ثابت اور مؤید ہیں۔

شخصی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی اس کے کاموں کی غایت رضائے الٰہی کی طلب اور احکام الٰہی کی تعمیل اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے بلند تخیل کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔ غیرفانی ملت کا مقصد حیات ایسے ہی غیرفانی مقاصد ہو سکتے ہیں، ورنہ محض دنیاوی فوز و فلاح یعنی دولت وحشمت، عیشِ زندگی اور اسبابِ راحت کی فراوانی اور بلند

محلات اور خدم وحشم کی کثرت تو وہ پست و متبذل مقاصد ہیں۔ جو زندگی کا فریب اور حیات انسانی کا سراب ہے ۔ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ (لقمان۔ ۳۰) كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ (مقدمہ جامع المجددین)

ایک دوسرے مقام پر سورۂ فاتحہ کی تفسیر کرتے ہوئے مسلمانوں اور ممالک اسلامیہ کے اپنے خاص مقاصدِ حیات و طریقۂ زندگی سے گریز اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ کاملہ سے افسوسناک اعراض کا بیان اور ان کا یورپین یہود و نصاریٰ کے مردود و گمراہانہ طریقوں کی پیروی کا تذکرہ کس محرمانہ، حکیمانہ پر درد و موثر علمی انداز میں فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

"یورپ کا ہر فتنہ اور ذہنی انقلاب کا ہر ہنگامہ جو دنیائے نصاریٰ میں رونما ہوتا ہے۔ اس کی تہ میں جو قوت کار فرما ہوتی ہے۔ وہ یہودی ہوتی ہے۔ وطنیت کا فتنہ بین الاقوامیت کا فتنہ، ڈیموکریسی کا فتنہ، سوشلزم کا فتنہ، بالشوازم کا فتنہ، ان میں سے کونسی چیز ہے۔ جو یہود کی دماغی سرکشی اور ذہنی طغیانِ خیال کی ممنون نہیں ۔ آج یورپ اور امریکہ میں ایک طرف سرمایہ پرستی اور جمہوریت کا پرا قائم ہے۔ اور دوسری طرف مزدوروں اور کسانوں کی دعوت کی غلط صورت اور سوشیالسٹ تحریک کی لادینی حکومت کے کیمپ لگے ہوئے ہیں۔ اور دونوں چیزیں یہودیوں کی طاغیانہ رہنمائی اور نصاریٰ کی گمراہی کے دوگونہ عناصر سے مرکب ہیں۔ اور ساری دنیا ان دونوں طغیانی و گمراہی کے فتنوں میں سر سے پاؤں تک مبتلا ہے۔

آج ہمارے اسلامی ممالک خواہ وہ اپنے کو آزاد کہیں یا غلام، حاکم کہیں یا محکوم، کیا انہی دو فتنوں میں سے کسی ایک میں مبتلا نہیں۔ اب یاد کیجئے . . .

رَبِّ الْعَالَمِیْنَ مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ نے اول روز سے ہم کو بتایا تھا کہ تم ہمیشہ، ہر ایک حال اور اپنی ہر چال میں انبیاء علیہم السّلام کے راستہ پر قائم رہنا' اور مغضوب اور ضال قوموں سے بچے رہنا، مگر کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہم نے اِس کا الٹا کیا، یعنی انبیاءؑ کے راستے کو چھوڑ کر مغضوب اور ضال قوموں کی راہوں کو اختیار کیا اور آج بھی یہی حال ہے۔ آج مسلمانوں کی ہر جماعت خواہ وہ کسی ملک میں ہو اپنی ترقی و اصلاح اور سعادت کیلئے انبیاء علیہم السلام کی طرف نہیں۔ بلکہ انہیں مغضوب اور ضال قوموں کی امامت کی اقتداء کیلئے بے قرار ہے۔ وضع و قطع، تراش و خراش، صورت و سیرت، تعلیم و تربیت، تہذیب و تمدن اخلاق و عادات، رفتار و گفتار، تجارت و اقتصاد و معاملات اور حکومت و سلطنت غرض زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا رخ انبیاء علیہم السلام کی طرف ہے؟ یا مغضوب وضال قوموں کی طرف ہے؟ ہم زبان سے تو کہتے ہیں کہ منہ میرا طرف کعبہ شریف کے، مگر رفتار کی سمت لندن، پیرس، ماسکو، برلن اور نیویارک ہے۔ زبان سے تو اپنی سعادت و ہدایت کو انبیاء علیہم السلام کی اور خصوصاً سرورِ کائنات احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں منحصر جانتے ہیں۔ مگر دل میں اپنی ترقی کا راز یورپ اور امریکہ کی پیروی میں منحصر مانتے ہیں۔ ہم میں سے بعضوں نے جو دانشمندی کے مدعی ہیں۔ دین اور دنیا کے دو حصّے کر رکھے ہیں۔ اور دین میں انبیاء کی اور دنیا میں ان مغضوبوں اور گمراہوں کی پیروی کے داعی ہیں۔ لیکن دین و دنیا کی یہ تقسیم کی تاویل بھی انہی گمراہوں کی تعلیم کا اعادہ ہے۔ جنہوں نے اپنے آسمانی صحیفوں میں یہ لکھا پایا ہے کہ "جو قیصر کا ہے قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے خدا کو دو" گویا وہ دو خداؤں

کے قائل ہیں۔ قیصر جو دنیا پر حکومت کرتا ہے۔ اور خدا جو آسمان پر فرمانروا ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں وہ واحد ہے۔ وہ قیصر کون ہے۔ جو خدا کے ساتھ برابر کی حکومت کا دعویٰ دار ہے۔ "لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے) ان مغضوب وضال قوموں کی ایجاد و اختراع، دولت و طاقت حکومت وسلطنت کی ظاہری چمک دمک نے ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ ان کی عریانی و بے پردگی، ان کی نفس پرستی وہوسناکی وخودپسندی، ان کے تکبر واستکبار ان کے کفر وعصیان کی ہر تصویر ہمارے دل کو پسند ہے۔ ہمارے بچے، جوان، بوڑھے عورت اور مرد ہر ایک اس کوشش میں ہے۔ کہ وہ یہود ونصاریٰ کے اس مشترکہ پیدا کردہ تہذیب وتمدن، طور وطریق، شکل ولباس، تعلیم وتربیت کی راہوں کی اقتدا کی تیز سے تیز دوڑ میں دوسروں سے آگے بڑھ جائے۔ اور ہر اس ناصح کی تکذیب میں مصروف ہے۔ جو ان کو ان مغضوبوں اور گمراہوں کی پیروی سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔

آج مسلمان نوجوان اپنی زندگی کے ہر پہلو میں اپنے رہنمائے اقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ نہیں۔ بلکہ لینن، اسٹالن، ہٹلر، مسولینی، چرچل اور روزویلٹ کے نمونوں کی تلاش اور ان کے روپ بھرنے میں ہر طرح کوشاں ہیں۔ اور انہی کی پیروی میں مسلمانوں کی نجات سمجھتے ہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

اہل سیاست کو موجودہ مغضوب وضال قوموں کے مذموم تمدن وتہذیب اور بے آئین نظام سلطنت وحکومت، ظالمانہ طریق حکمرانی وفرمانروائی، گمراہانہ طریق تعلیم و تربیت، فاسد اخلاق وکردار اور قزاقانہ اقتصاد ووحشیانہ طاقت اور مجرمانہ سیاست پر افسوس نہیں۔ بلکہ اس پر مسرت ہے کہ اس مجرم، گنہگار، عریاں، خوشنما، فاسد الاخلاق

قزاق اور وحشی طاقت کے حکمران و فرمانروا اور ظالم نظام اقتصاد اور فاسد اصول قضا و عدالت کے مالک ہم کیوں نہ ہوئے۔ ان کو یہ افسوس نہیں، کہ شیطان کا یہ تختِ جبروت کیوں بچھا ہے۔ بلکہ یہ افسوس ہے کہ ہم اس پر کیوں بیٹھے نہیں۔ ان کو شیطان کے تخت الٹنے کی فکر نہیں۔ بلکہ اس پر جلوس فرمانے کی فکر مستولی ہے۔

مسلمان مدت سے اس حالت میں ہیں کہ وہ اپنے کو بھول گئے ہیں۔ اور دوسری قوموں کی نقالی میں مصروف ہیں۔ اسلام ایک مستقل نظام حیات، نظام اقتصاد، نظام سیاست اور نظام اخلاق کا نام ہے۔ خود اپنے نظامات سے روگرداں ہو کر یا ان میں ترمیم و تبدیلی کر کے دنیا کے دوسرے ناقص و فاسد نظامات کو اختیار کرنے میں اپنی زندگی کی نجات جانتے ہیں۔

ٹرکی، مصر، شام، عراق، افغانستان، شمالی افریقہ، ہندوستان غرض وہ جہاں کہیں بھی ہیں۔ خواہ وہ حاکم ہوں یا محکوم، یورپ کی نقالی کو اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وہ دنیا میں قیصریت اور کسروانیت کے علمبردار اور پیغمبروں کی بجائے ہلاکوؤں اور چنگیزوں کے جانشین بن گئے۔ آج انقلاب کا عہد ہے۔ مسلمانوں کو چاہیئے۔ کہ وہ پھر سے اپنی رفتار سمت اور زندگی کے مقصد کو درست کریں۔ وہ اللہ کے محکوم، اس کی شریعت کے حامل اور دنیا میں اس کی شہنشاہی کے نمائندہ بنیں۔ ان کو پہلے اللہ کے قانون کو اپنے اوپر اور پھر اس کے بعد دوسروں کے اوپر نافذ کرنا چاہیئے۔

مسلمانوں کو ان معنوں میں قوم نہیں کہنا چاہیئے۔ جن معنوں میں رنگ اور نسل و نسب اور وطن کے اجزائے ترکیبی سے دنیا میں قومیں بنائی جاتی ہیں۔ بلکہ انسانی جماعتوں کا وہ ایسا مجموعہ ہے۔ جن کی ترکیبی اجزاء خاص خیالات، خاص عقائد، خاص اعمال، خاص اخلاق

خاص تمدن، خاص اصول سلطنت و حکمرانی ہیں۔ اس لئے وہ دوسری قوموں کے ساتھ متحد و محکوم ہو کر نہیں بلکہ مصالحانہ و معاہدانہ اصول پر دوست بن کر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ورنہ ان کا وجود دوسری قوموں کیساتھ مخلوط ہو کر پائدار نہ ہوگا ..... (اسلئے مسلمانوں کو) ضرورت ہے ذہنیت کے بدلنے خیالات کے پلٹنے اور صحیح فکر کو سامنے رکھنے اور صحیح نصب العین کو اپنے دل میں جگہ دینے کی، تاکہ دنیا میں وہ انبیاء علیہم السلام کے نمائندے اور اسلام کا نمونہ بن کر ظاہر ہوں) ....." (معارف نمبر ۵/ج ۵۶/ص ۱۴۶ تا ص ۱۰۶)

ایک دوسری جگہ ارقام فرماتے ہیں:۔

" زمانہ کے حالات جس تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ خوشی کی بات ہے۔ کہ مسلمان اس سے بے خبر نہیں۔ معالجوں کی رایوں میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ مگر مرض کی شدت اور نفسِ علاج کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں۔ قوم ملت کے معالجوں کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو مسلمان قوم کی سیاسی تنظیم کر کے اس کو برسرِ عروج لانا چاہتے ہیں۔ اور پھر ان کو استخلاف فی الارض کا مستحق ٹھہراتے ہیں۔ لیکن اس کیلئے ضرورت یہ ہے کہ اس پیام کے مبلغ اور رہبر پہلے خود کام کے مسلمان بنیں کہ ؎

خفتہ را خفتہ کے کند ہشیار

سچ یہ ہے۔ کہ اس سے پہلے کہ ہم دوسروں پر حکومت کریں، ہم کو خود اپنے نفس کے اوپر حکومت کرنا چاہیئے۔ حق کے پیام پر غیر متزلزل ایمان، احکامِ الٰہی پر بے چون و چرا عمل، حق کی راہ میں مجاہدانہ روح و ثباتِ قدم

عزم راسخ، حق کیلئے ایثار اور ذاتی خودغرضیوں کا استیصال ــ (چاہیئے) کہ دنیا کسی دعوت کو اس وقت تک قبول نہیں کرتی، جب تک داعیوں کے جان و مال کا پورا امتحان نہیں لے لیتی، اور دعوت کے حرفوں کو داعیوں کے خون کی روشنائی میں پڑھ نہیں لیتی۔ یہ خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے اصول ہیں۔ جو نہ کبھی بدلے ہیں۔ نہ بدلیں گے۔

ایک اور نکتہ بھی بھولنا نہیں چاہیئے۔ اسلام اور مسلمان ایک نہیں دو چیزیں ہیں مسلمان اب ایک قوم کا نام پڑ گیا ہے۔ جس کے اسلاف پیام اسلام کے حامل اور تعلیم اسلام کے عامل تھے۔ انہوں نے دنیا پر فتح پائی، اور اپنی مفتوحہ دولت اپنے اخلاف کے سپرد کر دی، زمانہ کے مرور سے یہ اخلاف یہ بھول گئے۔ کہ یہ انعام ان کے اسلاف کو ان کے خاص اوصاف کے صلہ میں ملا تھا۔ جب تک وہ اوصاف رہے۔ وہ انعام ان کے پاس رہا۔ اور جب وہ جاتے رہے۔ تو ان کا یہ انعام بھی چھین گیا۔ اب اگر اس کے حصول کی پھر تمنا ہے۔ تو پھر انہیں اوصاف کو حاصل کرنا ہے۔

مَا كَانَ اللّٰہُ لِيُغَيِّرَ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ـ حکم ناطق ہے نادانی سے ہم لازم کو ملزوم اور ملزوم کو لازم سمجھتے ہیں، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے کسب [illegible] حاصل کرنے چاہیئں۔ اس کے ساتھ سلطنت و حکومت کے اوصاف پیدا ہو جائیں گے۔ یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ پہلے اوصاف حاصل کرو پھر اس کے نتیجوں کی امید رکھو، اگر ان اوصاف کے بغیر کوئی چیز ہم کو رعایت سے ملی بھی۔ تو وہ ہمارے پاس کبھی رہ نہیں سکتی" (معارف شذرات ماہ اپریل ۱۹۴۲ء)

مندرجہ بالا اقتباسات سے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے سیاسی نظریہ پر روشنی پڑتی ہے۔ اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ حضرت والا قدس سرہ عصری سیاست کو خالص اسلامی سیاست نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک عزیز مسترشد کو ارقام فرماتے ہیں:۔

"...... موجودہ سیاست میں اہواء واغراض نے دین کا جامہ پہن لیا ہے ڈوب کر دیکھیے...... " (تذکرہ سلیمان ص۵۵۶)

اس لئے اسمیں سالکین وعلماء کا انہماک پسند نہیں فرماتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ پاکستان کے ایک مشہور پیر کے متعلق فرمایا۔ پیر صاحب کو اب کس طرح ادھر (خالص دین کی خدمت کی طرف) لایا جائے۔ وہ جو یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ سب کچھ سیاست میں ہے۔ مذہب کچھ نہیں۔ منہ کو خون لگ گیا ہے چٹخارہ ہے ؎

اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی۔

۱۹۴۶ء، ۱۹۴۷ء کے "سیاسی طوفان" میں اپنے سیاسی مسلک کی توضیح فرماتے ہوئے اپنے مسترشد خاص برادرِ عزیز مولوی غلام محمد صاحب حیدرآبادی مدظلہ کو تحریر فرماتے ہیں:۔

آپ جس مقام پر ہیں۔ وہ اس مقام سے جہاں عام مسلمان آباد ہیں سراسر مختلف ہے

تو اے کبوتر بام حرم چہ می دانی طپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ برپارا

میں نے سیاسیات کے خارزار سے مدت ہوئی کہ اپنا دامن چھڑا لیا۔ اب جو کچھ ہے وہ مسلمانوں کی دینی وعلمی وتعلیمی خدمات کی بجاآوری کا شوق ہے۔ ان کے علاوہ دیگر امور سے قطعاً عزلت نشین اور مسلمانوں کی صلاح وفلاح کی دعا دل سے کرتا ہوں۔ اس سے زیادہ کیا لکھوں، جذبات کے جوش میں بہنے سے کام نہ چلے گا۔

میں ان تمام نزاعات (اختلافاتِ لیگ و کانگرس وغیرہ) سے عملاً کنارہ کش ہوں۔ اور دل میں مسلمانوں کی خیر و فلاح کے خیال کے سوا کچھ اور نہیں رکھتا۔ اور اسی کا داعی ہوں۔ اور اپنے اختیار کی حد تک اس کا ساعی مجھے سیاسیات کا رہبر نہ سمجھئے .....

خدا کرے کہ آپ دین کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر موجودہ شورشوں کیطرف اتنی نہ کریں۔ جو ادھر سے تغافل ہو جائے، دین ثابت و قائم چیز ہے۔ اور سیاست متبدّل و متغیّر، ہنگامی چیزوں کو اہمیت نہ دیں۔ اور امور دوامی میں مصروف رہیں۔"

انہی کو ان کی ایک سیاسی تحریر اور پھر اس پر پشیمانی کی اطلاع پر ارقام فرماتے ہیں :-

" آپ جس کو گستاخی سمجھے۔ وہ میرے خیال میں سیاسی بحران ہے۔ جس ماحول میں آپ ہیں۔ اس میں اس قسم کے بحرانی جذبات و خیالات کا پیدا ہونا عین مقتضائے طبع ہے۔ اس لئے آپ کے وساوس کا خیال مجھے ذرا بھی نہیں ہوا۔ سمجھتا ہوں۔ کہ آپ کی طبیعت زود اثر ہے۔ کبھی سیاسیات کا جوش طبیعت پر غالب آجاتا ہے۔ موجودہ سیاسیات کا اثر نازک طبائع پر ایسا ہی پڑتا ہے۔ ان تمام ذہنی شورشوں کا علاج یہ ہے۔ کہ پیش آمدہ امور غیر اختیاری ہیں۔ پھر ہماری فکر اور غم کا حاصل ؟ جس امت کی تاریخ میں وفات رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) شہادتِ فاروق رضؓ، عثمان رضؓ جنگ جمل، جنگ صفین، فتنہ حجاج، فتنہ یزید اور شہادت حسینؓ جیسے واقعات پیدا ہوئے ہوں۔

اس کے ہاتھ سے موجودہ سیاسیات کا ہیجان صبر کے دامن کو چھڑا دے۔ اور اللہ تعالیٰ کے حاکم و حکیم بیک وقت ہونے کے اعتقاد سے کیوں تغافل ہو؟

اس تفصیل کا منشاء یہ ہے کہ ہنگامی جوش و خروش یا سردی و مایوسی سے مومن نہ گرم ہو اور نہ نرم ہو، اپنے کام میں یکساں لگا رہے۔

خطرات کے علاج دو ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حکیم اور حاکم ہونے کا استحضار اور دوسرے ہنگامی اور دوامی امور میں فرق کا احساس"

راقم کی ایک سیاسی ناکامی پر ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچا لیا"۔ اور ایک دوسرے موقع پر ایک صاحب سے میری اس ناکامی کا تذکرہ کر کے فرمایا "سیاست کا کچھ تجربہ انہیں ہوا ہے۔ اب سمجھتے ہیں۔ کہ یہ کونین کی کڑوی گولی ہے۔" اور اسی کے متعلق مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا "الخیر فیما وقع۔ بہرحال آپ کو سیاسیات کا تھوڑا سا تجربہ ہو گیا" اپنے اس زمانہ کے سیاسی انہماک کی وجہ سے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضری ہوتی۔ تو سیاسی باتیں اکثر چھیڑ دیتا۔ ایک مرتبہ ندامت کے طور پر عرض کیا "حضرت آپ کی مجلس کے آداب بجا نہیں لاتا، اور سیاسی بکواس شروع کر دیتا ہوں"۔ فرمایا۔ "کیا حرج ہے۔ انسان وہی اگلتا ہے۔ جو اندر ہوتا ہے۔ اچھا ہے قے ہو جائے گی۔"

خدا کی شان حضرت کے اس ارشاد کے بعد روز بروز سیاسی جھمیلوں سے بیزاری اور عملی سیاست سے کنارہ کشی کا میلان بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ تعلیمی خدمت میں مشغول ہو کر رہ گیا۔ جب حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس کی اطلاع دی گئی۔ تو ارقام فرمایا۔ "جماعتی ماحول میں اتنی کثیف گندگی ہے۔ کہ اس کا ازالہ ہم ضعفاء سے ممکن نہیں۔" تاہم حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے آخر وقت تک سیاست کے چھوڑنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ میری آخری

حاضری کے ایام میں ایک مرتبہ جب سیاسی خرابیوں کا تذکرہ چھڑا۔ اور ایک دوسرے صاحب نے راقم سے کہا آپ اس گندی سیاست کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ حضرت والا قدس سرہ نے اس موقع پر فرمایا۔ "یہ معاملہ ہر ایک کی اپنی قوت وضعف اور نیت کا ہے، ایک مرتبہ راقم نے تحریر کیا کہ۔ "موجودہ سیاست کے ساتھ چلنا اور انہیں صحیح بنیادوں پر اٹھانا نہایت ہی دشوار کام ہے۔ قدم قدم پر پاؤں ڈگمگاتے ہیں، اللہ تعالیٰ رحم فرماویں۔" اس کے جواب میں ارقام فرمایا۔

"تو پاک باش مدار از کس باک"

ایک مرتبہ راقم بغیر اپنی کوشش کے ایک اہم سیاسی جماعت کا عہدہ دار بنا دیا گیا۔ حضرت والا کو مطلع کیا، تو حضرت نے تحریر فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ اس کی قوت آپ کو عطا کریں۔ جب واقعہ ہو چکا تو مشورہ دینے کا موقع نہیں، اللہ تعالیٰ بہتر کریں۔"

رفقاء کے پیہم دباؤ کی بنا پر عاجز نے سرحد اسمبلی کی ممبری کے لئے کھڑے ہونے کا مشورہ طلب کیا۔ تو نہایت ہی بلیغ جواب تحریر فرمایا:۔

"یہ معاملہ اپنی قوت وضعف کا ہے۔ اگر آپ یہ قوت اپنے میں پاتے ہیں یا کم از کم ارادہ رکھتے ہیں۔ کہ مواقع خیر میں خیر کی اعانت کریں گے۔ تو کھڑے ہو جائیں مگر انتخاب کیلئے وہ مکائد و وسائس کام میں نہ لائیں جو اہل دنیا اور طالبِ جاہ ومال کرتے ہیں۔ پس جاہ ومال کی طلب سے خالی ہو کر کرنے کی طاقت پائیں تو کھڑے ہوں۔"

ایک مرتبہ چند شامی نوجوان خدمت میں حاضر ہوئے اور نظام اسلامی اور شریعت کے نفاذ پر بات چیت ہوئی۔ ان کے رخصت ہونے پر حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فقیر

سے فرمایا ۔

"آج ہر جگہ نوجوانوں میں دینی احیاء اور شریعت کے نافذ کرنے کا جذبہ ہے لیکن کیا کیا جائے کہ سٹیرنگ دوسروں کے ہاتھ میں ہے ۔"

مذکورۂ بالا ارشادات سے سیاست کے متعلق حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے مسلک پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے ۔ کہ سیاست کو مقصد سمجھ کر اس میں انہماک کو پسند نہیں فرماتے تھے، لیکن اگر سیاست کو دین و خیر کے فروغ کا سبب و ذریعہ سمجھکر کمال احتیاط سے اپنے کو حب مال وجاہ کی آلائشوں سے بچاتے ہوئے اس میں شرکت کیجائے ۔ تو مسلک سلیمانی میں اس کی گنجائش ہے ۔ لیکن یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں اور حضرت شیخ کے ہی الفاظ میں جماعتی کاموں میں اتنی کثیف گندگی ہے ۔ کہ اس کا ازالہ ہم ضعفاء سے ممکن نہیں ۔ اس لئے عموماً حضرۃ الشیخ قدس سرہ کی طالبین کو ہدایات اس طرح کی ملتی ہیں کہ

۱۔ ضرورت اس کی ہے ۔ کہ سیاست سے بے پرواہ ہو کر دین کی خدمت میں مصروف ہوا جائیے ، اخلاص کے ساتھ اس (تبلیغی) کام کو جاری رکھیں ، اور کبھی اس میں اپنے اندر استکبار اور دوسروں کے باب میں استحقار نہ آنے دیں ۔"

۲۔ اگر میرے مشورہ پر عمل کیا جائے تو عملاً ان (لیگ و کانگرس) میں سے کسی میں شریک نہ ہوں ، اور اس کیلئے دعا کریں ۔ جو اللہ تعالیٰ کے علم میں مسلمانوں کیلئے خیر ہو ۔ اتق الفرق کلھا ۔"

۳۔ خالص دینی تقریر جاری رکھئے ۔ سیاسیات سے کامل پرہیز ۔

۴۔ جہاد صرف کانگرس کی ممبری اور اس کیلئے جیل جانے کا نام نہیں ۔ بلکہ دین کی بلندی اور اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے تکالیف جانی و مالی کو گوارا کرے ۔ یہانتک کہ جان بھی اس راہ میں چلی جاوے ۔ گو جان دینے کے بھی شرائط ہیں ۔

۵۔ "پہلے تو یہ سمجھیں کہ جہاد اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے سعی و کوشش بالنفس والمال کا نام ہے۔ وہ کسی بادشاہ کی سلطنت کے قیام کیلئے نہیں جسکو آجکل سمجھا جاتا ہے۔ قومی حکومت و سلطنت جسکا تصور آجکل ہے۔ وہ بھی اعلاء کلمۃ اللہ سے دور ہے ..... صحیح راہ یہ ہے کہ دل میں جہاد کی تمنا رہنی چاہیئے۔ اور وقت پر اس کا ظہور ہو"

غرض حضرت والاؒ طلبہ و علماء اور سالکین کا سیاست میں الجھنا پسند نہیں فرماتے تھے کہ حضرت شیخؒ کے نزدیک جو کام ان کے سپرد ہے۔ وہ اتنا ضروری و اہم ہے کہ اسکا ترک یا اہمال ملت کے بنیادی نظام اور تعلیم و تربیت کیلئے نقصان دہ ہے۔ تاہم جیسا کہ گذر چکا۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی وسعتِ بصیرت اور عمقِ نظر نے کلیتہً ان طبقات کیلئے سیاست کو "شجر ممنوعہ" نہیں قرار دیا۔ بلکہ اس بارے میں حضرت سید الملۃؒ کا یہ جملہ قول فیصل ہے۔ یہ معاملہ (سیاست میں شرکت یا عدم شرکت) ہر ایک کی اپنی قوت و ضعف اور نیت کا ہے۔

مراد یہ ہے۔ کہ اگر مواقعِ خیر میں، اعانت اِحقاق حق اور ابطال باطل اور خدمت دین و ملت کی قوت و ہمت پاتا ہو تو گنجائش ہے۔ اور اگر یہ ہمت و عزیمت نہ ہو تو عملی سیاست سے کنارہ کشی ہی قرینِ صواب ہے۔ اپنے دائرہ میں خدمتِ دین اور تعمیر ملت کے کاموں میں کمی نہ کرے، امت کی دینی و ذہنی تعلیم و تربیت کی اہمیت کو جانے اور صدق و اخلاص سے ملت کی صحیح رہنمائی کی کوشش تحریر و تقریر اور دیگر ذرائع سے کرتا رہے۔ کہ ملت کے 'دل و دماغ' کی تربیت و آبیاری سیاست کے خارزار کی آبلہ پیمائی سے کس طرح کم نہیں وَاللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَھُوَ یَھْدِی السَّبِیْل

عسکریّت

جہاد بالنفس جہاد بالسیف سے کم نہیں۔ بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ مکی زندگی کا جہاد بالنفس جس طرح مدنی سرفروشانہ (عسکری زندگی کا تربیت گاہ وپیش خیمہ تھا۔ اسی طرح صحیح خانقاہی زندگی انسان میں جہاد وقتال فی سبیل اللہ کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔ خاتم النبین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالی وجمالی شان کے مظاہر بدر وحرا اور حنین وشعب آبی طالب دونوں ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خصوصی صفت یہ تھی۔ کہ وہ رات کو عابدِ شب زندہ دار اور دن کو میدانِ جنگ کے شہسوار تھے۔ کامل اسلامی زندگی کی یہ جلالی (عسکریت) اور جمالی (سلوک وتصوف) شانیں ہم نے اسی مردِ حق آگاہ (حضرت سیدی قدس سرہ) میں پائیں۔ حضرت سید الملۃ نور اللہ مرقدہٗ کے سلوک کی یہ دوگونہ دلکشی اس ذات جمیل وجلیل صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض تھا۔ جو اس عالم میں جمالی اور جلالی صفات الٰہیہ کا برزخ کامل تھا۔

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشین کا ، بشیری ہے آئینہ دار نذیری

متعدد بار حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس عاجز کو تلقین وترغیب کے طور پر اپنے مخصوص انداز میں فرمایا۔" آپ کو عسکریت سے دلچسپی نہیں ؟"

۱۴ اگست ۱۹۵۳ء کو یوم پاکستان کے سلسلہ میں ہوائی مظاہرہ اور فوج کی پریڈ تھی

اس سے پہلی رات مجھ سے استفسار فرمایا۔ کہ آپ مظاہرہ دیکھنے جائیں گے؟ میں نے نفی میں جواب دیا۔ تو ارشاد فرمایا۔ "آپ کو عسکریت سے دلچسپی نہیں"۔ ایک دوسرے طالب کے انکار پر فرمایا۔ "آپ صرف خانقاہی زندگی سے دلچسپی رکھتے ہیں"۔ پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "ان فوجوں کو دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے۔ کم ازکم انہیں اپنی فوجیں تو کہہ سکتے ہیں"۔ ان ارشادات سے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی عسکریت سے دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو عصری سلوک میں شاید ہی کہیں نظر آئے۔

ایک سالک کو اشکال پیش آیا۔ کہ ہندوستان میں گنتی کے چند بزرگوں کے علاوہ اکابر صوفیہ نے اور خاصکر گذشتہ صدی کے حضرات نے جہاد کی طرف کیوں توجہ نہیں فرمائی"۔ حضرت شیخ قدس سرہٗ نے حکیمانہ طرز میں اس اشکال کو رفع فرمایا۔ ارقام فرماتے ہیں:۔

"پہلے تو یہ سمجھیں۔ کہ جہاد اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے سعی و کوشش بالنفس و بالمال کا نام ہے۔ وہ کسی بادشاہ کی سلطنت کے قیام کیلئے نہیں، جسکو آج کل سمجھا جاتا ہے۔ قومی حکومت و سلطنت جس کا تصور آجکل ہے۔ وہ بھی اعلاء کلمۃ اللہ سے دور ہے۔ پھر اکابر صوفیہ جس وقت ہوئے ہیں۔ اس زمانہ میں کسی نہ کسی معنیٰ میں مسلمانوں کی سلطنتیں قائم تھیں۔ اس لئے انہوں نے مسلمانوں کو خدا کی حکومت کے مطابق بنانے میں کوششیں کیں۔

ہندوستان کی گذشتہ صدی کے کارناموں کیلئے آپ "علماء کا شاندار ماضی" کتاب محمد میاں مرادآبادی کی پڑھیں۔ یہ سب حضرات مجاہد تھے۔ خود حضرت حاجی امداداللہ صاحب مولانا قاسم صاحب، مولانا رشید احمد صاحب مجاہدین میں تھے۔ اور خلفائے مولانا اسمٰعیل شہید کے کارنامے بھی پڑھیں جنکو مسعود عالم ندوی نے لکھا ہے۔

صحیح راہ یہ ہے کہ دل میں جہاد کی تمنا رہنی چاہیئے - اور وقت پر اس کا ظہور ہو۔" (تذکرہ سلیمان صد ۵۶۱، صد ۵۶۲)

اسی سالک نے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کو تحریر فرمایا۔" احقر فی نفسہٖ حضرت اسمٰعیل شہیدؒ کی زندگی ہی کو ٹھیک ٹھیک اتباع سنت کا حامل سمجھتا ہے۔ کیونکہ یہاں تسبیح وسجادہ اور شمشیر وسناں کی جامعیت پائی جاتی ہے - اور خود احقر کی تمنا بھی یہی جامعیت پیدا کرنے کی ہے حضرت الشیخؒ طالب وماحول پر نگاہ رکھتے ہوئے کیا بلیغ جواب تحریر فرماتے ہیں :-

" صحیح ہے۔ مگر حضرت اسمٰعیلؒ کہاں ہیں! بہر حال کوشش ہر ایک کو چاہیئے"

ایک اور صاحب کو تحریر فرمایا :-

" یہ راہ ہمت اور عزیمت کے بغیر طے نہیں ہوتی - اسی کا نام مجاہدہ ، و جَاهِدُوا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۔ اللہ کی راہ میں پورا پورا مجاہدہ کرو۔ مجاہدہ یہی ہے۔ کہ نفس کی باطل خواہشوں سے اعراض برت کر مقصدِ حق کو پورا کیا جائے - اور اسی پر دین و دنیا دونوں کی کامیابی منحصر ہے۔"

بعض عصری غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :-

" دین صرف اطاعت الٰہی کا نام ہے - اسلیئے بے شبہ دین کی بلندی و اقامت اور اس کے کلمہ کے اعلاء کی راہ میں جدوجہد جہاد اور قتال فریضہ اُمت ہے ہو اس کے پورے شعبوں کو بروئے کار لانے کیلئے اقامت دین کے اس شعبہ سے بھی چارہ نہیں - جس کا نام زمین کی بالآخر قوت آمرہ یا حکومت دینیہ ہے - بلکہ خالص اطاعت الٰہی اور اقامت دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کیلئے جس مومن کے دل میں مجبوریوں کے باوجود (اقامتِ دین کے اس

شعبہ کو بروئے کار لانے میں) حصہ لینے کی تمنا اور آرزو یا حدیث نفس بھی پیدا نہ ہو۔ وہ کمالِ ایمان سے محروم ہے۔ لیکن یہ فرض حیاتِ دنیا کی آرائش کیلئے نہیں بلکہ حیات اخروی کی فوز و فلاح کی نیت سے ادا کیجئے .....

کہ اسلام کو مطلق حکومت نہیں۔ بلکہ خاص نوع کی حکومت مطلوب ہے کیونکہ اسلام میں "استخلاف فی الارض" ایمانِ کامل اور عمل صالح کے ساتھ محدود ہے۔ اسلئے براہ راست "استخلاف فی الارض" کی ہر دعوت غلط ہے اور ایمانِ کامل اور عمل صالح کی اصل دعوت دے کر اس کے نتیجہ میں 'استخلاف فی الارض' کی امید عین مطلوب ہے۔ پہلی دعوت کا منشاء صرف متاع الحیٰوۃ الدنیا کی تلاش ہے۔ جس کی قرآن پاک نے تحقیر کی ہے۔ اور دوسری دعوت عین اسلام اور عین دین ہے۔ جس کا منشاء اِنَّ الدَّارَ الْآخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ کی حقیقی تفسیر اور ان الدنیا خلقت لکم و انکم خلقتم للاخرۃ (دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو) کی اصلی تصویر ہے۔"

(مقدمہ مولانا سندھی اور انکے خیالات وافکار پر ایک نظر ص ۲۰۱/۲ الف)

ایک سالک کے "پیر کامل کے اوصاف کیا ہوں .." کے استفسار کے جواب میں اس بات کی تصریح فرمائی۔ کہ اجتماعی پہلو جو شرع کے مطابق ہوں۔ پیر کے دائرہ سے خارج نہیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں :-

حضرت والا (مولانا تھانوی) رحمۃ اللہ علیہ نے (پیر کامل کے) جو معیار بتائے ہیں۔ وہ تمام تر حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و محاسن

ہی کو پیش نظر رکھ کر بتائے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ "اس کے عقائد و اعمال تمام تر شرع کے مطابق ہوں" تعبیر کا فرق ہے۔ آپ شرع کی جگہ اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکھ دیجئے۔ ایک ہی بات ہے اجتماعی پہلو اگر شرع ہے۔ تو وہ بھی اس میں آگیا۔ اگر موجودہ زمانہ کی سوشل و پولیٹیکل تحریکات ہیں تو ان کی نسبت بھی وہی سوال ہے۔ کہ کیا وہ شرع سے باہر ہیں؟ اگر ایسا نہیں تو انفرادی و اجتماعی کوئی پہلو شرع کے دائرہ سے خارج نہیں۔"

(تذکرہ سلیمان صہ۲۹۲/صہ۲۹۳)

دعوت و تبلیغ

اسلام میں تبلیغ و دعوت کی جو اہمیت ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ امت مسلمہ ایک داعی امت ہے۔ جسکا آسمانی صحیفہ دعوت کے نغموں سے پرشور اور جسکے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اسوہ سراپا تبلیغ ہے۔ تاہم یہ دعوت و تبلیغ ایک خاص ترتیب اور اپنے حکیمانہ اصول و آداب رکھتی ہے۔ جس کے بغیر ہر کلمہ خیر شر کا باعث اور ہر تحریک عمل ضلالت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس لئے حضرت سید الملۃ رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے مسترشدین کو اس پرخار گھاٹی کے نشیب و فراز سے اور اس کی نزاکتوں سے آگاہ فرماتے رہتے تھے۔ اور اس میدان میں اترنے سے پہلے جن اوصاف و محامد کی ضرورت ہے۔ ان کے پیدا کرنے کی پیہم تلقین تھی۔ تبلیغ و دعوت کے متعلق حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کا خاص نظریہ تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ سالکین بغیر اپنی اصلاح کے اس میدان میں کود پڑیں۔ حضرت شیخ کے نزدیک سالک کو پہلے اپنی فکر کرنی چاہیئے۔ اس کے بعد دوسری طرف متوجہ ہو۔ ورنہ جو خود پاک نہیں وہ دوسروں کو پاک نہیں بنا سکتا۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دعوت کی صحیح ترتیب یہ تھی کہ پہلے اپنی اصلاح

کی فکر کیجائے۔ اس کے بعد دوسروں کی، یہ نہ ہو کہ اپنی اصلاح سے غفلت تام ہو۔ اور دوسروں کے غم میں گھلنا شروع کر دے۔ اس سے نہ دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہے، اور نہ اپنی اصلاح ہوتی ہے۔ جو خود مجسم تاریکی ہو، وہ دوسروں کو کیا روشن کر سکتا ہے، دلوں کی زندگی اللہ کے فضل اور زندہ قلوب کی تاثیر سے میسر آتی ہے۔ مردہ دل کسی کی کیا مسیحائی کریں گے۔ الفاظ کی رنگینی، زبان کی روانی اور قلم کی جولانی سے دلوں کی ہدایت نہیں ہوتی یہ نورِ خداوندی عطیۂ الٰہی اور زندہ دل بزرگوں کی صحبت سے میسر آتا ہے۔ قلبی ہدایت کے بغیر منبر اور سٹیج کی تقریروں یا کتب و رسائل کی تحریروں سے وقتی جوش و تاثر تو پیدا ہو سکتا ہے علم میں بھی ایک گونہ اضافہ اور ذہنی تسلی بھی ایک حد تک ہو سکتی ہے۔ لیکن روح و قلب کی دنیا شاذ ہی ان سے بدلتی ہے۔ آرام باغ کراچی میں ایک جلسہ منعقد ہونے والا تھا داعی جلسہ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی، کہ آپ جلسہ میں تشریف لیجاویں اور تقریر فرماویں۔ تاکہ ہماری اصلاح ہو جائے۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے انتہائی بلیغ جواب دیا۔ " اصلاح آرام باغ میں نہیں، حجرہ میں ہوتی ہے۔" سچ ہے

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا ۔ دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

دوسروں کی فکر سے پہلے اپنی فکر ایک طالب نے لکھا۔ " دل کا تقاضہ بار بار یہی ہوتا ہے۔ کہ دین کی خدمت کا کام مجھ سے بن جائے۔" محقق شیخ نے جواباً ارقام فرمایا۔

" دل کا تقاضا بجا ہے۔ لیکن اس کا منشاء یہ ہے کہ آپ دوسروں کی اصلاح کا کام کریں۔ اس سے ایک دعوٰی کی صورت نکلتی ہے۔ یعنی یہ کہ آپ خود کو اپنی اصلاح سے فارغ پاتے ہیں۔ اور اپنے کو ہر نقص سے پاک اور کامل و مکمل سمجھتے ہیں۔ نوّے فی صد لوگ اسی غلطی میں مبتلا ہیں۔ اور اسلئے دوسروں

کی اصلاح کیلئے تو بیتاب ہیں مگر اپنی اصلاح سے فارغ ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ ہمارے اندر کام کے آدمی پیدا نہیں ہوتے۔ اگر آپ اپنے ہاتھوں سے ناپاک کپڑے کو پاک کرنا چاہتے ہیں۔ تو آپ کا فرض ہے۔ کہ پہلے آپ اپنے ہاتھوں کو پاک کریں۔ اسلئے دوسروں کی فکر سے پہلے اپنی فکر کر لیجئے۔ اور اس حکیمانہ فقرہ کا مطلب سمجھئے۔" اول خویش بعدہٗ درویش" اسلئے میری نصیحت ہے کہ دوسروں کی برائیوں اور عیبوں پر نظر ڈالنے سے پہلے خود اپنی برائیوں اور عیبوں پر نظر ڈالیئے۔ ع

پڑی اپنے عیبوں پہ جب نظر ، تو جہاں میں کوئی برا نہ رہا

اب ذرا پرائے اور بیگانہ سے قطع نظر کر کے تھوڑی دیر اپنی ہی تاک میں آپ بیٹھئے اور غور کیجئے ، کہ آپ میں کیا عیب ہے ...."

اسی طرح ایک دوسرے طالب نے لکھا۔" اصلاحِ خلق کا خیال چھا جاتا ہے۔ اور اپنی طبیعت کڑھتی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اللہ اپنے دین کے پھیلاؤ کا ذریعہ اور سبب بنائیں" سیدی قدس سرہٗ نے لکھا۔" جی ہاں اس اصلاح خلق سے مقصود پس پردہ اپنی اصلاح ہونی چاہیئے۔ ورنہ جو خود پاک نہیں۔ وہ دوسروں کو پاک نہیں بنا سکتا۔" دوسرے مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا۔

" دوسروں کے افادہ پر نظر رکھنے سے پہلے اگر اپنے استفادہ پر نظر نہ رہے، تو افادہ موثر بھی نہیں ہوتا، اپنے نفس کا حق دوسروں کے حقوق سے اہم و اقدم ہے۔ ولنفسك عليك حقا اسلئے پہلے اپنی بہی خواہی کیجئے، پھر دوسروں کی استادی تک پہنچنے سے پہلے استاد بننے کی غلطی سے محفوظ رہیئے۔ آپ تبلیغی جماعت کے ساتھ

کام توکریں۔ مگر نظر اپنے اوپر ہو، اور اپنی درستی کی نیت ہو۔

اسی طالب نے حضرت سیّدی قدس سرہٗ کو لکھا کہ۔" اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ اب طبیعت اپنے کو بھلا کر دوسروں کے فکر میں سرگرداں نہیں رہتی۔ جواباً ارقام فرمایا :۔

" بالفعل یہ کیفیت اچھی ہے۔ ایک وقت آئے گا، انشاء اللہ تعالیٰ جب فَذَكِّرْ إِنْ نَفَعَتِ الذِّكْرَىٰ۔ کی تعمیل ہوگی۔ مگر فطری ترتیب یوں ہی ہے۔ کہ اول خویش بعدہ درویش "

ایک طالب کو جو تبلیغی جماعت کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے تحریر فرمایا :۔

" اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی میں برکت دیں۔ اس تبلیغی سلسلہ میں صرف ایک احتیاطی تنبیہ کی ضرورت ہے۔ اور وہ یہ کہ غیر کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح پر نظر رہے۔ اور غیر کی اصلاح کی فکر بھی اپنی اصلاح اور حصول اجر کی خاطر ہو۔ تفوق اور دینی بڑائی کا خیال بھی نہ آئے۔

ایک اور طالب نے لکھا۔" طبیعت چاہتی ہے۔ کہ سوائے اپنی اصلاح کی فکر کے اور کوئی کام نہ کیا جائے۔ اس وجہ سے تبلیغ میں بھی رکاوٹ ہوتی ہے۔ کیا یہ جذبہ صحیح ہے ؟" حضرت شیخ نے رقم فرمایا :۔ " بے شبہ اول خویش بعدہ درویش ہے۔ پہلے خود بنئے پھر دوسروں کو بنائیے، یہ جذبہ صحیح ہے۔" دوسرے گرامی نامہ میں تحریر فرمایا۔" یہ جذبہ بالکل صحیح ہے۔ اگر ہمارے ہاتھ گندے ہوں۔ تو ان ہاتھوں سے ہم دوسروں کو پاک نہیں بنا سکتے۔"

ایک طالب نے لکھا "طبیعت قوم کی خدمت اور کام کرنے کو چاہتی ہے۔ لیکن گھر والوں کی خدمت اور قومی خدمت ایک دوسرے کی منافی معلوم ہوتی ہے! کسے ترجیح دی جائے؟" حضرت والاؒ فرماتے ہیں:۔

"قومی خدمت کیا چیز ہے؟ گھر والوں کی خدمت تو میں سمجھا۔ قومی خدمت تو کوئی چیز مجھے معلوم نہیں ہوتی، ہاں دین کی خدمت اور مسلمانوں کی خدمت تو میں جانتا ہوں، مگر اس خدمت کیلئے تیاری کی ضرورت ہے، جو ابھی آپ کو حاصل نہیں، ابھی تو آپ اپنی خدمت کیجئے۔"

اس زمانے میں یہ مرض عام ہے۔ کہ مسلمان عموماً اپنی اصلاح کی فکر سے بے نیاز رہ کر ملت کی زبوں حالی اور تباہی کا رونا روتے ہیں۔ گو کچھ لوگوں کا جذبہ حسن نیت پر مبنی ہوتا ہے۔ مگر مرض کا ازالہ مرثیہ خوانی اور کفِ افسوس ملنے سے نہیں ہوتا بلکہ اس کا صحیح علاج پہلے اپنی اس کے بعد دوسروں کی اصلاح ہے۔

محمد داؤد جان مرحوم ایک صالح اور ملت کا درد رکھنے والے مسلمان تھے۔ انہوں نے حضرت سید الملۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کو ملت کی زبوں حالی کی پر اثر داستان لکھ بھیجی، اس کا جواب حضرت شیخ نے مرحمت فرمایا۔ وہ ملت کی اصلاح کا درد رکھنے والے ہر سچے مسلمان کیلئے سرمہ بصیرت ہے۔ پورا خط درج ذیل ہے:۔

اِنَّہٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَاِنَّہٗ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مکرمی و محترمی۔ وفقکم اللہ تعالیٰ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کا عنایت نامہ ملا۔ اور آپ کے مذہبی ولولوں کی بڑی قدر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صراط مستقیم پر قائم رکھ کر اپنی اصلاح

اور تزکیہ کی بیش از بیش توفیق عنایت فرماویں۔

آپ کا کہنا سب سچ ہے۔ لیکن اصلاح کی تدبیر کیا ہے۔ وہ لوگوں پر یا مسلمانوں پر ماتم نہیں ہے۔ بلکہ سب سے پہلے خود اپنی حالت پر ماتم ہے۔ اور جب اپنی اصلاح سے فراغت ہو جائے۔ تو دوسروں کی فکر ہو۔ صرف دوسروں کی فکر صرف زبان سے کرنا اور اپنے سے غافل رہنا لیڈرانہ شان ہے۔ میری مخلصانہ خواہش ہے۔ کہ ہم لوگ سب سے پہلے اپنے اپنے احوال پر نظر کریں۔ اپنی صحت روحانی و اخلاقی و دینی کی فکر کریں۔ اس کے ساتھ اپنے اہل و عیال اور اپنے خاندان کی خبر گیری کریں۔ اور ان کی اصلاح کی فکر میں لگیں۔ انشاء اللہ اگر ہم اس طرف متوجہ ہونگے۔ تو سارے مسلمانوں کی حالت بدل جائیگی۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت کے ہم مستحق ہوں گے۔ کیا آپ اس نکتہ پر غور فرمائیں گے۔

والسلام سید سلیمان ۲ مئی ۱۹۵۱ء "

اِسی طرح ایک دوسرے طالب کو ارقام فرمایا :۔

" بے شبہ امت مرحومہ کی پریشان حالی اور پراگندگی کی کیفیت آپ کو متاثر کرتی ہوگی، مگر غور کیجئے کہ اس کا علاج آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جب آپ کی استطاعت سے وہ چیز خارج ہے۔ تو اس کی فکر میں پڑ کر اپنا وقت آپ کیوں ضائع کرتے ہیں۔ یہ تو لیڈرانہ قسم کا ایک مرض ہے۔ آپ کو اختیار اپنے اوپر اور اپنے اہل و عیال اور متبعین کے اوپر ہے۔ آپ اپنی اور ان کی اصلاح کی فکر فرمائیں۔ کہ یہ آپ کی استطاعت میں ہے۔ آپکی شدتِ

احساس سے متاثر ہوا، خدا کرے کہ یہ احساس صحیح موقع پر صرف ہو۔"

اس کی مزید تشریح دوسرے مکتوب گرامی میں اس طرح فرمائی ہے:۔

"میرا مقصد یہ تھا کہ انسان کو پہلے اپنی پاکی کی کوشش چاہیئے، اس کے بعد دوسرے کی فکر چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ موجودہ سیاسی لیڈروں کی طرح دوسروں کی فکر تو ہو۔ مگر خود اپنی فکر سے غفلت تام ہو۔ اس سے نہ اپنا ہی بھلا ہوتا ہے۔ نہ دوسروں کا۔"

اسی قسم کی ایک اور تحریر کے جواب میں ارقام فرمایا:۔

"آپ کا خط پاکر بہت خوشی ہوئی، کہ آپ کے دل میں دین کا درد ہے جو اس زمانے کے مسلمان نوجوانوں میں کم ہے۔ آپ نے جو تجویز سوچی ہے وہ سردست ناممکن العمل ہے۔ آپ ماشاء اللہ ابھی نوجوان ہیں۔ خیالات کی وسعت میں سیر کناں ہیں، بہتر یہ ہے، کہ آپ دوسروں کو چھوڑ کر پہلے خود اپنی اصلاح کی فکر کریں، آپ ماشاء اللہ سعادتمند ہیں۔

شنو ایں پند از حافظ کہ از جاں دوست تر دارند

جوانانِ سعادت مند پند پیر دانا را"

حضرت والاؒ کو ایک طالب نے تحریر کیا کہ۔ "اللہ تعالیٰ مجھے دین کی خدمت اور عالم میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم والے طریقۂ زندگی کی ترویج کا ذریعہ بنالے" حضرت سیدیؒ نے جواب تحریر فرمایا:۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالےٰ آپ سے یہ کام لیں۔ اور آپ کو پہلے اپنا بنائیں اور پھر دین کی خدمت کا ذریعہ آپ کو بنائیں اور تبائیں۔"

اس مختصر دعاء میں صحیح دینی دعوت کا خلاصہ ہے کہ دعوت کی پہلی شرط اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات کا قرب و تعلق ہے۔ جو اصلاح ظاہر و باطن کا حاصل اور طاعتِ الٰہی اتباع نبوی اور ذکر غالب کا ثمرہ ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی کا تعلق ہے۔ جو داعیان حق کی ہر حالت میں دستگیری و رہنمائی کرتا ہے۔ عالم میں ہدایت کے ان چراغوں کی روشنی اسی تعلق سے عبارت ہوتی ہے۔ یہ تعلق جتنا قوی ہوگا۔ اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا پرتو اس داعی کے ذریعہ منعکس ہو کر دلوں اور روحوں کو ہدایت کے نور سے معمور کرتا رہے گا۔

تعلق مع اللہ کے ساتھ دین کی خدمت کا طریقہ بھی عند اللہ صحیح ہونا ضروری ہے ورنہ انسان بعض اوقات اپنے زعم میں ایک کام دینی خدمت سمجھ کر کرتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ دین کو نقصان پہنچا دیتا ہے۔ اس لئے دعوت کا علیٰ منہاج النبوۃ ہونا ضروری ہے۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا شاہ محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت کے دو مخلص خادم حاضر ہوئے اور دعوت پر گفتگو شروع ہوئی، ہمارے سید صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا۔ مولانا الیاس تو مامور من اللہ تھے، ورنہ کہاں بنگلہ والی مسجد اور کہاں اللہ تعالیٰ کا حرم اور بدر کا میدان" (اشارہ تبلیغی کام کے ان مقامات تک پہنچنے کی طرف تھا)۔ ان حضرات میں سے ایک صاحب (مخدومی محمد شفیع قریشی صاحب) نے عرض کیا مولانا (الیاس) فرماتے تھے کہ "یہ کام تو ہمیں نظر آ رہا ہے۔ کہ ہو کر رہے گا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے۔ کہ اصولوں کے مطابق ہو" فرمایا "جی ہاں، اصولوں کی پابندی ضروری ہے" پھر فقیر سے مخاطب ہو کر فرمایا۔" مولانا الیاس کی سوانح کا مقدمہ جو میں نے لکھا ہے۔ آپ نے پڑھا ہے" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ فرمایا،

اس کی شرح لکھ سکتے ہو، مقدمہ گو مختصر ہے لیکن قرآن وحدیث سے مطابقت دے کر اس کو بڑھایا جا سکتا ہے"۔ اس واقعہ کے نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت والاؒ تبلیغی دعوت کا دینی اصولوں کے مطابق ہونا نہایت ضروری سمجھتے تھے۔ ورنہ وہ سراسر فتنہ بن سکتی ہے۔ ایک مرتبہ راقم سے فرمایا۔ لوگوں کو سختی سے دین کی طرف نہیں بلانا چاہئیے۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا منشاء شفقت تھی، لوگوں کو اپنی ہمدردی کا یقین دلائیے، پھر پیار سے دین کی طرف بلائیے۔

تو برائے وصل کردن آمدی ، نے برائے فصل کردن آمدی

ایک صاحب کو جنہوں نے اپنے متعلق جرأت حق کی کمی اور مداہنت کا اندیشہ ظاہر کیا تھا، ارقام فرمایا:۔

"جرأت حق نام حق کو خوبی اور نرمی کے ساتھ ظاہر کر دینا ہے۔ سختی اور سخت کلامی کی ضرورت نہیں۔ کہ وہ تو کام کو اور خراب کر دیتی ہے۔" اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ۔" (النحل - ۱۲۶)

ایک دوسرے گرامی نامے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"حق گوئی ہو مگر اس طرح کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کوئی کام دیکھیں تو اس موقع پر حق گوئی مفید ہے۔ جب لوگ آپ کی بات سننے کو آمادہ ہوں۔ ورنہ قلب سے اس کو برا سمجھیں۔"

اس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ اپنے متوسلین کو دعوت و

تبلیغ سے منع فرماتے تھے، بلکہ حضرت کا یہ منشاء تھا کہ دعوت سے پہلے اپنی اصلاح ہو اور دعوت صحیح اصولوں کے مطابق ہو۔ ورنہ دعوت و تبلیغ کا جو جذبہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں تھا، اسکی مثالیں کم ملیں گی۔ ایک مرتبہ نہایت درد سے فرمایا

"آج سب دعوتیں موجود ہیں، لیکن دین کی دعوت (جیسی ہونی چاہیئے) موجود نہیں تمام نظام و مجلسیں دعوت کے زور سے قائم ہیں۔ سوشلزم ہو یا جمہوریت، لیگ ہو کانگرس ہر چیز دعوت سے قائم ہے، یہ اسلام کی کرامت ہے۔ کہ اندر باہر سے اس قدر مار اور زد پڑنے کے باوجود کچھ لوگ اب بھی اسلام پر قائم ہیں۔ اخبارات ہوں یا ریڈیو، سینما ہوں کہ مخالفین کے پروپیگنڈے ہر چیز مخالف جارہی ہے۔ اسلام کے نام پر اسلام کو زک پہنچائی جارہی ہے۔ اسلام کو سب آواز دیتے ہیں، مگر اسلام کی آواز پر کوئی نہیں جاتا۔"

سیرۃ النبی (ج ہفتم) میں "جہاد بالعلم" کے ذیل میں لکھتے ہیں :-

"جہاد کی ایک اور قسم جہاد بالعلم ہے۔ دنیا کا شر و فساد جہالت کا نتیجہ ہے۔ اس کا دور کرنا ہر حق طلب کیلئے ضروری ہے۔ ایک انسان کے پاس اگر عقل و معرفت اور علم و دانش کی روشنی ہے۔ تو اس کا فرض ہے۔ کہ وہ اس سے دوسرے تاریک دلوں کو فائدہ پہنچائے، تلوار کی دلیل سے قلب میں وہ طمانیت نہیں پیدا ہو سکتی جو دلیل و برہان کی قوت سے لوگوں کے سینوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اسلئے ارشاد ہے :-

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔ (نمل - ۱۶)	تو لوگوں کو اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف آنے کا بلاوا حکمت و دانائی کی باتوں کے ذریعے اور اچھی طرح سمجھا کر دے، اور مناظرہ کرنا ہو تو وہ بھی اچھی طرح کر۔

دین کی یہ تبلیغ و دعوت بھی جو سراسر علمی طریق ہے۔ جہاد کی ایک قسم ہے۔ اور اسی طریقۂ دعوت کا نام "جہاد بالقرآن" ہے۔ کہ قرآن خود اپنی آپ دلیل، اپنی آپ موعظت اور اپنے لئے آپ مناظرہ ہے۔ قرآن کے ایک سچے عالم کو قرآن کی صداقت اور سچائی کیلئے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روحانی جہاد، یعنی روحانی بیماریوں کی فوجوں کو شکست دینے کیلئے اس قرآن کی تلوار ہاتھ میں دی گئی۔ اور اسی سے کفار و منافقین کے شکوک و شبہات کے پردے کو ہزیمت دینے کا حکم دیا گیا، ارشاد ہوا۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (فرقان-۵)	تو کافروں کا کہنا مان اور بذریعہ قرآن کے تو ان سے جہاد کر، بڑا جہاد،

"بذریعہ قرآن کے جہاد کر یعنی قرآن کے ذریعہ سے تو ان کا مقابلہ کر" اس قرآنی جہاد و مقابلہ کو اللہ تعالیٰ نے جہاد کبیر "بڑا جہاد" اور بڑے زور کا مقابلہ فرمایا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا۔ کہ اس جہاد بالعلم کی اہمیت قرآن کی نظر میں کتنی ہے۔ علما نے بھی اس اہمیت کو محسوس کیا ہے۔ اور اسکو جہاد کا مہتم بالشان درجہ قرار دیا ہے۔ امام ابوبکر رازی حنفی نے احکام القرآن میں اس پر لطیف بحث کی ہے۔ اور لکھا ہے۔ کہ جہاد بالعلم کا درجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں سے بڑھ کر ہے۔ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے۔ کہ حق کی حمایت اور دین کی نصرت کیلئے عقل، فہم، علم اور بصیرت حاصل کرے اور ان کو اس راہ میں صرف کرے، اور وہ تمام علوم جو اس راہ میں کام آسکتے ہوں۔ ان کو اسلئے حاصل کرے کہ ان سے حق کی اشاعت اور دین کی مدافعت کا فریضہ انجام پائے گا۔ یہ علم کا جہاد ہے جو اہل علم پر فرض ہے

'جہاد بالعلم' اور دین کی تعلیم و تبلیغ کی اسی اہمیت کے پیش نظر حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ چاہتے تھے۔ کہ مسلمان دین کیلئے اپنی جان و مال اور استعدادوں کو اس راہ میں صرف کریں۔"

ایک مرتبہ دین سے مسلمانوں کی موجودہ غفلت اور دینی تعلیم و تبلیغ سے لاپرواہی اور صاحب بصیرت و عزیمت علماء اور خادمان دین کی کمی کا تذکرہ کرتے ہوئے حسرت سے فرمایا:۔

" جہاں ہزاروں کالج اور اسکول ہیں، وہاں عربی کے مدارس ہیں۔ پھر ان کی مالی حالت کیا ہے۔ جب اس کا رواج تھا، ہزاروں پڑھتے تھے اور ذہانت و دیانت کی بنا پر پچاسوں کام کے نکلتے تھے۔ اب ان مدارس میں جاتے ہی کتنے ہیں؟ تمام بڑے بڑے خاندان جن میں صلاحیت ہے۔ انگریزی پڑھ رہے ہیں۔ اور دینی تعلیم سے پوری غفلت برت رہے ہیں۔ عام طور سے لوگوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی منصب اور ملازمت بنا رکھا ہے، غیر اقوام میں مالدار خاندانوں کے لوگ اعلیٰ تعلیم پانے کے بعد مشنری کا کام شروع کر دیتے ہیں۔ اور اسے تبلیغ مسیحیت کا ذریعہ بناتے ہیں، کوئی مسلمان ڈاکٹر ہے۔ جو ملت کی سربزی کے لئے اپنے کو صرف کر رہا ہو؟ ہمیں تو ایسے اشخاص کی ضرورت ہے، کہ اعلیٰ تعلیم پانے کے باوجود دین کی خدمت کے لئے اپنے کو وقف کر سکیں"

ایک سفر کے دوران میں کچھ اٹالین مشنری ہم سفر ہو گئے۔ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ان سے رومن کیتھولک عقائد کے متعلق بات چیت کرتے رہے۔ بعد میں مجھ سے فرمایا" یہ مشنری روما سے پنجاب میں مسیحیت کی تبلیغ کرنے کیلئے آئے ہیں

اور پنجابی زبان سیکھی، ہم میں سے کوئی ہے، کہ اطالوی زبان سیکھی ہو۔ اور وہاں اسلام کی دعوت دینے کیلئے گیا ہو"

اپنے عزیز و محبوب شاگرد مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو لکھتے ہیں :۔

" آپ کے ذاتی حالات اور ارادے معلوم نہیں، میری آرزو سوائے اس کے کچھ نہیں ہے۔ کہ یہ ہیچمدان اپنے مخصوصین اور محبین کو دین کی طلب اور خدمت دین میں مصروف دیکھے، آپ نے جو باتیں لکھی ہیں، ان سب سے فائدہ کی امید ہے... میں تو اپنے کو عمر کی آخری منزل میں سمجھتا ہوں ساٹھ سے جو اوپر ہوا ہے اسکی عمر کا پیالہ لبریز ہی سمجھیئے۔ اگر کوئی تسکین کا سرمایہ ہے تو آپ جیسے چند محبین کا وجود ہے۔ استاذ مرحوم نے اگر دو تین یادگاریں چھوڑیں، جنہوں نے ان کے کاموں کو چلایا۔ تو مجھ جیسے ننگِ سلف کے بعد بھی کچھ خدام دین و ملت باقی رہیں کہ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا کا مژدہ تقویت روح کا باعث ہو، سلف کی راہ سے سرمو تجاوز نہ ہو، یہی اپنی وصیت ہے۔ اور یہی زندگی کی آخری فرمائش۔"

حضرت سیدی قدس سرہ کے ایک خادم کو اللہ تعالیٰ نے تبلیغی جماعت کے ساتھ کچھ وقت تبلیغ و دعوت میں صرف کرنے اور پیدل سفر کرنے کی سعادت بخشی، حضرت کو معلوم ہوا تو گرامی نامہ میں تحریر فرمایا :۔

" مبارک ہو کہ آپ نے دین کی خدمت کیلئے اپنے پاؤں کو گرد آلود کیا

ایک جا رہتے ہیں عاشق بدنام کہیں ۔ دن کہیں، رات کہیں، صبح کہیں، شام کہیں "

دوسرے موقع پر فرمایا :۔ " جوان ہوتا، تو میں بھی ان پیدل سفروں میں شریک ہوتا، پیدل

کے دینی قافلوں کی مشابہت و نسبت صحابہ کرام سے ہے۔" (او کما قال)

یہی صاحب جب ایک دوسری جماعت کو رخصت کرنے گئے، جو حج کے لئے پیدل جا رہی تھی، اور خدمت اقدس میں دیر سے آنے کی وجہ اس جماعت کی مشایعت بیان کی تو ارشاد فرمایا۔" میرا ایک شعر ہے۔

کچھ تو ہم رنگیٔ مستاں بھی ہے حاصل لیکن ۔۔۔ جوشش و لغزش رفتار کہاں سے لاؤں

اللہ تعالیٰ آپ کو اجر دے، جو قدم اللہ تبارک تعالیٰ کے لئے اٹھائے جاتے ہیں۔ ان پر ثواب ہے۔ حدیث میں ثواب آیا ہے، ان کا ماخذ قرآن ہے ۔

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ...... اِلَىٰ ...... وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (التوبہ-۱۵) اور مَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (نسا-۱۴)

حضرت سید الملۃ رحمہ کی تمام عمر دینی خدمت میں گذری، اس شہید علم و دین کے تبلیغی جذبہ کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ بیمار تھے، تنفس کا شدید عارضہ تھا، ڈاکٹروں نے چلنے پھرنے کی ممانعت کر رکھی تھی، اسی دوران میں تبلیغی حضرات کا ایک اجتماع لائلپور میں منعقد ہونے والا تھا، حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں تبلیغی حضرات نے راقم کے ذریعے اجتماع میں شرکت کی درخواست کی، فرمایا۔ آپ کو معلوم ہے، میں تو بیمار ہوں، اس بنا پر انہیں میری معذوری کی اطلاع کر دیجئے، لیکن کچھ دیر بعد خود ہی برادرم سید سلمان سلمہٗ کو فرمایا کہ میرے سفر کا سامان درست کیجئے۔ اور راقم

سے مخاطب ہو کر فرمایا" وہ اپنے لئے تھوڑا ہی بلا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت ہے۔ اس لئے انکار نہیں کر سکتا۔ اور اسی بیماری اور ضعف کی حالت میں اسلام کا یہ جواں ہمت سپاہی دین کی خدمت کیلئے آمادہ سفر ہو گیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔ اسی سفر کے دوران میں تبلیغی جماعتوں کو رخصت کرتے وقت آنکھیں اشکبار تھیں اور زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے۔

"اے اللہ جس طرح تو نے اس امت کے پہلے حصہ سے (دین کی خدمت کا) کام لیا، اس پچھلے حصہ سے بھی کام لے لے۔ اور ہمیں ضائع نہ فرما"

کراچی سے ایک تبلیغی جماعت تبلیغ و حج کا فریضہ ادا کرنے کیلئے پیدل روانہ ہوئی حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ان غرباء کے قافلہ کو بڑی رقت آمیز دعاء کے ساتھ رخصت فرمایا۔ اور بعد میں ان کے امیر کو یہ خط لکھا۔

کراچی۔ ۵

۱۴ جنوری ۱۹۵۳ء

بخدمت مکرمی جناب میاں جی عادل صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ لوگوں کے حالات معلوم ہوتے رہتے ہیں، دل سے دعاء کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے رفقاء کو اتباع مرضیات کی توفیق عنایت فرماویں۔ اور بخیریت منزل مقصود تک پہنچائیں، آپ لوگ اس وقت بفضلہ تعالیٰ ایک بڑے مقصد کیلئے سفر کر رہے ہیں۔ اس راہ کا توشہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اور باہم ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک اور مسلمانوں پر شفقت ہے۔ آپ لوگ اس وقت اسلام کے پیغامبر

اور قائد اور اللہ تعالیٰ کے داعی ہو کر نکلے ہیں۔ سلامتی اور محبت کا پیغام مسلمانوں میں پھیلاتے ہوئے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام سے مسلمانوں کا دل بڑھاتے اپنے راستے کو طے کریں، ذکر و شکرِ الٰہی ہر وقت جاری رہے۔ میری اور سب کی طرف سے سب کو سلام مسنون پہنچائیں۔ والسلام

سید سلیمان ندوی

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت میں اپنے متوسلین کی شرکت مستحسن سمجھتے تھے، ایک طالب جنہیں حضرت کی رائے اس سلسلہ میں معلوم نہ تھی، اپنے علاقے کی جماعتوں کے امیر الامراء بنا دیئے گئے۔ ان کے استفسار پر حضرت والا نے ارقام فرمایا:۔

"جی ہاں اس جماعت سے میرا قدیم سے تعلق ہے۔ وہاں (ہندوستان میں) بھی تھا اور یہاں (پاکستان میں) بھی ہے۔ آپ کو کوفت اور پس و پیش لفظ امیر الامراء کے ظاہری معنوں کے لحاظ سے ہے۔ کہ آپ اس کو عہدہ اور منصب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ فرائض کی بجا آوری اور خدمات کی چیز ہے، آپ امیر الامرا کو خادم الخدام کے معنوں میں سمجھیں تو کوفت لفظوں سے نہ ہوگی، اس صورت میں فرائض کے بار عظیم سے گھبراہٹ ہو سکتی ہے، اور وہ بجا ہے۔ مگر اس سے کبر و غرور کا شائبہ پیدا نہ ہوگا۔ اگر آپ خلوص اور تواضع کیساتھ اُس جماعت کی خدمت انجام دے سکیں تو قبول کر لیں"...... اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی میں برکت دیں۔ اس تبلیغی سلسلہ میں صرف ایک احتیاطی

تنبیہ کی ضرورت ہے۔ اور وہ یہ کہ غیر کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح پر نظر رہے۔ اور غیر کی اصلاح کی فکر بھی اپنی اصلاح اور حصول اجر کی خاطر ہو تفوق اور دینی بڑائی کا خیال بھی نہ آئے"۔

ایک اور طالب نے پوچھا مولانا الیاسؒ اور ان کی جماعت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے، تحریر فرمایا "اچھی رائے ہے۔"

ایک صاحب نے لکھا، "الحمدللہ تبلیغی جماعت کیساتھ کچھ نہ کچھ وقت گذار دیتا ہوں۔" اس کے جواب میں ارقام فرمایا۔ "نیک لوگوں کی صحبت بہت مفید ہے"

ایک دوسرے طالب نے لکھا کہ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے اور اپنی اصلاح کی نیت سے مولانا الیاس کاندھلوی کی مبلغین کی جماعتوں کے ساتھ جاتا ہوں۔" جواباً تحریر فرمایا۔" اس صحبت کو جاری رکھئے۔

دوسرے خط میں ان ہی کو ارقام فرمایا۔ "آپ جماعت کے ساتھ کام تو کریں۔ مگر نظر اپنے اوپر ہو۔ اور اپنی درستی کی نیت ہو۔"

حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کو اس سلسلہ تبلیغ کے متعلق تحریر فرمایا:-

"اب ضرورت ندوہ کی روح کی تربیت اور نشو ونما کے کام پر غور کرنے کی ہے۔ جس کیلئے آپکی موجودگی کی سخت حاجت ہے، ..... مدرسہ لکھنؤ اور اودھ کی اہمیت ابھی پوری طرح شاید سمجھی نہیں گئی۔ جمعرات والی جماعت کا سلسلہ بند ہے، اور اطراف میں وفود کا کام التواء میں ہے، طلبہ میں اسی وجہ سے دینی تبلیغی روح کے اضمحلال کا اندیشہ ہے۔

خصوصاً موجودہ سیاسی انتشار میں ان کو کسی دینی کام میں نہ لگائے رکھا گیا۔ تو ڈر ہے کہ دماغ کسی اور طرف متوجہ ہو جائیں، امید ہے، کہ اسکی اہمیت پوری طرح آپ سمجھتے ہیں۔"

دوسرے گرامی نامہ میں انہیں کو ارقام فرماتے ہیں:۔

"میری شرکت کو جو جماعت تبلیغ کے کاموں میں حجاز میں (ہوئی) آپ صاحبوں نے بڑی اہمیت دی، مولانا یوسف صاحب اور مولانا ذکریا صاحب تک نے اس کیلئے شکریئے ادا کئے اور دعائیں دیں، دعائیں تو ٹھیک ہیں کہ میں اُن کا محتاج ہوں۔ مگر شکریہ کس بات کا، کوئی نماز پڑھے تو اس کا شکریہ ادا کیا جائیگا۔ یہ میں نے اس لئے لکھا کہ بعض لوگوں نے ایسا کیا ہے۔"

برادرِ طریق مولوی غلام محمد صاحب نے حیدر آباد میں اپنے محلہ میں حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ کے طرز پر تبلیغی کام کا آغاز فرمایا۔ اور حضرت والا قدس سرہٗ کو اطلاع دی اور استقامت کی دعا کی درخواست کرتے ہوئے یہ بھی تحریر فرمایا، کہ "متذکرہ کام میں تفہیم و تقریر کیلئے احقر کو مجبور کیا جاتا ہے..... احقر کا رجحان تو تبشیر سے زیادہ تنذیر کی طرف مائل ہے۔ مگر فی زمانہ کس پہلو کو غالب رکھنا اولیٰ ہے؟"

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواباً ارقام فرمایا:۔

"ضرورت اسی کی ہے۔ کہ سیاست سے بے پروا ہو کر دین کی خدمت میں مصروف ہوا جائے۔ اخلاص کے ساتھ اس کام کو جاری رکھیں۔ اور کبھی اس میں اپنے اندر استکبار اور دوسروں کے باب میں

استحقار نہ آنے دیں۔ اگر ایسا ہونے لگے۔ تو کچھ دن کام چھوڑ دیا جائے۔"

(تبشیر و تنذیر کے متعلق سوال کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے) کچھ حرج نہیں مگر اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہ کے سوا کوئی دوسرا مقصد پیش نظر نہ ہو۔ تبشیر اور انذار کا کلیہ قاعدہ کوئی نہیں۔ اشخاص زیر دعوت کے حالات پر منحصر ہے۔ بہر حال تبشیر کو ترجیح ہے۔" (تذکرہ سلیمان ص۵۵۷، ۵۵۸)

ایک دوسرے گرامی نامہ میں برادر موصوف ہی کو تحریر فرماتے ہیں :۔

"پچھلے خطوں کو جو آپ کے پاس ہوں۔ تو دوبارہ پڑھیں۔ مکّی زندگی سے پہلے مدنی زندگی بہ مشکل کامیاب ہو سکتی ہے۔ اور پچھلے فرسودہ نظام زندگی کی بنیاد پر تجدید کی دیواریں کھڑی نہیں ہو سکتی ہیں۔

خود مسلمان بننا دوسرے مسلمانوں کو مسلمان بننے کی دعوت دینا وقت کی اہم پکار ہے۔ اور اس فرض کو نفرت کی بجائے محبت کے جذبہ سے انجام دینا سب سے اہم ہے۔ جس کے سامنے آپ دعوت پیش کرتے ہیں۔ اس پر شفقت اور اس سے محبت دعوت کا محرک ہو تب ہی وہ کامیاب ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں ہے۔ اور قرآن کریم بھی اس کی شہادت دیتا ہے۔

لَا تَحْزَنْ، لَا یَحْزُنْکَ قَوْلُھُمْ اور وَلَا تَکُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْکُرُوْنَ اور عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ وغیرہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ منشائے دعوت شفقت بر کفار تھی۔ کہ داعی اور مدعو نہ ملیں گے اور ایک کو دوسرے سے دلی لگاؤ پیدا نہ ہوگا۔ تو ایک دل سے دوسرے دل کی طرف تاثیر منتقل نہیں ہو سکتی۔" (تذکرہ سلیمان ص۵۶۰)

دینی دعوت کے مختلف طریقے

تاہم حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی وسعت نظر، باریک بینی و جامعیت دینی خدمت اور تبلیغ و دعوت کو کسی ایک 'خاص طرز' میں منحصر نہیں سمجھتی تھی فرماتے تھے "دین کی خدمت کی راہیں مختلف ہو سکتی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ اخلاص ہو اور سلف کی راہ سے سرمو تجاوز نہ ہو، گو قدیم جوہر کی بقا کے ساتھ جدید نقش و نگار سے پرہیز نہیں لیکن اگر یہ جدید نقش و نگار اصل قدیم جوہر کو فنا کر دے تو اس نقش و نگار سے بے نقش ہی رہنا اچھا ہے فرماتے تھے یہی اپنی وصیت ہے۔ اور یہی زندگی کی آخری فرمائش؛

چنانچہ ارقام فرماتے ہیں: ——"رجوع الی الاسلام کی بعض تحریکیں اس وقت قائم ہیں اور جس طرح فضا کے تغیر سے موسم کا حال معلوم ہوتا ہے اسی طرح ان تحریکوں کی وسعت رفتار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یاس و قنوط کے بعد ابرِ رحمت کا فیض درافشانی کو آمادہ ہے ضرورت ہے کہ تھوڑے تھوڑے اختلاف رہنے کے باوجود اصل متفقہ مقصد پر سب متحد رہیں"—— اسی قسم کی ایک اور تحریر میں مزید وضاحت فرماتے ہیں: "...... اسلامی ملکوں میں بحمد اللہ کہ ہندوستان کی حالت اب بھی غنیمت ہے کہ دینی تغافل اور سیاسی انہماک کے باوجود یہاں علماء، تعلیم یافتہ اور عوام کی ایک جماعت گو وہ تھوڑی ہی ہو ایسی موجود ہے جو دین کی خدمت اور اعلاء کیلئے سرگرمی کیساتھ مصروف عمل اور عوام کو دین سے مربوط اور تعلیم یافتوں کو مذہب سے آشنا کرنے کیلئے اخلاص کیساتھ کام کر رہی ہے اور انکی تاثیر عوام اور تعلیم یافتہ طبقوں میں پھیل رہی ہے۔ ممکن ہے کسی کو ان میں سے کسی کے طریق کار سے مخلصانہ اختلاف ہو تاہم جس حد تک مشترک مقصد کا تعلق ہے ان کی نیک مساعی کا اعتراف اور انکی کامیابی کی دعا کرنی چاہیئے۔ اور اختلاف کو مخالفت کا رنگ نہیں دینا چاہیئے۔ کیونکہ اصل مقصود دین کی خدمت ہے۔ اشخاص کی بحث نہیں ؎

من و تو گر ہلاک شویم چہ باک ۔۔۔ غرض اندر میاں سلامت اوست (رسالہ معارف ماہ جنوری ۳۶ء)

تبلیغی مجالس دینی تحریکات کا تحزب پسندیدہ نہیں

بات یہ ہے۔ کہ دینی خدمت کے ادارے و مجالس تبلیغی تحریکیں اور دعوتی تنظیمیں جب تک وسعت نظر، فراخ دلی، وسیع المشربی، رواداری، باہمی رفق و ملاطفت مخلصانہ افہام و تفہیم اور نیکی و خیر کے کاموں میں تعاون کے راستہ پر گامزن نہ ہوں محدود مسالک و نظریات بلکہ محض رسوم و قیود کی تنگنائوں میں پھنس کر رہ جاتی ہیں۔ اور اپنے خاص نظریہ فکر، طرز عمل اور طریقۂ دعوت و تبلیغ، سے ماسوا ہر فکریہ، جہد و محنت کوشش و تحریک کو نامناسب، بلکہ باطل تک سمجھنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق کی طرف دعوت دینے والوں کے یہ مختلف قافلے مسابقت، مشارکت اور تعاون کی بجائے مخالفت باہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور وہ قوتیں جو باوجود مخلصانہ اختلاف کے مابہ الاشتراک پر متفق ہو کر بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ باہمی شقاق و مخالفت کی وجہ سے تحزب، پراگندگی اور انتشار میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اور امت کے یہ طبقات "اختلافُ امتی رحمۃ" کا مظہر بننے کی بجائے كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (ہر گروہ کے پاس جو چیز (دین وغیرہ) ہے وہ اس سے خوش ہے) کا منظر پیش کرتے ہیں۔ اس لئے حضرت سید الملۃ قدس سرہٗ کی بصیرت حق کے دائرہ میں باہمی مخلصانہ اختلاف

..... کی گنجائش و ضرورت کا شدید احساس رکھتی تھی۔ اور جماعتی گروہ بندیوں کو ناپسند فرماتی تھی۔ چنانچہ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو لکھتے ہیں۔

" وہابیت میں غلو اور تشدد نہ چاہیئے۔ تصلّب اور تعصب حکم دین میں چاہیئے۔ نہ کہ اشخاص اور ان کے مسالک میں ... خواہ وہ حنفیت ہو یا وہابیت، بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ"

(مکاتیب سلیمان ص۱۱۷، ص۱۱۸)

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ اسلامی اور دینی کاموں کی مختلف نوع کی خدمات کو پسند فرماتے تھے۔ اور ان سے تعاون کو اچھا سمجھتے تھے۔ ایک طالب نے خدمتِ دینی کی نیت سے ایک تحقیقی علمی ادارہ کی تاسیس کے سلسلہ میں متعدد بلند پایہ علماء اور تعلیمیافتہ حضرات سے ملاقات کی، اور اس سے حضرت سید الملۃ رحمۃ اللہ علیہ کو مطلع کیا اور شرکت کی خواہش ظاہر کی۔ حضرتؒ نے اپنی رضامندی کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا :۔

" خوشی ہوئی۔ کہ آپ نے اتنی محنت کی اور جدید و قدیم اصحاب الرائے سے گفتگو اور ملاقاتیں کیں۔ اور ان کو متفق کیا۔ اب آئندہ اجتماع کے موقع پر جو کام طے پائے۔ اس سے مطلع فرمائیں گے حسب استطاعت و توفیق شرکت ہوگی۔"

ایک صاحب نے استفساراً لکھا۔ " کہ کچھ مخلص دیندار حضرات کا خیال ہے کہ ایک ایسی جماعت کی تشکیل کیجائے، جس میں ہر عمر کے لوگ شامل ہوں۔ اور جو اپنی عمر معمولی تنخواہ پر دینی خدمت کیلئے وقف کردیں۔ آپ کی کیا رائے ہے۔

ایسی جماعت کے اصول کیا ہوں ؟" حضرت والا قدس سرہ نے جواباً تحریر فرمایا۔

" ؎ درکارِ خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست

مناسب ہے ایسی جماعت بے غرض اور قانع دینداروں کی بنائی جائے۔

نام خدام الدین رکھ لیں۔ مقاصد یہ ہوں :۔

۱:۔ نوجوانوں اور طالب علموں میں دینی لٹریچر کی اشاعت یا ماہانہ دینی جلسوں میں دعوت۔

۲:۔ عام طور سے لوگوں کو دین کی طرف دعوت دینا۔

۳:۔ نماز کی تاکید۔

۴:۔ صورت وشکل وخیالات وعقائد واعمال میں اتباعِ دین کی تحریک۔

۵:۔ زکواۃ کی ترکیب۔

۶:۔ اسلامی اخلاق کی تعلیم شبینہ مدارس یا زبانی تعلیم سے ناواقفوں کو مسائل دین کی تعلیم۔

جو صاحب کوشاں ہوں۔ وہ انشاء اللہ اجر عظیم کے مستحق ہوں گے۔"

مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم کو مختلف مکتوبات میں ارقام فرماتے ہیں۔

" بدل دعا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس قسم کے دینی کاموں کے لئے صحت وفراغت نصیب فرمائے' دعاگو ہوں۔ کہ آپ کے دستِ قلم کی قوت مسلمانوں کی خیر میں صرف ہو۔"

" اللہ تعالیٰ آپ کو مزید انعامات سے بہرہ مند فرمائیں۔ اور آپ سے نئی مفید خدمات لیں۔ جن سے اسلام اور مسلمانوں کو فائدہ پہنچے۔"

مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی کو ایک گرامی نامہ میں تحریر فرمایا :۔

" امید ہے۔ کہ امسال اور بھی مستعدی سے آپ کا درس جاری ہوگا۔ یہ توفیقات الٰہیہ ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھاتے رہیئے۔ سعدیؒ نے خوب کہا ہے۔ ؎

منّت منہہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی   منّت شناس ازوکہ بخدمت گذاشتت

زندگی میں ہر کام جو انجام پاتا ہے۔ وہ محض حق تعالیٰ کی توفیق اور نوازش ہے۔ ہم کیا، اور ہماری جدوجہد کیا۔ "

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات سے یہ بات واضح ہے۔ کہ حضرت والا قدس سرّہٗ دین کی خدمت کو کسی ایک طریقہ میں محدود نہیں سمجھتے تھے۔ اور چاہتے تھے۔ کہ دین کی کسی مفید وصحیح خدمت میں حسب استطاعت مصروف رہا جائے، لیکن اجتماعی تحریکوں کی کثرت اور ہر گروہ کا ایک نئی دعوت کو پیش کر دینا پسند نہیں فرماتے تھے۔ کہ ہر کس و ناکس کا یہ کام نہیں ہے۔ کہ دین کے نام پر اپنی طرف دعوت دیتا پھرے حضرت سید الملۃ رحمۃ اللہ علیہ ارقام فرماتے ہیں :۔

(دین کی خدمت و دعوت کیلئے) "کسی نئی مجلس کار کی بالاستقلال بنیاد رکھنے سے بہتر ہے۔ کہ پہلے سے موجود تحریک میں شامل ہو کر قوتِ عمل کا اظہار کیا جائے۔ اور تحریک کا سر رشتہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو۔ جن کے علم و عمل پر مسلمانوں کو اعتبار ہو۔ ہر عامی کا یہ کام نہیں کہ وہ اپنے لئے ایک نیا راستہ تجویز کرے۔ اور اپنی ایک نئی دعوت پیش کرے۔ اس طوائف الملوکی کا نتیجہ خوش آئند نہیں ہو سکتا۔ "

جامعیتِ سلوک اور انفرادی زندگی

اسلامی نظریۂ سلوک کی جامعیت کا یہ نتیجہ ہے۔ کہ اجتماعی زندگی کے جملہ پہلوؤں کی طرح سلوک انفرادی زندگی کے جزو کل پر بھی محیط ہے۔ بلکہ "فرد" کی زندگی کے جملہ شعبوں کی اصلاح کیلئے ہی اجتماعی حقوق و فرائض کی ادائیگی کی ضرورت ہے۔ کہ افراد ہی کے مجموعہ کا نام ملت و اجتماع ہے۔

حضرۃ الشیخ قدس سرہٗ کے نزدیک سلوک انسان کے تمام عقائد و اعمال' افکار و اشغال احوال و کوائف پر حاوی ہے۔ اور اعلیٰ دین و اعلیٰ اخلاق اور علم حصولِ احسان و تقویٰ' کا اصطلاحی نام ہے۔ اسلئے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ "تصحیح عقائد' تحسین عبادات، اتباعِ سنّت، اصلاح اعمال اور ادائے حقوق عباد، حصول تقویٰ' تحلی بالفضائل و تخلی عن الرذائل برائے۔ رضائے الٰہی کو ہی اصل دین اور صحیح سلوک سمجھتے تھے (دیکھو مقدمہ تجدید تصوف و سلوک) یہ سلوک توحید کے ارفع و اعلیٰ مقام اور احکام الٰہی کے کامل امتثال اور اتباع نبوی کی مکمل پابندی کا نام تھا۔ کہ دل میں عقائد حقّہ کا ایسا ایقان و اذعان ہو جائے کہ قال حال اور غیب شہود بن جائے۔ خلوت خانہ دل غیر کی محبتوں سے پاک ہو کر حجلہ نشینِ ازل کیلئے خاص ہو جائے

تقویٰ و احسان طبعی تقاضے کی صورت اختیار کرلے۔ اخلاق نبویؐ کا پرتو ہر عمل میں جھلکنے لگے۔ عبادات و اذکار کی پابندی، حقوق العباد کی رعایت، معاملات کی صفائی، اور معاشرت کی پاکیزگی میں ادنیٰ کوتاہی نہ ہونے پائے۔ اعمال صالحہ سے رغبت اور برائیوں سے اجتناب فطرتِ ثانیہ بن جائے معاشرت و معیشت، تجارت و زراعت، سیاست و عسکریت، اقتصاد و عمرانیت، زندگی کا ہر شعبہ کلی طور پر اوامر الٰہی اور طریق نبویؐ کا پابند ہو جائے۔ غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے طریقۂ حیات کے کامل و مکمل ظاہری و باطنی، انفرادی و اجتماعی اتباع کا نام تصوف و سلوک ہے۔ کہ بقول حضرت سید الملۃ قدس سرہٗ:۔

"احکام الٰہی کی باخلاصِ تمام تعمیل و تکمیل ہی طریقت ہے۔ وگرہیچ۔"

(رسالہ معارف اعظم گڑھ ص ۱۰ ج ۵۳)

سلوک و تصوف کی یہی حقیقت مختلف طالبین کے نام مکتوبات میں کلکِ سلیمانی نے ثبت کی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرتِ والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے مکاتیب سے چند اقتباسات نقل کرتا ہوں:۔

۱:۔ "اصل شئ احکام الٰہی کی کلی اطاعت، حلال و حرام کا خیال، معاملات میں صفائی، اخلاق کی نزاہت، اتباع نبوی کا دھیان اور تمام امور میں رضائے الٰہی کی طلب ہے۔ ان امور کی طرف توجہ فرمائیں۔ کہ یہ اصل ہیں اور باقی سب فروع و تدابیر۔

ذکر کے اثر کا ظہور یہی ہے۔ کہ طاعات و مرضیاتِ الٰہی کے اتباع کا ذوق بڑھے اور اللہ تعالیٰ کی یاد ہر حال میں ہو۔ باقی کیفیات تو آتی جاتی

رہتی ہیں۔ اگر روز پلاؤ ملے تو پلاؤ کا مزہ بھول جائے۔

از دستِ ہجر یار شکایت نمی کنم　　گر نیست غیبتے ندہد لذت حضور

اپنے کام میں تا دم آخر استقامت کے ساتھ لگے رہئیے۔ یہی بڑی دولت ہے۔

۲:۔ "یہ خیال رہے کہ قرب و ولایت کی راہ صرف عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ ہیں۔ بقیہ جذب و شوق، وندا ورویاء وغیرہ محمود ہیں۔ مگر مقصود نہیں اس لئے ان سے دل نہ لگائیں۔ اس کو راستہ کی سیر کا تماشہ جانیں۔"

۳:۔ "اصل شیٔ ایک ہی ہے۔ اور وہ احوال مع اللہ تعالیٰ ہیں۔ علاقہ الٰہی میں ترقی ہو۔ جس کی علامت عقیدۃً اور عملاً احکام الٰہی کا کامل اتباع ہے۔"

۴:۔ "مقصود بذریعۂ اعمال حصول رضا و قرب ہے۔ رویائے صادقہ بشارت ہیں۔ اور بس۔"

۵:۔ "بندہ ہر حال میں گنہگار ہے۔ اور خدا کی بارگاہ میں اپنے گناہوں کا اعتراف اور اپنی غلط کاری اور تساہل پر ندامت اور آئندہ گناہوں سے بچنے اور احکام الٰہی پر عمل کرنے پر استقامت اور ساری عمر اسی ریاضت میں گذار دینا ہی بندگی ہے۔"

۶:۔ تقصیرات پر استغفار کر کے آئندہ احتراز کا عزم کیجئے"..... ایک ایک رذیلہ کو لے کر اس کے ازالہ کی کوشش کیجئے، پہلے اس رذیلہ

کی حقیقت سمجھئے، پھر ازالہ کی تدبیر۔ حصول تقویٰ، تحلی بالفضائل و تخلی عن الرذائل برائے رضائے الٰہی اصل سلوک ہے۔"

۷، "پراگندگی خاطر کی کوئی بات نہیں۔ اعمال سب معلوم ہیں۔ ضرورت عمل کی ہے اور حصول تقویٰ اور رضائے الٰہی کی، ساری کوشش اسی کی چاہیئے۔ باقی سب فلسفہ ہے۔"

۸، ــ ...... اور ہر قسم کے رذائل سے بقدر امکان دوری اور فضائل کے حصول کی کوشش اور اطاعت الٰہی پر مداومت اور حصول رضائے الٰہی کا شوق (اصل ہے) باقی غیر مقصود ہیں۔ تو امور مقصودہ میں سے ان امور کی طرف بیشتر متوجہ رہیں۔"

۱۲، "اس کتاب "قصد السبیل" کے آخر میں منہیات و اوامر کی تصریح ہے وہ پیش نظر رہے۔ مقصود حصول تقویٰ ہے کہ قرآن پاک "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" ہے۔ اور عبادت کا منشاء بجا آوری بعد حصول تقویٰ ہے۔ "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ"۔"

۱۳، "اب ضرورت اس بات کی ہے کہ بعد فرائض و سنن و نوافل کی پابندی علی مراتب الوجوب والاستحباب کے منہیات شرعیہ سے احتراز کا لزوم کیا جائے اور ہمیشہ نظر اپنے احوال پر رہے۔ اور جو عیب سب سے زیادہ ابھرا ہوا، علی العیان معلوم ہو۔ اسکے دفعیہ کی کوشش کیجئے۔ مثلاً کبر، عجب، ریا، حسد وغیرہ۔ آپ اُس عیب کی حقیقت پہلے دریافت کریں۔ اگر معلوم نہ ہو اور پھر اُسکا علاج دریافت کریں"

۱۴، "نماز، نوافل، ذکر، تلاوت اور اخلاق و معاملات کی نگرانی یہ چند

امور ہیں جو لحاظ کے قابل ہیں۔ ان پر ہمیشہ نظر رہے۔ تو روح مفلوج نہ ہوگی"

۱۵:- "اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ آپ مع الخیر اپنے فرائض و معمولات میں مصروف ہیں۔ عبادات کے بعد سب سے زیادہ اہمیت معاملات میں صفائی کی ہے اور پھر حسن خلق کا درجہ ہے۔"

۱۶:- "ہمیشہ کے لئے یہی نصیحت ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت نہ ہو۔ تہجد اور ذکر کا اہتمام رہے، حضرت والاؒ کی تصانیف کا مطالعہ انشاء اللہ تعالیٰ ہر بے راہ روی سے آپ کو بچائے گا.... معاملات پر خصوصیت سے نظر رہے۔"

۱۷:- بڑی نعمت اس دنیا سے ایمان و عمل صالح کے ساتھ رخصت ہو سکتی ہے جسکا نام حسن خاتمہ ہے

۱۸:- "امید ہے۔ کہ اب آپ اپنے معمولات پر قادر ہو گئے ہوں گے۔ سب سے بڑی چیز فرائض کے بعد اخلاق رذیلہ سے نجات حاصل کرنا ہے جس کیلئے دُعا کے علاوہ کوشش کرنا بھی ہے۔"

۱۹:- "...... پوری توبہ گذشتہ تقصیروں پر کر کے آگے کیلئے اطاعت کامل کا عزم کیجئے۔ اللہ تعالیٰ پورا فرمائیں گے۔ مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ۔ تمام منہیات سے توبہ کر کے ان سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ اس کیلئے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی اصلاح الرسوم اور بہشتی زیور کا مطالعہ کیجئے اور ان کے مطابق عمل کیجئے۔"

۲۰:- "عملاً اتباع سنت ہر کام میں اور قولاً درود کی کثرت حب رسولؐ کا ذریعہ ہے۔"

۲۱۔ " اپنی تکمیل اور اصلاح سے کبھی غفلت نہ برتیں، ہم ہر حالت میں ناقص ہیں۔ یادالٰہی سے غفلت نہ ہو۔ ذکر کا مقصود یہی ہے۔ بدعات و رسوم سے احتراز رہے۔ تقریبات میں ہر قسم کے امور پیش آتے ہیں۔ ان میں بھی احتیاط رہے۔ "

۲۲۔ تمام امور میں اتباع سنت اور احتراز از بدعت پیش نظر رہے۔ رذائل میں سے ایک ایک رذیلہ کو سمجھکر اُس کے ازالہ کی کوشش چاہیئے۔ پہلے اہم کو لیجئے، اور پوچھئے ...... وظائف کی کثرت کا شوق بیکار ہے غرض صحت ہے، نہ کہ نسخوں کی کثرت اور یاد، اور وہ ایک نسخہ سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ "

۲۳۔ دوام عمل اور صحت فکر و نظر ہی کامیابی کی کنجی ہے۔ خلق میں شہرت اور مقبولیت کی خواہش اس راہ کا کانٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے سوا عمل کا دوسرا محرک نہ ہو، اور ہر حال میں ذکر لساناً و قلباً جاری رہے۔ "

۲۴۔ " دو باتوں کا خاص لحاظ رکھا جائے، اول فرائض کی ادائیگی کا پورا پورا اہتمام، دوم نوافل مسنونہ اور اذکار کی کثرت ان کے علاوہ ہر قسم کے گناہوں سے احتراز کا اہتمام رکھا جائے، کہ دل میں تقویٰ کی کیفیت پیدا ہو"

۲۵۔ " ...... تجلیہ ایک ہی ہے۔ اور وہ کتاب و سنت کی تعلیم ہے۔ اور اس پر عمل کرنا ہے۔ شیخ کا کام اس پر عمل کرنے کے صحیح اور آسان طریق کی تعلیم ہے۔ "

۲۶۔ " دینداری آجکل کی اصطلاح میں صرف نماز روزہ اور ظاہری شکل کا

نام رہ گیا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ حقوق عباد کو پہچانتا ہو۔ اور معاملات میں راستباز ہو۔ ساتھ ہی حقوق زوجیت ادا کرنے کے قابل ہو۔"

۲۸:۔ "تدریج اور آہستگی سے کام شروع کیجئے۔ پہلے عقائد درست کیجئے، پھر عبادات کی تکمیل کیجئے، پھر اخلاق سنواریئے۔ پھر آگے بڑھیئے۔ گناہوں سے فی الفور کنارہ کشی اور استغفار ضروری ہے۔"

۲۹:۔ "پچھلے اعمال کے تدارک کی صورت یہ ہے کہ توبہ و استغفار کیا جائے، اور جن فرائض متروکہ کی قضا ہو۔ اسکی قضا کی جائے۔ حقوق عباد یا معاف کرائے جائیں یا ادا کئے جائیں ...... معاصی سے کلیتہً احتراز کی عزیمت کی جائے۔ اور اللہ تعالی سے استقامت کی دعا مانگی جائے۔"

۳۰:۔ "تقویٰ کا خیال، حلال و حرام کی فکر، جائز و ناجائز کی تمیز ہر کام میں ضروری ہے۔ تقویٰ حاصل اعمال ہے۔ یَاۤاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ ..... لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۔"

۳۱:۔ "تمام گناہوں سے بچنے کا اہتمام رکھیئے۔ اگر غلطی سے کبھی ہو جائے تو یاد آنے پر فوراً استغفار کیجئے۔ اور نیا عہد کیجئے۔ کہ انشاء اللہ اب اپنے قصد سے اس کا ارتکاب نہ ہو گا۔"

۳۲:۔ "قرب الٰہی صرف ایمان و عمل صالح کا نتیجہ ہے۔ اسلئے دوام ذکر اور کثرت اعمال صالحہ کی فکر میں رہنا چاہیئے۔"

۳۳ :۔ "معمولات کی پابندی استقامت کی دلیل ہے۔ اس کے آثار اعمال، معاملات اور اخلاق میں نمایاں ہونے چاہئیں ...... اصل میں یہی مرحلہ ہے۔ جس کی طرف توجہ کم کیجاتی ہے۔"

۳۴ :۔ "اصل نظر اپنے احوالِ قلب اور اعمال پر رہنی چاہیئے کہ صراطِ مستقیم سے کسی حال میں لغزش نہ ہو۔"

۳۵ :۔ "کیفیات و احوال کی طرف توجہ نہ کیجئے۔ صرف حسن عمل اور کثرت ذکر کی طرف توجہ رکھیئے۔"

۳۶ :۔ "نجات تو صرف فضلِ الٰہی کا کرشمہ ہے۔ عقائد و اعمال کی صحت اس کیلئے بمنزلۂ شرط کے ہے پس اس میں مصروف رہنا چاہیئے تاکہ اسکے فضل میں حصہ مل سکے"

۳۷ :۔ "اصل معاملہ عمل کا ہے۔ اس سے ترقی و تنزل کا اندازہ ہوتا ہے۔ معمولات اور احکام الٰہی کی اطاعت اور گناہ سے پرہیز یہی اصل چیز ہے۔"

۳۸ :۔ "یہ سب احوال مبارک ہیں۔ مگر اصل شئ اتباع احکام الٰہی کا اہتمام ہے۔"

۳۹ :۔ امورِ خیر کی تعمیل اور گناہوں سے بچنا انسان کے اختیار میں ہے۔ پس آپ سب وسوسوں اور خیالات کو چھوڑ دیں اور دل سے طے کرلیں۔ کہ آج سے اللہ تعالیٰ کے کسی چھوٹے بڑے حکم کے خلاف نہیں کریں گے۔"

۴۰ :۔ "... محبت کا اخفائے حال اور کیفیات و جذبات پر عقل کو غالب کرنا اور عقل پر حکم شرع کو غالب کرنا اصل دین ہے۔"

۴۱ :۔ "انسان کو ہر حال میں اپنے سے چوکنا رہنا چاہیئے۔ کہ اُس کا نفس اُسکو فریب

میں مبتلا نہ کرے۔ معاملات میں ہمیشہ صفائی اور ایمانداری اور سچائی پیش نظر رہے۔"

۲۸۔ "اللہ تعالیٰ کے محبوب ہونے کا قانونی نسخہ ایک ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لگا رہے۔ طلب رزق حلال میں لگنا بھی عبادت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے زیر حکم ہو۔"

۳۸۔ "حقیقی اور شرعی تصوف جس کا صحیح نام احسان ہے۔ روح دین اور جان ایمان ہے یہ اخلاص فی اللہ اور تزکیہ قلب اور علم حصول تقویٰ کا نام ہے۔"

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سلوک اپنی جامعیت میں کامل دین اور جملہ اوامر الٰہیہ کو اپنے اندر سمیٹے ہوتے ہے اور ایک سالکِ صادق کیلئے لازم ہے۔ کہ اپنی ظاہری و باطنی، انفرادی و اجتماعی تمام زندگی کو احکام ربّانی اور سنّت نبوی کے کامل اتباع سے سنوارے اور اصلاح نفس اور تزکیۂ باطن کو صرف اوراد و اذکار، اشغال و معمولات کی پابندی ہی میں منحصر نہ سمجھے۔ بلکہ اصلاح عقائد، پابندی فرائض و سنن، تحسین عبادات و اذکار کے ساتھ درستگی اخلاق، صفائی معاملات، ادائیگی حقوق العباد اور حسن معاشرت کی طرف بھی پوری توجہ دے۔ اور توحید کاملہ عبدیت تامہ اور حصول احسان و تقویٰ کی اس جدوجہد اور گناہوں اور بدعات سے بچنے کی کوشش میں بکمال اخلاص، و استقامت، عزیمت و ہمت آخر دم تک لگا رہے۔

مندرجۂ بالا مباحث سے ظاہر ہے کہ حضرت سید الملۃ رحمۃ اللہ علیہ ظاہری اعمال کی اصلاح، اخلاق کی پاکیزگی، معاملات کی صفائی اور معاشرت کی درستگی اور حلال و حرام کی تمیز کو تصوف کا بڑا مقصد قرار دیتے اور اسے سالکین کے لئے ضروری سمجھتے تھے،

ایک مرتبہ راقم سے فرمایا کہ :-

"حضرت والا (مولانا تھانوی) رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے آخری دور میں اوراد و وظائف اور اشغال کی تعلیم سے پہلے اخلاق ومعاملات کی اصلاح کی طرف متوجہ فرماتے تھے۔ اس سے مقصود یہ تھا۔ کہ سالک کو اوراد و وظائف میں مشغول کرنے سے پہلے اخلاق ومعاملات کی صفائی کیطرف متوجہ کیا جائے، کہ اس جانب توجہ کم کی جاتی ہے۔ بسا اوقات ذکر کی برکت سے طالب کے قلب پر انوار و واردات کا نزول ہوجاتا ہے جس کی بنا پر وہ اسی کو مقصد سمجھ لیتا ہے۔ اور اسی کو بزرگی سمجھ کر اصلاح اعمال اور درستگی اخلاق ومعاملات سے غافل ہوجاتا ہے۔ اس طرح نہ صرف اس کی ترقی رک جاتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات ہلاکت میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اس لئے حضرت الشیخ رحمہ اللہ تعالیٰ سالکین کی تربیت میں اس چیز کا خاص اہتمام فرماتے تھے۔ کہ وہ دین کے تمام شعبوں کی اصلاح اور جملہ اوامر ظاہری و باطنی کی پابندی کو اپنا شیوہ بنائیں اور ایک کو مقصد سمجھ کر باقی سے اغماض نہ برتیں۔ ان اصولوں پر حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے ایک مکتوب سے روشنی پڑتی ہے اسلئے پورا خط نقل کرتا ہوں۔

مکرمی ومحترمی حفظکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ فقیر نے آپ کا خط پڑھا۔ حالات معلوم

ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے، کہ آپ کو صحیح ہدایت نصیب ہوئی کبھی مصیبتیں بھی ہدایت کا باعث ہوتی ہیں۔ آپ حضرت مولانا تھانوی کی کتابوں میں سے پہلے قصد السبیل پھر تعلیم الدین پڑھیئے۔ اور حضرت کے جس قدر مواعظ و ملفوظات مل سکیں مطالعہ کرتے رہیں اور استغفار کی کثرت کریں۔ اور نماز پنجگانہ باجماعت کا اہتمام کریں اور معاملات میں حلال وحرام اور جائز و ناجائز کی تمیز کریں۔ اور اچھے اخلاق اختیار کریں۔ اور بُرے اخلاق سے پرہیز کریں۔ اگر آپ کا جی چاہے۔ تو مجھ سے خط وکتابت جاری رکھیں۔ اور اپنے احوال سے مطلع کرتے رہیں۔ دعا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی مرضیات پر چلائے"

سید سلیمان

ایک دوسرے طالب کو ارقام فرماتے ہیں :۔

"تقویٰ کا خیال، حلال وحرام کی فکر، جائز و ناجائز کی تمیز ہر کام میں ضروری ہے۔ تقویٰ حاصلِ اعمال ہے۔ یَا اَیُّہَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ ...... لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ "

ایک اور گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں :۔

" معمولات کی پابندی استقامت کی دلیل ہے۔ اس کے آثار اعمال، معاملات اور اخلاق میں نمایاں ہونے چاہئیں ...... "

دوسرے مکتوب میں اسی طالب کو لکھا۔

"جی ہاں یہی مرحلہ ہے جس کی طرف توجہ کم کیجاتی ہے۔ اس کے لئے

ضرورت ہے کہ رسالہ صفائی معاملات پڑھیں۔

ایک مرتبہ راقم چند سیاسی ساتھیوں کے ہمراہ پشاور سے کراچی کے سفر کیلئے روانہ ہوا۔ خوش قسمتی سے لاہور کے اسٹیشن سے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی معیت کراچی تک نصیب ہوگئی۔ سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ تھا، باقی رفقائے سفر بھی اپنے ہی ساتھی تھے۔ لاہور سے گاڑی روانہ ہوئی تو ایک سیٹ پر میں اور حضرت قدس سرہٗ بیٹھ گئے۔ حضرت والا کی طبیعت نہایت ہی مضمحل تھی۔ اور نیند کے غلبہ کی بنا پر گردن مبارک اِدھر اُدھر جھک جاتی تھی۔ میں نے یہ دیکھ کر پیچھے تکیہ رکھنے کی کوشش کی، لیکن عجیب دلبرانہ تبسم کے ساتھ انکار فرما دیا، کچھ دیر کے بعد حضرت والاؒ کے اضمحلال، ضعف اور نیند کے غلبہ کو دیکھ کر ہمارے ایک ساتھی نے عرض کیا۔ "حضرت آپ لیٹ جائیں اور آرام فرمادیں۔ اشرف صاحب ہمارے ساتھ بیٹھ جائیں گے۔" حضرت والا نے اس کے جواب میں مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"گاڑی میں بارہ گھنٹہ کا جلسہ ہوتا ہے۔" (فوری) مراد یہ تھی۔ کہ ریلوے کے قوانین کے مطابق دن کے اوقات میں بیٹھنے کی جگہ سے زیادہ جگہ لیٹنے کیلئے استعمال نہیں کرنی چاہیئے۔ اس بنا پر لیٹنے سے معذوری ہے۔ تقویٰ اور صفائی معاملات کی ایسی نظیریں کہاں ملتی ہیں۔ اسی سفر میں راقم نے چائے منگوائی۔ اور حضرت والا نے بھی میرے ساتھ نوش فرمائی۔ چائے پینے کے بعد "بل" پوچھا۔ فقیر نے بلطائف الحیل ٹال دیا۔ کراچی اترنے سے پیشتر پھر ارشاد فرمایا۔ "آپ نے بل نہیں بتایا۔" عرض کیا "حضرت میں ادا کرچکا ہوں، کوئی بڑی رقم نہیں۔" فرمایا۔ "کیا معلوم آپ کے حالات اس کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں۔" حضرت والا کے اصرار پر مجبوراً رقم

بتانی پڑی، جو اسی وقت ناکارہ کو عطا فرمادی۔

ایک مرتبہ دارمنزل میں حاضری ہوئی۔ دوران ملاقات میں ایک مستعمل ٹکٹ جس پر مہر کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اور دوبارہ استعمال کیا جاسکتا تھا۔ بندہ کو دکھا کر استفسار فرمایا۔ کیا اس کو دوبارہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ عرض کیا۔ "تقویٰ کے خلاف ہے" فرمایا۔ "تقویٰ کے خلاف تو ہے۔ فتویٰ کیا ہے۔ عرض کیا آپ ہی ارشاد فرمائیں۔ فرمایا۔ " ناجائز ہے " اور اسے چاک فرمادیا۔

ایک سفر میں ملتان اتر کر مدرسہ خیر المدارس تشریف لے گئے۔ خادم ساتھ تھا چہرہ مبارک راستے کے گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ اس لئے وضو کے وقت صابن کا استعمال فرمایا۔ احقر نے دوران وضو میں لوٹا لے کر پانی ڈالنا چاہا۔ حضرت والا نے یہ کہہ کر انکار فرمادیا کہ۔ " آپ کو نیت کا ثواب تو مل ہی گیا، دوسرے سے وضو کرانے میں پانی زیادہ صرف ہوتا ہے۔ جو مستحسن نہیں۔ "

لائلپور کے ایک سفر کی واپسی میں (جس میں خاکسار کو خدمت کی سعادت نصیب ہوئی تھی) حضرت والاؒ کے بستر میں سے ایک روپیہ نکلا۔ میں پشاور جاچکا تھا۔ خط میں استفسار فرمایا۔ " یہاں واپسی میں میرے بستر سے ایک روپیہ نکلا، میرا نہیں ہے، معلوم نہیں کس کا ہے۔ آپ کا تو نہیں۔ " میں نے جواباً لکھا کہ میرا نہیں۔ اور ایک دو رفقائے سفر کے نام لکھ دیئے۔ کہ ان سے پوچھ لیا جائے، تحریر فرمایا۔ " ان میں کسی نے اپنا ہونا نہیں بتایا، میں نے پوچھا تھا۔ "

اسی طرح ایک دوسرے پشاوری طالب کا فونٹن پن حضرت شیخ قدس سرہ کے مکان پر رہ گیا۔ اور وہ پشاور آگئے۔ حضرت والا نے راقم کو تحریر فرمایا کہ مرتضیٰ

صاحب کو سلام کے بعد کہہ دیں۔ کہ ان کا فونٹن پن یہاں چھوٹ گیا۔ اگر ان کا ہے تو اس کے بھیجنے کی تدبیر تبائیں۔"

ایک مرتبہ حضرت کی خدمت میں آپ کے استعمال کی تمباکو الائچی دانہ پیش کی۔ شیشی کے لیبل پر تصویر تھی۔ حضرت والاؒ نے اس کاغذ کی تصویر کا گردن سے اوپر کا حصہ اڑادیا ۔ جو انتہائی احتیاط کی دلیل ہے۔

گو بظاہر یہ واقعات معمولی معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان ہی سے تقویٰ کے اہتمام کا اندازہ ہوتا ہے۔

کسب حلال کی تلقین

معاشی تگ و دو اور رزق حلال کی طلب اور اس کے ذرائع انسانی زندگی میں جو اہمیت رکھتے ہیں وہ ظاہر ہے۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت کا نمایاں پہلو یہ بھی تھا۔ کہ مسترشدین کو کسبِ حلال کی اکثر تلقین فرماتے تھے۔ جس سے اس رسمی توکل کی تردید ہو جاتی ہے۔ جو لوگوں کو اپاہج اور ناکارہ بنا دیتا ہے۔ اس کے متعلق بعض ارشادات ملاحظہ ہوں:۔

"تعلیم اور طلب رزق کے اسباب میں سستی نہ کیجئے۔ کہ اس پر نفس کا اطمینان موقوف ہے۔ جس کی بہت ضرورت ہے۔

ایک صاحب کے اس سوال کے جواب میں کہ:" طلب رزق کے اسباب میں کوشش اور مشورہ طلبی توکل کے منافی تو نہیں"؟ ارقام فرمایا:۔

"ہرگز نہیں، طلب رزق حلال بندہ پر واجب ہے۔ اس کی تدبیر اختیار کرنا بھی واجب۔ مگر نظر اللہ تعالیٰ پر رہے۔ کہ وہی رازق ہے۔"

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

"طلبِ رزق حلال از جملہ فرائض و واجبات ہے۔ اس سے تو کسی حال میں تغافل درست نہیں، اللہ تعالیٰ مدد فرماویں، اور غیب سے سامان فرماویں"

ایک طالب کو تلقین ہوتی ہے :۔

"بے شبہہ معاشی پریشانیاں بڑی آزمائش ہیں، اس کے لئے جو تدبیر سمجھ میں آئے کی جائے، برکت دینے والے اللہ ہیں، هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنِ۔"

اسی طالب کو دوسرے مکتوب میں ہدایت ہے :۔

"معاشی پریشانیوں کا علاج دُعاء اور تدبیر دونوں سے کرنا چاہیئے۔"

راقم کو تحریر فرمایا :۔

"تعلیم کے مشغلہ کی نسبت یہ خیال کریں، کہ یہ حصول رزق کی کوشش ہے۔ اس نسبت سے یہ تعلیمی جدوجہد بھی عبادت میں شمار ہوگی۔ بااین ہمہ اوقات نماز و نوافل و ذکر کو قائم رکھیں۔

دوسرے طالبین کے مختلف خطوط میں بھی اسی طرح کی ہدایات پائی جاتی ہیں ہے، چند اقتباسات نقل کرتا ہوں۔

"رزق حلال کی کوشش بھی دین کے اجزا میں سے ہے، نیت درست ہو، تو یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے۔"

"دنیاوی پریشانیاں اگر علاج پذیر ہیں، تو تدبیر سے کام لیجئے، اور اگر علاج سے باہر ہیں، تو حوالۂ خدا کیجئے، کہ جو ہمارے حق میں مفید ہوگا۔ وہ فرمائیں گے۔"

"طلبِ کسبِ حلال فرض ہے۔ جب دیگر ذرائع کامیاب نہیں تو ملازمت میں کیا حرج ہے۔ اگر وہ کسی شرعی وجہ سے ناجائز نہیں، آپ دُعا اور اور تدبیر میں لگے رہیں۔ جب صورت اچھی نکل آئے تو تجارت شروع کریں"

"پریس کے کاموں کو پوری مستعدی سے انجام دیں۔ کیونکہ طلب رزق حلال واجب ہے۔"

"طلبِ رزق بھی فرض ہے۔ اور اس کے حصول کی مباح تدبیریں بھی اختیار کرنا ضروری ہے۔"

"طلبِ رزق کیلئے جو کوشش بھی ہو۔ اس کی کامیابی کی دُعاء ہے"

"طلب رزق ہر دروازہ سے کی جاسکتی ہے، طبیعت خیر کی طرف مائل ہے شکر کیجئے، ظاہری اعزاز کوئی چیز نہیں۔" ـــــ "کسی ذریعہ رزق کا حصول ہو جائے تو کافی ہے۔"

"باخلاص تمام آپ کی راحت و سعادت اور کشائش رزق کیلئے بدرگاہ باری تعالیٰ دُعا کرتا ہوں، اگر آپ رزق کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں تو طلب رزق کیلئے سعی و محنت بھی ضروری ہے۔ اس سے تغافل نہیں برتنا چاہیئے اصل مطلب یہ ہے، کہ رزق کی طرف سے مطمئن ہونا چاہیئے۔ یہ اطمینان اگر واقعی صدق توکل کے ذریعہ سے پیدا ہوگیا ہے، تو بہت بہتر ہے، ورنہ سعی و محنت سے کسبِ رزق کرنا چاہیئے۔"

ایک مسترشدِ خاص کو بعض مجبوریوں کی وجہ سے ملازمت ترک کرنے اور حیدرآباد سے ہجرت کرنے کے خیال پر تنبیہ فرماتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں۔

" ایک بات آپ سمجھ لیں۔ ملی ہوئی روزی کو بلا عذر شرعی کسی حال میں اس وقت تک چھوڑنا نہ چاہیئے۔ جب تک دوسری صورت متعین نہ ہوجائے، ہر جگہ یہی حال ہے ع

زمین سخت ہے آسمان دور ہے

حرمین کی ہجرت بے شبہ موجب برکات ہے۔ اگر تکالیف سفر اور روزی کی تنگی اور توکل کی وجہ سے دل تنگی کا اندیشہ نہ ہو تو مبارک ہے، مگر وہاں کا ماحول بھی قلب کے اطمینان کا باعث نہ ہوگا۔ اگر قلب کا لگاؤ ماحول سے، خواہ وہ سیاسی ہو، یا کسی اور نوع کا ہو قائم رہا ـــ اس کو اچھی طرح سمجھ لیں۔" (تذکرہ سلیمان ص۵۰۸)

ان اقتباسات سے سلوک سلیمانی میں رزق حلال کی طلب اور ذرائع معاش کی اہمیت اور ان کے لئے تگ و دو کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

دوسرا باب

(دوسرا باب)

ارادت و مشیخت

ضرورت شیخ

شروع میں "تزکیہ وصحبت" کے بارے میں جو کچھ عرض کیا جا چکا ہے۔ اس سے طریق میں شیخ کی اہمیت وضرورت لازماً ثابت ہو جاتی ہے۔ سلوک میں 'شیخ' کا جو مقام و اہمیت ہے۔ وہ وضاحت کا محتاج نہیں۔ 'شیخ' و 'طریقت' لازم و ملزوم ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ صحبت نبویؐ کے اس سلسلہ کا عام نام ہی 'پیری و مریدی' "(مشیخت و ارادت)" مشہور ہو گیا ہے۔ اور یہ ناقابل انکار حقیقت ہے۔ کہ شیخِ کامل کی رہنمائی و ہدایت، برکت و فیض اور اسکی محبت و اتباع کے بغیر اس راستہ میں ایک قدم بھی اٹھانا دشوار ہے ؎

یار باید راہ را تنہا مرو   بے قُلاوز اندریں صحرا مرو

عارف رومی کا ارشاد ہے

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر   ہست بس پر آفت و خوف و خطر

ہر کہ او بے مرشدے در راہ شد   او زغولاں گمرہ و در چاہ شد

گر نباشد سایہ پیر، اے فضول   پس ترا سرگشتہ دارد بانگ غول

اس راہ میں سالک کو "شیخ کامل" کی ضرورت ہر قدم پر پیش آتی ہے۔ شیخ کی حیثیت رہبر، مربّی، معالج روحانی، دینی پیشوا، مذہبی اُستاد، اخلاقی رہنما اور عملی گرہ کشا کی ہوتی ہے۔ وہ علم وعمل میں اسوۂ ونمونہ اور تجربہ کار و مشفق مشیر ہوتا ہے اس کی یافت عطیہ الٰہی، اور اس کی صحبت اکسیر اعظم، اس کی تربیت نعمت عظمیٰ اور اسکا فیض و توجہ افزائشِ ایمان و یقین کا سبب ہوتا ہے۔ ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال　　مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

سیّدی حضرۃ الشیخ الامام نور اللہ مرقدہ ارقام فرماتے ہیں:۔

"شیخ اپنے سلسلہ کے ارادتمندوں کو امورِ خیر کی تعلیم دیتا ہے۔ ان کے حقائق سے باخبر کرتا ہے۔ انکی تعمیل کا طریقہ بتاتا ہے۔ اور سالک کے ذہنی اور عملی مشکلات کو حل کرتا رہتا ہے۔ مثلاً غرور بری چیز ہے۔ اب یہ امر کہ غرور کی حقیقت کیا ہے اور غرور کہتے کس کو ہیں۔ اور اس سے بچنے کی تدبیر کیا ہے۔ اور آیا ہمارا فلاں کام غرور کی حد میں داخل ہے کہ نہیں، اسکا جواب نہ خالص محدّث دے سکتا ہے۔ اور نہ خشک فقیہ ان کو حل کر سکتا ہے۔ نہ مفسر بتا سکتا ہے۔ اور نہ متکلم ان کی عقدہ کشائی کر سکتا ہے۔ اب ان سوالات کا جواب جو بھی دے سکتا ہے۔ وہ شیخ طریقت ہے۔ جو ممکن ہے کہ محدّث بھی ہو۔ فقیہ بھی ہو، مفسر بھی ہو، یا نہ ہو، ہو تو بہتر ہے۔ نہ ہو تو حرج نہیں۔ مگر متبع ضرور ہو۔ جس نے اپنے بزرگوں سے ان کو سیکھا اور جانا ہے۔ یا اس نے خود کتاب وسنّت سے ان امور کی واقفیت پیدا کی ہے اور عمل کر کے

اس رتبہ پر پہنچا ہے۔ کہ غرور و تکبر سے اپنی استعداد کے مطابق پاک و صاف ہو گیا ہے۔ اور دوسروں کو بھی اپنی تعلیم و صحبت سے ایسا بنا سکتا ہے۔ (گو خود بغیر شیخ کامل کی صحبت کے کمالِ اصلاح و استعداد تعلیم باطنی اور تاثیر صحبت کا ہونا شاذ ہے۔ جو عقلاً جائز اور عادتاً نادر و مشکل ہے۔ م۔ ؤ)

انتخابِ شیخ

شیخ کی ضرورت ثابت ہو جانے کے بعد اصل مرحلہ انتخابِ شیخ کا ہے۔ ہر کس و ناکس اور ہر خطائی و ناقص مدعی مشیخت کو اپنا 'مربی' نہیں بنایا جا سکتا۔ فن کی بصیرت و مہارت معمولی بات نہیں ؂

ہزار نکتہ باریک تر زمو اینجاست　　نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

مزید براں نری 'فن دانی' سے اس راہ میں کام نہیں چلتا۔ یہ طریق سراسر عمل اور فیض و برکت کا ہے۔ جب تک شیخ خود صاحب عمل، سالکِ صادق، عارفِ محقق، اور بصیر و نکتہ رس فن دان نہ ہو، سلوک کی نازک گھاٹی میں بھٹکنے اور بہکانے کا ہر آن اندیشہ ہے۔ اسلئے اپنے کو کسی 'مربی' کے سپرد کرنے سے پیشتر 'معیارِ مشیخت' کا جاننا اور اسکے مطابق اسکا جانچ لینا ضروری ہے۔ کہ یہ معاملہ ایمان و دین جیسی متاع بے بہا کا ہے۔ اور یہ سودا عمر بھر کا ہے۔ اسلئے کسی کو راہبر بنانے سے پیشتر خوب سوچ لینا چاہیئے، کہ وہ 'واقفِ راہ و رہنما' بھی ہے یا نہیں' کہ ہر چمکدار چیز سونا' ہر دوا اکسیر اور ہر مدعِی مشیخت پیر نہیں ہوتا ؂

اے بسا ابلیس کہ آدم روئے ہست　　پس بہر دستے نباید داد دست

حضرت الشیخ قدس سرہٗ کسی کو تربیت میں لینے سے پہلے اس بات کی تسلی

کر لیتے تھے۔ کہ آیا طالب نے 'ارادت' کے ارادے سے پہلے شیخ کو جانا بھی ہے یا نہیں۔ طالب کی سُنی سنائی واقفیت کو قوی نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ ایک طالب کو لکھتے ہیں:۔

"فقیر سے آپ کی واقفیت محض سُنی سنائی ہے۔ اسلئے آپ نے حسنِ ظن سے کام لیا، سننا اور دیکھنا کافی نہیں۔ جاننا بھی ضروری ہے۔"

ایک اور طالب کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"مجھے خدمت سے انکار نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حضرت ..... سے طبیعت کو مناسبت نہ ہوئی، یا کیا وجہ ہے۔ جو اس سلسلے کو آپ نے قائم نہیں رکھا، آپ میری نسبت سمجھ لیں۔ کہ یہ خاکسار حضرت والا (مولانا تھانوی) رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں سب سے کمتر ہے۔ اور رتبہ میں بھی فروتر ہے اس پر بھی اگر اس ذرۂ بیمقدار کی طرف اپنے دل کی کشش بے تکلف محسوس فرمائیں۔ تو ظاہر فرمائیں۔ ایسا نہ ہو کہ بعد کو پچھتاوا آئے، میرے حالات کو بھی تحقیق فرمالیں، کہ میں اس قابل بھی ہوں، اگر ان سب باتوں کے بعد بھی دل کا میلان ہو۔ تو خدمت سے انحراف نہیں۔"

ایک دوسرے صاحب کو ارقام فرمایا:۔

"یاد فرمایا، شاد فرمایا، آپ نے مجھے انتخاب فرمایا تو میری نسبت آپ نے کچھ جان بھی لیا ہوگا۔ کہ میں اس سلسلہ کا سب سے کم سن اور کمترین ہوں۔ اگر اس کو جان کر بھی آپ میری طرف متوجہ ہیں۔ تو مجھے خدمت سے انکار نہیں ..... غالباً یہ ذہن نشین ہوگا۔ کہ عمر بھر کا سودا ہے۔ اسلئے

اس راہ میں جو قدم رکھا جائے۔ خوب سوچ سمجھ کر رکھا جائے۔"

مقصدِ ارادت

آج سلوک و مشیخت کی حقیقت پر جو تو بر تو پردے پڑ چکے ہیں۔ اور عامیانہ و فلسفیانہ تصوف نے مشیخت کی اصل تصویر و معیار اور ارادت کے مقاصد کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا ہے۔ اور طرح طرح کے مفاسد کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اور ایک کثیر طبقہ طریق کی آسان و مسنون راہ گم کر چکا ہے۔ ضرورت ہے کہ انتخاب شیخ سے پہلے مقصدِ ارادت اور معیارِ شیخ کو اچھی طرح جان لیا جائے۔

شیخ سے تعلق کا مُدعا صرف یہ ہے۔ کہ شیخ کی رہنمائی میں اللہ تعالیٰ کی رضا و قرب کے حصول کیلئے حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کا کامل و مکمل ظاہری و باطنی اتباع اختیار کیا جائے اور اس مقصد عالی میں شیخ کے علم و عمل، تعلیم و تلقین، تاثیر و تأثر اور فیض صحبت سے استفادہ کر کے اسوۂ کاملہ محمدیہؐ کو حالاً و قالاً، ظاہراً و باطناً اپنایا جائے، اور اس راہ میں کسی درجہ میں بھی کشف و کرامت، لذت و کیفیت، مواجید و رویاء وغیرہ مقصود نہیں نہ یہ پاک راستہ دنیاوی مال و جاہ، عزت و شہرت کے حصول کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اسلئے تمام سفلی اور غیر مقصودہ اوہام و خیالات سے دل و دماغ کو پاک کر کے محض رضائے الٰہی کی دُھن، اور اتباع نبویؐ کی طلب میں شیخ سے ارادت کا تعلق قائم کرنا چاہیئے۔ کہ نیت کا فساد تمام محنت کو ضائع اور برباد کر دیتا ہے اور ایسی حالت میں عمر بھر کے مجاہدات مقصودِ حقیقی تک نہیں پہنچا سکتے .....

معیارِ شیخ

ظاہر ہے کہ سلوک کا مقصد کامل اتباعِ نبوتؐ کے ذریعہ رضائے الٰہی کو حاصل کرنا ہے۔ پس لازم ہے کہ شیخ بھی اسی مقصد کا طالب و داعی اور اسی صراطِ مستقیم اور طریقِ قویم کا راہبر و راہی ہو۔ اسلئے شیخ کیلئے ضروری ہے کہ وہ "قلباً و قالباً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت رکھتا ہو، اور اپنے علم و عمل و فکر و نظر، طریقِ تربیت اور ذوق و حال میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک خاص مناسبت رکھتا ہو، صحتِ ایمان اور ظاہری عمل صالح کے ساتھ اس کے باطنی احوال بھی منہاجِ نبوت پر ہوں، محبتِ الٰہی، خشیتِ الٰہی، اخلاق للہ، تعلق مع اللہ کی کیفیت ہو، اخلاق و عادات و شمائل میں اتباعِ سننِ نبوی کی کیفیت ہو، حب للہ، بغض فی اللہ، رحمت علی الخلق اور شفقت علی الطالبین اسکی تربیت کا محرک ہو۔ اور سوائے رضائے ربانی اور اجرِ الٰہی کے اس کا کوئی مقصود نہ ہو۔ اسے جاہ و منصب، مال و دولت، عزت و شہرت اور ذاتی نام و نمود کا خیال نہ ہو، الغرض اسوۂ کاملہ محمدیہؐ کا پرتو اس کی ہر ادا میں جھلکتا ہو۔[1]

حضرت سید الملۃ قدس سرہٗ کے ایک مرید خاص نے سید صاحبؒ سے استفسار فرمایا جسکا خلاصہ یہ تھا، کہ "مولانا تھانویؒ نے جو معیارِ شیخ بتایا ہے۔ اس سے تشفی نہیں ہوئی میری فہم ناقص میں پیر کامل کی زندگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا عکس ہو، یعنی اگر زہد و تقویٰ کے اعتبار سے افضل ہو، تو دوسری طرف ملی حقوق و فرائض سے بھی غافل نہ ہو، اور اس کی زندگی انفرادی اور اجتماعی پہلو سے متوازن ہو۔" حضرت الشیخؒ نے جواباً تحریر فرمایا:۔

---

[1] مقدمہ از سید صاحب کتاب حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت مصنفہ ابوالحسن علی ندوی ص۸ بتغیر۔

"حضرت والا (مولانا تھانوی) رحمۃ اللہ علیہ نے (شیخ کے) جو معیار بتائے ہیں۔ وہ تمام تر حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف ومحاسن ہی کو پیش نظر رکھ کر بتائے، چنانچہ ارشاد فرمایا ہے:۔

"کہ اسکے عقائد واعمال تمام تر شرع کے مطابق ہوں۔"

تعبیر کا فرق ہے۔ آپ شرع کی جگہ اسوۂ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) رکھ دیجئے۔ ایک ہی بات ہے، اجتماعی پہلو اگر شرع ہے۔ تو وہ اس میں آگیا اور اگر مقصود موجودہ زمانے کی سوشل اور پولیٹیکل تحریکات ہیں۔ تو انکی نسبت بھی وہی سوال ہے کہ کیا وہ شرع سے باہر ہیں۔ اگر ایسا نہیں تو انفرادی و اجتماعی کوئی پہلو شرع کے دائرے سے خارج نہیں۔" (تذکرہ سلیمان ص ۲۹۲، ص ۲۹۳)

حضرت سیدی قدس سرہٗ نے ایک مرتبہ قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی:۔

یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْئَلُکُمْ اَجْرًا وَّھُمْ مُّھْتَدُوْنَ۔ (یٰسین۔ ۲)	اے میری قوم ان رسولوں کی راہ چلو (ضرور) ایسے لوگوں کی راہ پر چلو جو تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتے اور وہ خود راہ راست پر بھی ہیں۔

اور فقیر سے ارشاد فرمایا کہ:۔

"شیخ کی یہ صفت ہونی چاہئیے کہ وہ خود ہدایت یافتہ (ھُمْ مُّھْتَدُوْنَ) ہو اور اپنی خدمت پر کسی مال وجاہ اور اجر دینوی کا طالب نہ ہو۔ ایسا ہی شیخ قابل اتباع ہے (اوکمال قال)

غرض شیخ ہدایت یافتہ ہو متبع سنت ہو۔ اہل حق بزرگوں کا مجاز اور ان کے فیض و صحبت سے مستفید ومستفیض ہو۔ کمال کا دعویٰ نہ کرتا ہو، اسکے واقف ہمعصر علمائے

ربانیین اسکی نیکی وخیر وصلاح کے معترف ہوں، اسکی صحبت کی تاثیر اسکے اکثر متبعین و متعلقین کی حالت سے ظاہر ہو۔ طالبین کے حال پر شفیق اور ان کی تربیت کا فکر رکھنے والا ہو۔ یہ صفات جس قدر کسی 'شیخ' میں پائی جائیں۔ اسے غنیمت شمار کرنا چاہیئے، شیخ میں کسی کشف وکرامت کا ہونا ضروری نہیں۔

وحدت شیخ

'وحدت شیخ' کا مدعاء یہ ہے۔ کہ اپنی تربیت وتعلیم کا تعلق ایک ہی شیخ سے رکھے۔ کہ متعدد شیوخ سے ارشاد وتعلیم طالب کو انتشار وتشتت اور مخمصہ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ جمعیت خاطر و سکونِ قلب اور تفویضِ تام کیلئے وحدت شیخ لازمی ولابدی ہے۔ گو استفادہ وبرکت دوسرے بزرگوں کی صحبت سے بھی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن معالجۂ روحانی وتعلیم صرف ایک شیخ ہی کے ساتھ متعلق ہونی چاہیئے۔ یہ طریق کا نہایت اہم اور ضروری مسئلہ ہے' ہرجائی مرید، تشتت ذہنی، انتشار قلبی، پراگندگی فکر میں مبتلا ہو کر کہیں کا نہیں رہتا ہے' وحدت شیخ' میں سکون وآرام، طمانیت وآسانی ہے۔ اور تعدد وآزادی میں بے قراری، پریشانی اور دقت ومشقت۔ حضرت سید صاحب "شیخ واحد" سے تعلق ونسبت کی پابندی کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں :۔

تھی جو آزادی تو ہر سو دوڑ تھی   (وحدت شیخ) قید میں آرام ہی آرام ہے
اب درِ پیر مغاں چھوٹے نہیں   اس کی مٹی میں بھی فیض عام ہے

ایک طالب صادق کو ارقام فرماتے ہیں :۔

"صحبت تو تمام صالحین کی مفید ہے۔ بشرطیکہ متبع سنت ہوں ع
تمتع زہر گوشہ یافتم

مگر ارشاد صرف ایک ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ انتشارِ مقاصد پیدا ہو کر مقصد فوت ہو جائیگا۔ ہر ایک کی راہ الگ الگ ہے۔" (تذکرہ ص ۳۹۸)

دوسرے خط میں انہیں تحریر فرماتے ہیں:۔

"تمتع زہر گوشہ یافتم پر عمل کیجئے مگر تعلیم کا تعلق صرف شیخ سے رکھنا چاہیئے۔" (تذکرہ ص ۵۸۱)

ایک صاحب کو جو ایک شیخ سے تعلق رکھتے اور دوسرے بزرگوں کے علاوہ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی مکاتبت کرتے تھے۔ حضرت سید صاحب قدس سرہ نے تحریر فرمایا:۔

"متعدد بزرگوں سے خط و کتابت کرنا برکت کی حد تک تو خیر ہو سکتا ہے مگر متعدد لوگوں سے تعلیم لینا اور اپنے احوال کو پیش کرنا اور مشورہ کرنا طالب کیلئے خود مناسب نہیں۔ مقصود یہ ہے۔ کہ آپ اپنا مرکز ایک شخص کو بنائیں۔ سب سے بہتر تو جناب .... (مکتوب الیہ کے شیخ) ہیں۔ یا پھر جس سے آپ اپنا تعلقِ قلب مضبوط پائیں۔ بحث کسی شخص کی نہیں۔"

انہیں کو ایک دوسرے مکتوب میں لکھا:۔

"تعلیم کا تعلق صرف ایک سے رکھنا چاہیئے، دوسروں سے کسب فیوض بھی کر سکتے ہیں۔ مگر نصائح کی حد تک" مگر اپنے حالات و واردات و کیفیات کا اظہار صرف شیخ ہی سے کرنا چاہیئے۔ اور اسی سے علاج و تدبیر پوچھنا چاہیئے۔"

"مجھے معلوم نہیں کہ آپ کے معمولات کیا ہیں۔ اس باب میں آپ کو .... صاحب (طالب کے اصل شیخ) کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔"

اگر ایک وقت میں متعدد شیوخ پر نظر ہو۔ تو ان میں سے اس شیخ کے ساتھ

تعلیم و تربیت کا تعلق جوڑے جس سے مناسبت زیادہ ہو اور جس کی طرف دل کا میلان زائد پائے۔ حضرت اقدس قدس سرہٗ ارشاد فرماتے ہیں :۔

"اگر ایک سے زائد ہستیاں نظر کے سامنے ہوں، تو غور کرنا چاہیئے۔ کہ دل کا میلان کس کی طرف زائد ہے۔ اور کس سے اس کی عقیدت مندی زیادہ ہے۔ اسی کی صحبت اس کیلئے نافع ہوگی۔ (تذکرہ سلیمان صہ ۲۹۳)

لیکن 'وحدت شیخ' کا یہ مدعاء ہرگز نہیں۔ کہ دوسرے شیوخ کو ہلکا جانے، یا ان کی شان و مقام میں گستاخی کرے۔ بس اتنا سمجھنا کافی ہے۔ کہ میری تلاش میں میری مناسبتِ طبعی کی بنا پر اس شیخ سے دوسرے شیوخ کی نسبت زیادہ دینی فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔ ع

پیر من خس است برائے من بس است

اس لئے اپنے شیخ کا دوسرے بزرگوں سے ایسا تقابل بھی نہ کرے۔ جس سے دوسروں کی تنقیص یا استخفاف لازم آتا ہو۔ حضرت الشیخ نوراللہ مرقدہٗ تحریر فرماتے ہیں :۔

"میں نے پہلے ہی لکھ دیا ہے۔ کہ اپنے شیخ کی نسبت یہ اعتقاد رکھنا چاہیئے۔ کہ میری نافعیت کے لئے میری تلاش میں یہ سب سے بہتر ہے۔ پس دوسروں سے انکار کی ضرورت نہیں۔ مگر اتباع ایک کا ہے۔ ایک ساتھ دو طبیبوں کا مریض مصیبت میں مبتلا رہتا ہے۔"

ایک دوسرے صاحب کو اسی بارے میں ارقام فرماتے ہیں :۔

"پیر کے متعلق صرف اتنا اعتقاد رکھنا شرط ہے۔ کہ میری تلاش میں میری نافعیت کے لئے اس سے بہتر کوئی شخص اس وقت نہیں۔"

جانبین کا نفع

حضرۃ الشیخ قدس سرہٗ تربیت وارادت کے اس تعلق کو جانبین کیلئے دینی نفع کا ذریعہ سمجھتے تھے، اور اخلاص وخیر خواہی، بصیرت و دیانت کیساتھ طالب کی حسبتہ للہ تربیت وخدمت کو شیخ کا فریضہ جانتے تھے، اور شیخ کی تحتِ شرع تعلیمات کا بے چون وچرا امتثال واتباع مرید کی ذمہ داری و مرید پر شیخ کا حق گردانتے تھے کہ جانبین کے اسی باہمی طرزِ عمل سے طرفین کو صحیح فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ متعدد مکتوبات میں اس قسم کی تحریریں ملتی ہیں۔ جنکے بعض اقتباسات درج کرتا ہوں:۔

"میں بیعت میں آپ کو لینے کو تیار ہوں، اللہ تعالیٰ اس سے مجھے اور آپ کو فائدہ پہنچائیں۔"

"مجھے یہ رویاء (شیخ کو خواب میں دیکھنا) محبت کے آثار ہیں دُعا ہے کہ اس محبت فی اللہ سے فریقین کو فائدہ پہنچے۔" (تذکرہ سلیمان ص۲۰۷)

"یہ کیفیت مبارک ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو میرے اور آپ کے دونوں کیلئے وجۂ ازدیادِ برکات بنائے (تذکرہ سلیمان ص۲۱۶)۔

"مزدور جو مزدوری کرتا ہے (یعنی شیخ جو مریدین کی تربیت کرتا ہے) وہ

اس پر شکریہ کا مستحق نہیں، اس نے تو اپنا فرض ہی ادا کیا (تذکرہ صـ۳۹۲)

" یہ (تربیت) احسان نہیں ہے۔ یہ فرض کی بجا آوری ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ دونوں کو آپس کے تعلقات میں برکت عطا فرمائیں۔ اور اس محبت کو حب فی اللہ بنا دیں۔"

" یہ محبت جو صرف خدا کیلئے ہے یہی حب فی اللہ ہے۔ جو اصلاح اور ترقی روحانی کا زینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو طرفین کیلئے موجب سعادت بنائے۔"

" خدا کا شکر ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو توفیق خیر بخشی۔ محنت راہرو کی ہوتی ہے۔ راہ کا بتانے والا اپنا فرض ادا کرتا ہے۔"

محبت کا یہ روحانی رشتہ شیخ و مرید کے درمیان افادہ و استفادہ کی مضبوط کڑی بن جاتا ہے۔ جس سے دونوں کو نفع پہنچتا ہے

حضرت الشیخ قدس سرہٗ ایک مسترشدِ خاص کو لکھتے ہیں :۔

" یہ آپ کی محبت ہے جو اس ہیچمدان ناکارہ کے ساتھ ہے۔ اگر اس محبت کی دل میں پرورش کی جائے تو فریقین کیلئے نافع ہو۔ انشاء اللہ العزیز (تذکرہ صـ۳۹)

" ...... بحمد اللہ تعالیٰ طرفین میں محبت ہے۔ اور اسی سے اُمیدِ کامیابی ہے۔ (تذکرہ صـ۶۳۶)

ایک ندوی عزیز کو ارقام فرماتے ہیں :۔

" یہ محبت جو صرف خدا کیلئے ہے۔ یہی حب فی اللہ ہے۔ جو اصلاح اور ترقی روحانی کا زینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو طرفین کیلئے موجب سعادت بنائیں۔"

...... " اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ، دونوں کو آپس کے تعلقات میں برکت

عطا فرمائیں۔ اور اس محبت کو حبّ فی اللہ بنا دیں۔"

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"یہ اُنسِ (شیخ) مبارک، جو محبت کے مظاہر میں اسکے مظہر ہے اللہ تعالیٰ اس محبت کو طرفین سے بڑھائیں اور دونوں کیلئے نافع فرمائیں۔ (لیکن) محبت کے اظہار میں غلو سے احتیاط لازم ہے "

ایک صاحب کو لکھا :۔

" یہ (دھیان ویادِ شیخ) آثار محبت ہیں۔ اللہ تعالیٰ طرفین کے لئے۔ اسے موجب سعادت و برکت بنائیں۔ اپنے سب محبوں کیلئے دعاء گو ہوں۔"

حضرت سیدی قدس سرہٗ خود اپنے شیخ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی محبّت میں سرشار تھے۔ اور بڑی عظمت و عقیدت سے ان کا تذکرہ کرتے تھے اِن کے فنا فی الشیخ ہونے کی کیفیت ان کے ارشادات و احوال اور اشعار و اقوال سے ظاہر ہے۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے مجموعۂ غزلیات " غزل الغزلات " جو مولانا تھانویؒ کے تعلق کے بعد کا کلام ہے۔ اپنے شیخؒ عالی مقام کا تذکرہ جس والہانہ انداز میں کیا ہے۔ وہ حضرتؒ کی شیخ سے عقیدت و محبت کی کھلی دلیل ہے۔ کچھ منتخب اشعار سے اسکا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں :۔

تاثیر شیخ :

مجھ پہ جادو یہ چلایا کس نے　　مجھکو دیوانہ بنایا کس نے

میں تھا آسودۂ خواب غفلت　　مجھکو سوتے سے جگایا کس نے

اپنا ہر داغ نظر میں آیا　　ایسا آئینہ دکھایا کس نے

عشق کی راہ یقین کی منزل　　مجھکو یہ راز بتایا کس نے

کھو گئی عقل و خرد کی دنیا　　جام سرشار پلایا کس نے

اب کچھ آباد ہے دل کی بستی　　اس خرابہ کو بسایا کس نے

دل تھا مردہ لحد سینہ میں　　اس کو قُم کہہ کے جلایا کس نے

جس کو تھا آٹھ پہر کا رونا　　ایسے روتے کو ہنسایا کس نے

کس نے بھر دی یہ صدائے دلنواز

ہر رگِ جان ساز الا اللہ ہے

نگاہ شیخ :

تیری نظر میں ہے تاثیر مستی صہبا　　تیری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے

تیری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں　　وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

پلادے ساغر سرشار مجھکو وہ ساقی　　خزاں کو ایک اشارے میں جو بہار کرے

یاد شیخ :

اے خوشا جوش محبت اے خوشا تاثیر عشق

گاہے گاہے ان کو میری یاد اب آنے لگی

نامۂ عرضِ محبت شوق سے پڑھنے لگے

خط سے کیا دل کے دھڑکنے کی صدا آنے لگی

میری وارستہ طبیعت مدح کے قابل ہوئی

اب میرے جوش جنوں کی سبھی ادا بھانے لگی

فیض شیخ :

یہ کس میکدہ سے اٹھی موج مے چلی آرہی ہے جو فیضان ہوکر

علقۂ شیخ :

قیل و قال مدرسہ کو چھوڑ کر شیخ بھی رندوں میں اب شامل ہوا
آج ہی پایا مزہ ایمان کا جیسے قرآں آج ہی نازل ہوا
ایسے کچھ انداز سے تقریر کی پھر نہ پیدا شبہۂ باطل ہوا
کھول کر کیا جانیئے کیا دیدیا حلق سے اترا کہ شیدا دل ہوا
قید پایا ہے حلقۂ پیر مغاں پھر نہ اٹھا جو یہاں داخل ہوا

چشم ساقی :

اگر ساقی تری چشم فسونگر کام کر جائے بدل جائے نظام دل بدل جائے جہان دل
تری ساقی کرامت اس سے بڑھکر اور کیا ہوگی زبان میری لگی اک گھونٹ میں کرنے بیان دل

دیدار شیخ :

یاد آیا چشم ساقی کا کرم پھر چھلکتے جام کی امید ہے
دید اسکی مایۂ عیش و نشاط ابروئے ساقی ہلال عید ہے
اس سے پایا روئے ملت نے فروغ ختم اس پر دورہ تجدید ہے

چارہ گری شیخ

اے مسیح درد دل، چارہ گر آزار دل پا رہا ہے تیرے درماں سے شفا بیمار دل
دور ہوتی جا رہی ہے، ہر کھٹک جو دل میں تھی تیرے سوزن سے نکلتے جا رہے خار دل

محفل شیخ :-

ذرہ ذرہ عالمِ محسوس کا خاموش ہے
یا رہے گرم سخن محفل سراپا گوش ہے

حبذا پیر مغاں دریا دل و دریا نوال
جمع ہیں میخوار میخانے میں نوشا نوش ہے

تاثیر کلامِ شیخ :-

ادھر کہتا گیا وہ اور ادھر آتا گیا دل میں
اثر یہ ہو نہیں سکتا کبھی دعوائے باطل میں

حیاتِ نو مجھے انکی نگاہ ناز نے بخشی
بھرا ہے آب حیواں کاسۂ زہر ہلاہل میں

اتباع شیخ :-

جو موسیٰ بھی ہوں تو اتباع خضر لازم ہے
ہدایت منحصر ہے اتباع شیخ کامل میں

فیضان شیخ :-

سازگار اب گردش ایام ہے
دور میں ہشتاد سالہ جام ہے

اس کی دزدیدہ نگاہی کے نثار
آج ہی آغاز کا انجام ہے

فیض ہے یہ کس ولیٔ وقت کا
اب مرا جو شعر ہے الہام ہے

فنائیت فی الشیخ :-

آتا ہے خدا بھی ترے صدقے میں مجھے یاد
گویا کہ بظاہر میں خدا بھول گیا ہوں

ہر سمت نظر آتے ہیں ہر وقت وہ مجھکو
دوری مسافت کا گلا بھول گیا ہوں

اے خضر مرا قافلہ کس سمت چلا ہے
تمیزِ صدائے درا بھول گیا ہوں

طلبِ فیضِ شیخ :-

دور سے آیا ہوں ساقی دیر سے آیا ہوں میں
ہو عطائے خاص مجھکو جو عطائے عام ہے

حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ سے تعلق کے بعد کی اس عارفانہ شاعری کو حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی 'دماغی' شاعری' قرار دیتے تھے۔ یہ اشعار رسمی شاعری نہیں بلکہ وارداتِ قلبی اور عشق و محبت کا بادہ سرجوش ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ ؎

جو شعر بھی سپردِ قلم کر رہا ہوں میں — اب وارداتِ عشق رقم کر رہا ہوں میں

دیوانگانِ عشق کو دے کر صلائے عام — آراستہ یہ مجلسِ جم کر رہا ہوں میں

حضرت سیدی قدس سرہٗ فرماتے تھے۔ "یہ (مجموعہ کلام۔ غزل الغزلاتؔ) میرا غزل نامہ نہیں بلکہ سفرنامہ ہے"۔ گویا حضرۃ الشیخ رحمۃ اللہ علیہ کی سیر سلوک کا مختصر روزنامچہ ہے جس میں سید الملتؒ نے اپنی مختلف منازل سلوک کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اِس مجموعہ میں سلوک کے متعلق کچھ تعلیمات بھی نظم ہوگئی ہیں۔ اور اپنی تاثیر میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ حضرت والاؒ فرماتے تھے "میں جب تک خاص حالت نہ ہو، ایک شعر بھی نہیں کہہ سکتا۔" بہر حال حضرت والاؒ کا یہ مجموعہ کلام حضرتؒ کی اپنے شیخ سے عقیدت و محبت ان سے والہانہ تعلق اور انکی تعلیمات سے شغف پر گواہ ہے۔

شیخ کی محبت کے سلسلہ میں بعض واقعات قابل ذکر ہیں:۔

"ایک مرتبہ سیدی قدس سرہٗ نے مختلف موضوعات اور سیاست پر گفتگو کے بعد مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"بزرگوں کی مجالس میں ان چیزوں کا نام تک نہ تھا۔ گویا اس زمانہ میں وہ تھے ہی نہیں۔"

ؔ برادر گرامی مولوی غلام محمد صاحب مصنف "تذکرہ سلیمان" نے حضرت والاؒ کا مجموعہ کلام "ارمغانِ سلیمان" کے نام سے شائع فرمادیا ہے۔ اسمیں غزل الغزلات بھی شامل ہے۔ م۔ا

ایک مجلس میں مہاجرین کے مال و جائداد کے بھارت میں رہ جانیکا ذکر تھا۔ فرمایا۔

" اللہ میاں آجکل زبردستی صوفی بنا رہے ہیں۔ صوفیہ اسباب کی کثرت سے مشوش ہوتے تھے۔ ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ہر سال اپنے سامان کا جائزہ لیتے تھے۔ اور گرمی اور سردی کے دُو دُو جوڑوں کے سوا سب اللہ تعالیٰ کے راستہ میں دیدیتے تھے۔"

ایک صاحب کے استفسار پر تحریر فرمایا:۔

" یہ خاکسار لفظاً پیر ہے۔ اللہ تعالیٰ معنًی بھی بنا دیں۔ آپ نے ڈان میں جو پڑھا ہے۔ وہ صحیح ہے۔ کہ مجھے حضرت والا سے تعلق خدمت ہے۔ اللہ اُنکی تعلیمات کی برکت سے بہرہ مند فرمائیں۔"

مولانا تھانویؒ کے متعلق مولانا عبدالباری صاحب ندوی مدظلہ اور مولانا دریابادی دام فیضہ کی تصانیف کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرتؒ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ تصوّف کی حقیقت کو نئی پود کے سامنے اجاگر کرنے کیلئے ہنوز کلک سلیمانی کی ضرورت ہے تو ارشاد فرمایا:۔

" جی ہاں! وہ حضرات اپنا کام پورا کر چکے، لیکن میں مکمل نہ کر سکا۔"

ایک طالب نے عرض کیا۔ کہ حضرت 'حیاتِ شبلی' لکھ کر آپ استاد کا حق ادا کر چکے، اگر 'حیاتِ اشرف' پوری ہو جاتی ..... تو شیخ کا حق بھی پورا ہو جاتا۔ کس سوز و درد سے فرمایا:۔ " حق کیا ادا ہوتا؟ "

حضرت تھانویؒ کے سانحہ ارتحال پر معارف کے شذرات میں موتُ العالِم موت العالَم کے عنوان سے حضرت سید صاحبؒ نے جسطرح صفحہ قرطاس پر اپنے دل کے ٹکڑوں کو بکھیر کر رکھ

دیا ہے۔ اسکا ایک ایک حرف شیخ کی عقیدت و محبت، میں ڈوبا ہوا ہے اور حقیقت ہے کہ یہ منشور مرثیہ سلیمانیؒ درد و سوز صبر و استقامت اور رعایتِ حدود کا اچھوتا نمونہ ہے۔

غرض حضرت سیّد الملت رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی محبت میں سرشار تھے، اور شیخ بھی اپنے مخلص مرید کی تعریف میں رطب اللسان، چنانچہ حضرت سیّد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ایک کارنامہ پر فرط مسرت میں بے اختیار جذبات اشرفیہ منظوم ہو جاتے ہیں۔ اور ارشاد فرماتے ہیں:-

از سلیمانؒ گیر اخلاص عمل　　داں تو ندوی را منزہ از دغل
اے دولت معمور از اسرارِ حق　　اے دولت مخمور از آثار حق
اے دولت پرنور از انوار حق　　اے دولت مسرور از اخبار حق

شیخ و مرید کا یہی باہمی جذب و انجذاب اور عشق و محبت تھی جس نے حضرت سیّد صاحب قدس سرہ کو دیکھتے دیکھتے وراثتِ شبلیؒ اور اپنے بے مثل خصوصی علوم و کمالات کے ساتھ شیخ کے علوم و معارف کا بھی حامل و مثنیٰ بنا دیا۔ ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔

حضرت والا قدس سرہٗ کے رفیق قدیم و صدیق حمیم مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہٗ ارقام فرماتے ہیں:-

"حکیم الامت و امام طریقت تھانویؒ کا آخری زمانہ تھا۔ کہ ان سے عقیدت پیدا ہوئی، اور والہانہ حد تک پہنچ گئی، بیعت ہوئے اور مرشد کے اندر ایسے جذب ہوئے کہ ایک لفظ فنا فی الشیخ جو مدت سے سننے میں آرہا تھا۔ اسکا ایک عملی نمونہ پیش کر دیا۔" (صدق جدید ۴ دسمبر ۱۹۵۳ء)

بیعت

حضرت سیدی قدس سرہٗ بیعت کے رسمی طریقہ کو ضروری نہیں سمجھتے تھے کہ سلوک میں اصل مقصود تعلیم و تربیت ہے۔ بیعت صرف اسکا ایک ظاہری نشان ہے۔ مقصد کے حصول میں اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ شیخ اگر بیعت کو مناسب سمجھے تو استحسان کے درجہ میں بہتر ہے۔ ورنہ اگر شیخ تربیت میں اور سالک اس کی تعلیمات کی پیروی میں کوتاہی نہ کرے۔ تو بغیر بیعت کے بھی فیض حاصل ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں عدمِ بیعت سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ مولانا مسعود عالم ندویؒ کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"بیعت کا رسمی طریقہ غیر ضروری ہے۔ یہ میں نہیں کہتا۔ بلکہ ہمارے بزرگوں کا ارشاد ہے۔" (مکاتیب سلیمان)

راقم سے ایک مرتبہ فرمایا:۔ "مقصود تو تعلیم ہے۔ لوگوں میں بیعت کی جتنی اہمیت ہے تعلیم کی اتنی نہیں۔"

ایک گرامی نامہ میں تحریر فرمایا:۔

"بیعت ضروری شے نہیں۔ تاہم اگر ان کو اصرار ہو تو خط کے ذریعے ہو سکتی ہے۔"

ایک دوسرے مکتوب میں ہے:۔

"بیعت کوئی ضروری چیز نہیں۔ تاہم اگر اس سے کوئی دینی نفع سمجھتے ہیں تو مجھے عذر نہیں۔" ایک طالب کو لکھتے ہیں :۔

"بیعت کی اہمیت اسی قدر ہے کہ اس سے طبائع میں مزید مستعدی پیدا ہو جاتی ہے۔ بہر حال اگر اسکی خواہش ہے تو انشاء اللہ پوری ہو گی۔"

ایک دوسرے صاحب کو ارقام فرمایا :۔

"جیسا کہ میں نے زبانی کہا۔ کہ بیعت پر نجات موقوف نہیں۔ لیکن اگر آپ کا دل طالب ہے۔ تو پہلے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کا رسالہ قصد السبیل ملاحظہ فرمائیں۔ تاکہ مقصد کا تعین ہو۔ اور باہمی غلط فہمی نہ ہو۔"

درحقیقت 'بیعت' شیخ و مرید کے درمیان ایک 'معاہدہ' ہے کہ شیخ اس کی اصلاح دینی اور خیر خواہی میں کمی نہ کرے گا۔ اور مرید شیخ کی ان ہدایات کی پوری پابندی کرے گا۔ جو خلافِ شریعت نہ ہونگی۔ حضرت سید الملۃ رحمۃ اللہ علیہ ایک صاحبِ علم مرید کو تحریر فرماتے ہیں :۔

"ہمارے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے بقول یہ بیعت طرفین سے معاہدہ ہے۔ مُفید کی طرف سے اس بات کا کہ وہ تعلیم و شفقت میں اپنے جانتے کمی نہ کرے گا۔ اور مستفید کی ، ف سے اس بات کا کہ وہ اتباع میں حسب استطاعت کمی نہ کریگا۔"

بیعت کے نفع کا مدار مناسبت پر ہے۔ اسلئے بیعت یا اس 'باہمی معاہدہ' سے پیشتر صحبت یا خط و کتابت کے ذریعے شیخ سے مناسبت پیدا کر لینا مستحن ہے۔ اسلئے جب تک یہ مناسبت پیدا نہ ہو، بیعت میں عجلت کئے بغیر

شیخ کی ہدایات پر عمل کرتا رہے۔ اور بیعت کو شیخ کی صوابدید پر چھوڑ دے۔ کہ جب وہ مناسب سمجھے بیعت لے لے۔

اِس سلسلہ میں حضرت الشیخ قدس سرہٗ ایک زیر تربیت طالب کو ارقام فرماتے ہیں۔

"بیعت شیخ و مرید کے باہمی معاہدہ کا نام ہے۔ وہ بھی انشاء اللہ تعالیٰ اپنے وقت پر ہوگا۔ یہ سب اسی کیلئے تیاری ہے۔"

ایک دوسرے مکتوب میں اِسی طالب کو لکھتے ہیں :۔

"آپ اپنے معمولات میں مصروف رہیں۔ پھر بیعت کی خواہش کریں۔ کہ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت ہونا چاہتا ہوں، تو پھر میں بیعت انشاء اللہ تعالیٰ لے لوں گا۔"

ایک دوسرے طالب کو تحریر فرماتے ہیں :۔

"بیعت شیخ و مرید کے باہمی معاہدہ کا نام ہے۔ وہ انشاء اللہ تعالیٰ اپنے وقت پر ہوگا۔ اور یہ سب اسی کیلئے تیاری ہے۔"

ایک مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

"یہ (بیعت) طرفین سے الحب فی اللہ کا معاہدہ ہے۔ کہ طالب تعمیل میں اور مطلوب یعنی شیخ تعلیم میں کوئی کمی اخلاص میں نہ کرے گا۔ باقی رسم بیعت میں استعجال غیر ضروری ہے۔ یہ بات اپنے وقت پر انشاء اللہ ظہور میں آئیگی۔"

ایک اور صاحب کے خط میں ہے :۔

"یہ (اقرار بیعت) اپنے وقت پر ہوگا۔ بیعت ایک اقرار کا نام ہے۔ اقرار سے پہلے اقرار کی تکمیل کیلئے اپنے کو تیار کرنا چاہیئے۔ ورنہ یہ اقرار بھی بے سود

ہوگا......انشاء اللہ تعالیٰ آپ کی طبیعت میں عزیمت پیدا ہو جائے تو بیعت بھی ہو سکے گی۔ ابھی آپ اصلاح کا کام جاری رکھیں۔"

ایک بیعت کے خواہشمند کو تحریر فرمایا:۔

"بیعت کیلئے میں تیار ہوں .... مگر بہتر ہے۔ کہ آپ اس کی تیاری بھی کر لیں، پہلے مطلع کریں۔ کہ نماز پابندی سے اور جماعت سے آپ پڑھتے ہیں۔ اور دگر معمولات شب و روز آپکے کیا ہیں۔ اور کیا اس راہ پر پورے مستقل آخر تک رہ سکیں گے۔ اپنے عیوب کا بھی جائزہ لیں۔"

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ علماء، تعلیم یافتہ طبقہ اور امراء کی بیعت میں بہت احتیاط فرماتے تھے۔ اور جب تک ان سے پوری مناسبت اور ان میں جذبہ اصلاح کے عزم راسخ کا ظن غالب نہیں ہو جاتا تھا، بیعت نہیں فرماتے تھے۔ گذشتہ سطور میں تاخیر و التوائے بیعت کی ہدایات اکثر ایسے ہی حضرات کو ہیں۔ اس بات پر ایک واقعہ سے مزید روشنی پڑتی ہے۔ اسلئے نقل کرتا ہوں۔

راولپنڈی کے ایک سفر میں حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ بیمار تھے، کچھ دنوں تک کرنل سرور کے زیر علاج رہے، قیام ڈی۔ایم۔ملک اور محترمی محمد شفیع قریشی صاحب کی کوٹھی پر تھا، دوران قیام میں ایک میجر (ڈاکٹر) صاحب نے میرے سامنے بیعت پر انتہائی اصرار کیا۔ حضرت والاؒ نے پہلے ان سے قصد السبیل کے خاص خاص مقامات پڑھوائے، پھر بیعت کی ذمہ داریاں سمجھائیں، لیکن وہ بیعت پر مصر رہے۔ آخر حضرت والاؒ نے پوچھا، آپ کا بیعت سے مدعاء کیا ہے۔ ان کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ "اتنے بڑے عالم کا مرید ہو جاؤنگا۔" حضرت والاؒ اپنی معلوم مروت کی بنا پر خاموش رہے

اور وہ اسی طرح اصرار کرتے رہے، اس وقت مجھے کسی کام کی وجہ سے چلا جانا پڑا۔ واپسی پر رات کو حضرت والاؒ سے پوچھا۔ کیا میجر صاحب بیعت ہو گئے ہیں؟ ارشاد فرمایا۔ "ہم مریدین کے شکار کے پیچھے نہیں پھرتے اور پھر فرمایا۔" آپ نے ان کی بات سنی تھی ان کی نیت اپنی اصلاح کی نہ تھی۔"

اس کے بالمقابل ایک سیدھے سادے فوجی سپاہی کے خلوص و مناسبت اور طلب کو دیکھکر فوراً وہیں بیعت فرمالیا، کہ حضرت الشیخ قدس سرہٗ سیدھے سادہ غربا کی بیعت میں زیادہ تاخیر نہیں فرماتے تھے۔ اور انکی طلب پر بشرط مناسبت انہیں جلد ہی بیعت سے سرفراز فرمادیتے تھے۔ اسی طرح شادی شدہ عورتوں کو ان کے خاوند کی اجازت کے بعد جلد بیعت فرمالیتے تھے۔ لیکن ناکتخدا لڑکیوں کی تربیت بغیر بیعت کے فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ راقم سے فرمایا:-

"کنواری عورتوں کی بیعت میں ایک مشکل ہے۔ نہ معلوم آگے چل کر ان کی شادی کس سے ہو، وہ پسند کرے یا نہ کرے۔"

چنانچہ ایک ناکتخدا طالبہ نے جب بیعت کی درخواست کی تو ارقام فرمایا:-

"بیعت آئندہ حالات کے جاننے پر منحصر ہے۔ ابھی انتظار کرو۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے۔ اصل مقصود کام ہے۔ بیعت اصل مقصود نہیں۔"

اِس جواب پر طالبہ نے جب حسرت ویاس کا اظہار کیا تو اسے ارقام فرمایا:-

"اس میں مایوسی اور نا امیدی کی کوئی بات نہیں۔ نہ اس کو بدبختی سمجھیں، بات یہ ہے کہ جب تک لڑکی کا نکاح نہیں ہوجاتا۔ اسکی زندگی پوری نہیں ہوتی۔ معلوم نہیں اسکا آئندہ شریک حیات کون ہوگا۔ اور کیسا ہوگا

اسلئے مصلحت کا تقاضا یہ ہے۔ کہ اس کا لحاظ کیا جائے۔ باقی آپ کی پوری تعلیم جاری رہے گی۔ آپ اپنے معمولات لکھکر بھیجیں۔"

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ شادی شدہ عورتوں کے خط پر خاوند کے اور لڑکیوں کے خط پر باپ یا بھائی کے دستخط ضروری سمجھتے تھے۔ ایک طالبہ کو لکھتے ہیں:۔

آپ کے خط پانے سے خوشی ہوئی، آپ کو چاہیئے۔ کہ اپنے اس خط پر اپنے بھائی صاحب کے دستخط کرالیتیں۔ یا اپنا تعارف کرالیتیں۔ گو زبانی۔۔ ۔۔۔۔ سے آپ کا حال معلوم ہوگیا۔ دوسرے یہ کہ اپنا نام نہ لکھیں، اسکی جگہ ہمشیرہ فلاں لکھ دیا کریں۔"

ایک صاحب کو جو اپنی چند رشتہ دار عورتوں کو بیعت کرانا چاہتے تھے۔ تحریر فرمایا:۔

"آپ کسی پر زور نہ دیں۔ نہ کسی دوسرے کی وکالت کریں۔ اگر انکی شادیاں ہوگئی ہیں۔ تو وہ اپنے اپنے شوہروں کی اجازت سے خط لکھیں۔ اور اس میں بجائے نام کے اہلیہ فلاں لکھیں۔ شوہر کی اجازت کا رقعہ اس میں رکھیں۔ آپ کی اہلیہ سلمہا بھی اس پر عمل کریں۔"

ان تحریروں سے جہاں مسلکِ سلیمانی کی صفائی و پاکی کا اندازہ ہوتا ہے وہاں حزم و احتیاط اور حدود کی رعایت اور رکھ رکھاؤ بھی نمایاں ہے۔ کہ خاصانِ خدا کا کمال ہر حال میں اعتدال اور رعایت حقوق و پابندیِ احکام الٰہی ہے

شرائطِ بیعت

حضرت سیدی قدس سرہٗ محبتِ شیخ اور اصلاح کی عزیمت و ہمت کو شرائطِ ارادت میں سے سمجھتے تھے، کہ مناسبت اور اسکا نفع بھی انہیں دو شرائط کا ثمرہ ہے۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک طالب کو

ارقام فرماتے ہیں :-

" بیعت کیلئے صرف یہ شرط ہے۔ کہ اپنی اصلاح کی عزیمت دل میں پیدا ہو، اور جس سے تعلق رکھتا ہو۔ اس سے محبت ہو "

شرطِ اول : حُبِّ شیخ حبِّ شیخ اس راہ کی کلید، کامیابی کا زینہ، اور اصلاح و ترقی باطنی کا ذریعہ ہے۔ جس سے طرفین (شیخ و مرید) کو نفع پہنچتا ہے۔ اور یہ راہ آسانی سے طے ہوجاتی ہے۔ "شیخ" کی محبت مرید میں اعتقاد و اعتماد اور انقیاد کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ اور "شیخ" کی مشکل سے مشکل ہدایات پر عمل محبت کی بنا پر سہل اور پھولوں کی سیج بن جاتا ہے کہ بقول عارف رومی :-

از محبت تلخہا شیریں شود ۔۔۔ وز محبت مسّہا زریں شود

از محبت خارہا گل مے شود ۔۔۔ وز محبت سرکہا مل می شود

از محبت دار تختے می شود ۔۔۔ وز محبت بار بختے می شود

از محبت سقم صحت میشود ۔۔۔ وز محبت قہر رحمت میشود

اس وجہ سے حضرت الشیخ نور اللہ مرقدہٗ کی تحریروں میں حبِّ شیخ کی اہمیت و ضرورت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ایک سالک کو تحریر فرماتے ہیں :-

" یہ ظلِّ محبتِ رسول ؐ شیخ سے بھی ویسی ہی محبت رکھنی چاہیئے کہ وہ رہنمائے محبت رسول ؐ اور احکام رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے (تذکرہ سلیمان ص ۵۰۶)

حضرت والاؒ اپنے شیخ سے اپنے تعلق کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے رفیقِ قدیم و صدیق حمیم حضرت مولانا شاہ عبدالباری صاحب مدظلہٗ کو لکھتے ہیں :-

" تھانہ بھون کا یہی قصہ ہے۔ حضرت میرے ہر معاملہ حتّٰی کہ ذاتی معاملہ سے

بھی خبردار ہیں۔ اور یہ میرا جوشِ محبت ہے۔ کہ اپنے والدِ شفیق کی طرح انکو ہر معاملہ لکھے بغیر چین نہیں ملتا، میرا مذاق یہ ہے، کہ شیخِ وقت قائم مقام نبی ہے۔ ان امور میں جو مختص بالنبوۃ نہیں۔ غرض یہ کہ جس طرح نبی کی یہ شان ہے لا یؤمن احدکم حتّٰی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ ونفسہ (اوکما قال) اسکا عکس شیخ میں بھی ہونا چاہیئے۔"

شیخ کی محبت ہو۔ تو غیاب وحضور دونوں میں فائدہ ونفع ہوتا رہتا ہے۔

حضرت الشیخ ایک مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

"کوئی حرج نہیں" (شیخ سے) محبت کیساتھ غیوبت اور حضور دونوں میں فائدے ہیں۔ کام میں لگے رہیئے ؎

......" آپ سفر سے نہ گھبرائیں۔ ممکن ہے یہ بُعد وہجر محبت کے ازدیاد کا باعث بنے۔ صرف یہ خیال رہے کہ بے دینوں کی صحبت سے احتراز ہو جائے۔ اور ذکرالٰہی سے دل کو تازہ رکھا جائے، اور اس (یعنی اللہ) کو حاضر وناظر سمجھا جائے" ......

اس راہ میں قرب وبعد ایک ہے، شیخ کے واسطے سے جسکا قرب مطلوب ہے وہ تو قَرِیبٌ مُّجِیبٌ ہے اور اَقْرَبُ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔ رگِ جان سے بھی قریب ؏

اک ذرا گردن جھکائی دیکھ لی "

دوسری شرط | ہمت وعزیمت :۔ گذر چکا کہ حضرۃ الشیخؒ محبت شیخ کے ساتھ اپنی اصلاح کی عزیمت وہمت کو شرائط ارادت میں سے سمجھتے تھے کہ اس طریق

کے ہر راہی اور اصلاحِ نفس کے ہر طالب کیلئے ضروری ہے کہ اپنی اصلاح وتزکیۂ ظاہر وباطن کیلئے ہمت وعزیمت سے کام لے، اختیاری امور میں بے ہمتی وکسل اور کوتاہی کو دخل نہ دے اور غیر اختیاری امور کے پیچھے نہ پڑے۔ جو شخص ہمت وعزیمت سے کام میں لگا رہے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہ ایک دن مقصد کو پا ہی لے گا۔ بقول حضرت الشیخ ؎

آ ہی جائیگا کبھی اس تک بھی ساقی دورِ جام
منتظر بیٹھا ہوا جو بھی تری محفل میں ہے

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک طالب کو لکھتے ہیں :۔

"اصلاح کا پہلا قدم اپنی گذشتہ غلطی اور تقصیر کا اعتراف اور ندامت اور آئندہ اسکی اصلاح کا عزم بالجزم ہے۔"

ایک دوسرے صاحب کو تحریر فرمایا :۔

"یہ راہ عزیمت کے بغیر طے نہیں ہوتی، انشاء اللہ تعالیٰ آپ کی طبیعت میں عزیمت پیدا ہوجائے تو بیعت بھی ہو سکے گی۔ ابھی آپ اپنی اصلاح کا کام جاری رکھیں۔" انہیں کو دوسرے خطوط میں ارقام فرماتے ہیں :۔

"انشاء اللہ تعالیٰ عزیمت وہمت کا ارادہ آپ کرینگے۔ تو یہ چیز (عزیمت) بھی حاصل ہوگی۔ آپ اپنی طرف سے امور اختیاری میں تساہل نہ فرمائیں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ جو ہماری راہ میں محنت کرے گا۔ اِس کو راہ دکھائیں گے۔" ؎

ہمت بلند دار کہ پیشِ خدا و خلق باشد بقدرِ ہمت تو اعتبار تو۔"

مزید ارشاد ہے :۔

"یہ دنیا اس طرح مفاسد سے بھر گئی ہے۔ کہ کسی دیندار آدمی کو اس کے تقاضے کے مطابق ماحول ملنا مشکل ہوگیا ہے۔ ہر گوشہ سے فتنے سر نکالے ہوتے ہیں۔ اب انسان کی حفاظت کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک انسان کی ہمت و عزیمت جو اللہ تعالیٰ نے اسلئے اپنے بندہ کو ودیعت کی ہے۔ دوسرے اسکی توفیق، پس انہیں دو ذریعوں سے کام لینا چاہئیے۔ اپنی عزیمت وہمت کو اپنی قوت و ارادہ سے ہمیشہ مضبوط رکھنا چاہئیے اور دوسرے اللہ تعالیٰ سے توفیق کی دعاء ہمیشہ مانگنی چاہئیے۔ اور دعاؤں میں کہنا چاہئیے کہ 'خداوندا ہم میں کیا ہے تیری ہی توفیق ہمکو برائیوں سے بچا سکتی ہے۔ اور نیکی کی راہ پر چلا سکتی ہے۔' لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔ کے یہی معنیٰ ہیں۔ کہ انسان میں نیکی کی قوت اور برائی سے بچنے کی صلاحیت صرف اللہ تعالیٰ کی مدد سے ممکن ہے۔ یہی معنیٰ سمجھکر لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ کی کثرت کیجائے۔"

ایک دوسرے مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں :-

"یہ راہ ہمت و عزیمت کے بغیر طے نہیں ہوتی، اسی کا نام مجاہدہ ہے۔ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰہِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۔ اللہ کی راہ میں پورا پورا مجاہدہ کرو ۔، مجاہدہ یہی ہے کہ نفس کی باطل خواہشوں سے اعراض برت کر مقصد حق کو پورا کیا جائے۔ اور اسی پر دین و دنیا دونوں کی کامیابی منحصر ہے۔"

ایک مسترشد خصوصی کو ارقام فرماتے ہیں :-

"جی چاہنا تو تمنا کے معنوں میں ہے۔ یہ معتبر و مفید نہیں۔ بلکہ ضرورت

ہمت کی ہے ...... علاج صرف دُعاء و ہمت ہے۔ پست ہمتی تو دین و دنیا میں کہیں کار آمد نہیں۔" (تذکرہ سلیمان ص۶۲۰، ۶۲۱)

اسی ہمت وعزیمت کا درس دیتے ہوئے مختلف مکتوبات میں بار بار تلقین فرماتے ہیں :۔

"راستہ صاف ہے، ہمت شرط ہے۔ تمنا کافی نہیں۔ جب تک اسکے ساتھ عزیمت نہ ہو۔"

"اس توبہ کے ٹوٹنے کا علاج بجز ہمت اور عزیمت کچھ نہیں۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ خود توفیق عطا فرمائیں .... اصول حق پر استقامت کے ساتھ پہلے تکلف سے زبردستی قائم رہیئے پھر عادت ہوجائیگی۔ پھر اخلاص سے عبادت ہوجائیگی .... تدریج اور آہستگی سے کام شروع کیجئے۔ پہلے عقائد درست کیجئے، پھر عبادات کی تکمیل کیجئے، پھر اخلاق سنوارئیے، پھر آگے بڑھئے ...... گناہوں سے فی الفور کنارہ کشی اور استغفار ضروری ہے۔"

"اس (معمولات پر استقامت نہ ہونے) کا علاج (بھی) ہمت وعزیمت ہے۔ بہرحال جب چھوٹ جائے تو پھر مستعدی سے شروع کر دیا جائے، یوں ہی گرتے گرتے ایک دن لڑکا دوڑنے لگتا ہے۔ ہمت ہی اصل میں کامیابی کیلئے ضروری ہے۔ دین کے کاموں میں بھی اور دنیا کے کاموں میں بھی، .... اب آپ ایک روز تہیہ اور عزم کر کے وضو اچھی طرح کیجئے۔ اور خلوص سے دو رکعت نماز توبہ ادا کیجئے، اور اسکے بعد اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی پورے خضوع و خشوع سے مانگیں، اور عزیمت کریں۔

اور اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگیں۔ کہ اب کوئی عصیان کا کام نہ ہونے پائے
...... بچے چلنے میں گرتے ہیں۔ تو کیا گر کر پھر اٹھ نہیں جاتے اور
نہیں چلتے، اسی طرح بار بار توبہ کیجئے، اور گذشتہ پر ندامت اور مستقبل
کیلئے عزم کیجئے، کہ گناہ نہ ہو، ہو جائے تو پھر توبہ کیجئے پھر عزم کیجئے۔"

دوسری جگہ ایک صاحب کو ارقام فرماتے ہیں :۔

"جی ہاں ہمت کی کمزوری معمولات کی ساری بہار کھو دیتی ہے۔ اسکا
علاج آپ کے ہاتھوں میں ہے ...... (آپ کے) عزم و ہمت
میں تو ضعف معلوم نہیں ہوتا، ورنہ بڑے بڑے کام آپ نہ کر سکتے۔
بلکہ برائی سے بچنے میں آپ اپنی ہمت صرف نہیں کرتے اور ظاہری فوائد
پر نظر رکھتے ہیں۔ یہ عادت چھوڑ دیجئے۔"

دیگر طالبین کے نام خطوط میں عزم و ہمت کا درس مختلف انداز میں دیتے ہوئے
مختلف تحریروں میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

"اللہ تعالیٰ آپ کی اس (معمولات پر عمل کرنے کی) کوشش کو کامیاب فرمائے،
..... اگر یہ (دینی زندگی کی عدم تکمیل) آپ کے اختیاری امور میں سے ہے
تو علاج عزم صحیح ہے۔ اور اگر غیر اختیاری امور میں سے ہے۔ تو پھر
تفکر بیکار ہے۔"

"اس (دنیا کے ذہن پر غالب آنے) کا علاج توفیق الٰہی کے بعد
صرف عزیمت و ہمت ہے۔ آپ یہ تصور کریں۔ کہ دنیا فانی ہے۔ اور آخرت
باقی ہے۔ اور اس باقی کیلئے کام کرنا چاہیئے ...... کوشش جاری رکھئے

اور ہمت و عزیمت کو کام میں لائیے۔ انشاء اللہ تعالیٰ کامیابی ہوگی۔۔۔
۔۔۔ سستی و کاہلی اور عدمِ سعی کا نام عدم وسعت نہیں، ۔۔۔۔ تقصیرات پر استغفار کرکے آئندہ احتراز کا عزم کیجئے۔۔۔۔۔ آپ کسی وقت دو(۲) رکعت نفل باخلاص وخضوع پڑھ کر استغفار کیجئے۔ اور اسی وقت سے کام شروع کر دیجئے، اور پوری توبہ گذشتہ تقصیروں پر کرکے آگے کیلئے اطاعتِ کامل کا عزم کیجئے۔ اللہ تعالیٰ پورا فرمائینگے۔ مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۔۔۔۔۔ عمل کیلئے صرف ہمت و عزیمت کی ضرورت ہے۔ عمل اور تعویز کی نہیں۔"

"اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت دیں۔ انشاء اللہ آہستہ آہستہ سب کچھ ہو جائے گا۔ اصلاح کا سارا کام عزیمت پر موقوف ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم شامل حال رہے گا۔ اور اس سے سارا کام بن جائیگا۔"

ایک طالب نے عمل میں ارادہ کی کمزوری کی شکایت کی۔ اس کے جواب میں حضرت والاؒ نے ارقام فرمایا:۔

"پختہ ارادہ عزیمت سے پیدا ہوتا ہے، عزیمت کیجئے جس طرح اپ کو کہیں ریل میں جانا ہوتا ہے۔ تو کیسے جاتے ہیں۔ صرف تمنا سے مقصد حاصل نہیں ہوتا، عمل کیجئے، فرائض پہ عامل ہوں، اور نوافل کو بھی ادا کرنے کی کوشش کریں، تہجد کا اہتمام کریں۔"

ایک اور طالب کی اسی قسم کی شکایت پر تحریر فرمایا:۔

"سستی کا علاج تو بقول حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ چستی ہے، جب

تک دل میں وہ ہمت و عزیمت پیدا نہ کرینگے ۔ جو دنیاوی کاموں کے کرنے میں دیکھی جاتی ہے ۔ دین کے کام انجام نہیں پا سکتے ہیں ۔ بلاوجہ سستی کوئی شرعی عذر نہیں ۔ اس محرومی کی اہمیت کو محسوس کیجئے جو جماعت کی محرومی سے ہوتی ہے ۔"

ایک دوسرے گرامی نامہ میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

آپ کو جب اپنی اصلاح کی فکر لاحق ہوئی ہے تو انشاء اللہ تعالیٰ آپ کی حالت روز بروز درست ہوتی جائے گی ۔ وقت کی پابندی کے بغیر استقامت حاصل نہیں ہوتی ، اسلئے اللہ تعالیٰ نے نماز اور روزہ اور زکوٰۃ اور حج کے اوقات مقرر فرمائے ہیں ۔ پابندی کے بغیر مداومت اور استقامت نصیب نہیں ہوتی ، جسطرح (کہ) بیمار جب تک پابندی کے ساتھ دوا نہیں پیتا عموماً تندرست نہیں ہوتا ..... اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے آپ کو توفیق اور ہمت عطا کریں ، سب سے پہلے بندہ آمادگی ظاہر کرے ، تو اللہ تعالیٰ نصرت فرماتے ہیں ۔ بے ہاتھ اٹھائے تو لقمہ بھی منہ تک نہیں پہنچتا ، اپنی جیسی کوشش عزیمت کے ساتھ کیجئے ۔ پھر تائید الٰہی انشاء اللہ شامل حال ہوگی ۔ "

ایک اور مکتوب میں تحریر فرمایا :۔

" آپ کے حالات معلوم ہوئے ، امور خیر کی تعمیل اور گناہوں سے بچنا ، انسان کے اختیار میں ہیں ، بس آپ سب وسوسوں اور خیالات کو چھوڑ دیں ۔ اور دل سے طے کریں کہ آج سے اللہ تعالیٰ کے کسی چھوٹے بڑے

حکم کیخلاف نہیں کریں گے معمولات کی تکمیل کی کوشش میں لگے رہیئے وقت کی پابندی کے بغیر معمولات ناغہ ہوتے ہیں۔ اسلیئے وقت کی پابندی کی ضرورت ہے۔ بہر حال گذشتہ پر ندامت بھی توبہ کا ایک جزو ہے لیکن یہ ندامت کافی نہیں۔ ضرورت ہے کہ آئندہ ان لغزشوں سے بچنے کا عزم راسخ کیا جائے۔"

ایک صاحب نے حضرت شیخؒ کی خدمت میں لکھا۔ باتیں اور ارادے کرتا ہوں، لیکن عمل کم نصیب ہوتا ہے۔ دعاء فرمائیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نیک عمل کی دولت سے نوازیں۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواباً ارشاد فرمایا:۔

"عمل کی عزیمت اور پختہ ارادہ اور مستقل ہمت اور دعاء کے سوا کوئی تدبیر نہیں.... نفع کیلیئے مداومت شرط ہے۔ اگر کسی عذر شرعی سے ناغہ ہو جائے تو کچھ حرج نہیں، مگر اہتمام یہ ہو کہ ناغہ نہ ہونے پائے۔"

ان ارشادات سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی ہے۔ کہ اصلاح کیلیئے طالب کی ہمت و عزیمت بنیادی و نہایت اہم شرط ہے۔ بغیر اپنی ہمت و عزیمت کے شیخ پر نرا تکیہ کرنا حماقت اور طریق کی اصل روح سے ناواقفیت کی دلیل ہے شیخ راہ بتاتا ہے۔ طالب توفیق الٰہی اپنے عزم بالجزم اور قوی ہمت سے طریق کو طے کرتا ہے۔ اور اس راہ کے قطع کرنے میں حبِ شیخ اور مربی کا فیضان اسکا معین و مددگار ہوتا ہے۔ نری بیعت و محبت بغیر اصلاح کی عزیمت و ہمت کے اصلاحِ نفس کیلیئے کافی نہیں۔ اسلیئے طالبین کیلیئے ضروری ہے کہ حبِ شیخ کے ساتھ اپنی اصلاح کی ہمت و عزیمت کو اس راہ کی بنیادی اور ضروری چیز سمجھیں

جس کے بغیر اس راہ کا قصد کرنا فریب نفس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

ذرہ را تا بنود ہمتِ عالی حافظ
طالبِ چشمہ خورشید درخشاں نشود

اصول چہارگانہ

یہ بات واضح ہو چکی کہ حبِ شیخ اور اپنی اصلاح کی عزیمتِ راسخہ بیعت کی بنیادی شرائط ہیں۔ ان شرائط کے لوازم و نتائج ہیں۔ شیخ سے محبت جب اپنی اصلاح کے عزم راسخ اور مقاصدِ سلوک (یعنی رضائے حق، اتباع نبویؐ اور تزکیۂ باطنی وغیرہ) کے حصول کیلئے ہوگی۔ تو یہ محبت نری طبعی محبت نہیں ہوگی، بلکہ 'عقلی' اور 'شرعی' محبت ہوگی، جسکا نتیجہ اتباع احکام اور شیخ کی ہدایات پر عمل ہوگا۔ حضرت سید الملت رحمۃ اللہ علیہ ایک سالک کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"مرشد سے...... محبت طبعی کی بجائے محبت عقلی چاہیئے۔ جسکا نتیجہ اطاعت اور مشورہ پر عمل ہے۔ (تذکرہ سلیمان ص۵۶۶)

"..... محبت طبعی، بہیمی چیز ہے۔ جسکے آثار ظاہرہ حیوانات تک میں محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن محبتِ عقلی میں کمالِ سادگی ہوتی ہے۔ اور اسکا منشا طلبِ رضائے دوست اور اسکے حکم کی تعمیل ہے (تذکرۂ سلیمانی ص۶۲۲)

شیخ و مربی کی اس حبِ عقلی کا نتیجہ 'شیخ' کی شخصیت پر 'اعتقاد' اور اسکے ارشاد و رہنمائی، بصیرتِ فن و احکام اور طرز تربیت پر 'اعتماد' اور اسکی تعلیمات و ہدایات کے 'انقیاد' کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ گویا حبِ عقلی کا لازمہ اعتقاد و اعتماد و انقیادِ شیخ

ہے ۔ اور یہی سہ گانہ جذبہ اعتقاد و اعتماد و انقیاد شیخ و مرید کے درمیان ارتباط کی سنہری کڑی ' وحبل المتین ' ہے ۔ باہمی افادہ و استفادہ اسی رابطہ کے ضعف و قوت کے بقدر ہوگا۔

مزید برآں کیونکہ شیخ و مرید کا تعلق معالج و مریض کا ہوتا ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ مرید شیخ کے ارشادات پر عمل اور انقیاد ظاہری و باطنی کے نتائج ، آثار، ثمرات اور اپنے دیگر اعمال و کوائف سے شیخ کو گاہے گاہے آگاہ کرتا رہے اور مربّی کو اپنی صحتِ روحانی و قلبی اور باطنی احوال و تغیرات و کیفیات سے مطلع کرتا رہے تاکہ شیخ اسکی صحیح حالت کو معلوم کر کے ایک حاذق طبیب ، کیطرح اسکی امراضِ روحانی کی تشخیص و علاج اور اس کی اصلاح و تربیت کا کام بخوبی انجام دے سکے ۔ مرید کے شیخ کے سامنے اپنے احوال و امراض کو پیش کرنے کو ہم ' اطلاع کی ' اصطلاح سے ادا کر سکتے ہیں۔ گویا شیخ و مرید کے اس رابطہ روحانی کا مدار ان چار چیزوں پر ہے ۔ (۱) اعتقاد ۔ (۲) اعتماد (۳) انقیاد (یا اتباع) (۴) اطلاع ۔ شیخ الکل حضرت حکیم الامۃ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان چار باتوں کو ' اُصول چہارگانہ ' کے نام سے یاد کیا ہے مریدِ صادق جب ان اصول چہارگانہ کی پیروی کرتا ہے ۔ تو توفیق الٰہی اسکی قدم قدم پر رہنمائی فرماتی ہے ۔ اور حکمت ربّانی شیخ کی توجہ و برکت اور طالب کی استعداد و مجاہدہ کے بقدر جلد یا بدیر اسے مقصد تک پہنچا دیتی ہے ۔

حضرت سیّدی قدس سرہٗ ارقام فرماتے ہیں :۔

" اِس سلسلہ میں چار باتیں بمنزلہ اصول ہیں ۔ اعتقاد ، اعتماد ، اطلاع و اتباع ۔ یہاں ' اطلاع ' سے مراد مکاتبت اور اتباع سے احکام شیخ کی پیروی ہے ، جسقدر مکاتبت کا سلسلہ رہے گا انشاءاللہ نافع ہوگا ،

جو حال اس راہ میں ہو۔ اس سے اطلاع دیں۔ اس راہ میں ضرور ہے کہ مربّی کے ہاتھ میں اپنے کو اسطرح دیدیں جس طرح مریض طبیب کے ہاتھ میں اپنے کو دے دیتا ہے۔ مریض خود اپنے لئے نسخہ نہیں لکھتا اور نہ قرابادین دیکھ کر دوائیں چھانتا ہے۔"

شیخ و مرید کی مثال معالج و مریض کی ہے۔ طالبین اپنے امراض لکھتے ہیں۔ اور شیخ اسکا علاج بتاتا ہے۔ حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ ایک طالب کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"......اپنی کمیوں اور نقائص کے متعلق مجمل بیان علاج کیلئے کافی نہیں آپ اپنے نفس کے متعلق غور کیجئے اور متعین کیجئے کہ وہ نقائص کیا ہیں۔ تاکہ ان کا علاج کیا جا سکے، جس طرح طبیب سے صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ میں بیمار ہوں، جب تک یہ نہ بتائیے کہ کیا کیا بیماریاں اور تکلیفیں ہیں۔ کھانسی ہے، درد سر ہے، ضعف معدہ ہے، بے خوابی ہے! ......

اپنے عیوب و نقائص کے جاننے کا طریقہ یہ ہے ع

یک زمانے در کمینِ خویش باش

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ"

ایک طالب کو لکھتے ہیں:۔

"قبلہ ایک ہی ہے۔ اور وہ کتاب و سنت کی تعلیم اور اس پر عمل کرنا ہے۔ شیخ کا کام اس پر عمل کرنے کی صحیح اور آسان طریق کی تعلیم ہے..... تعلیمات شیخ میں اتباع نبوتؐ ہے۔"

غرض بیعت کے حقیقی ثمرات و فوائد کیلئے ضروری ہے کہ شرائط بیعت۔ یعنی شیخ کی

حبِ عقلی، اپنی اصلاح کی عزیمت راسخہ اور اصول پنجگانہ کی پیروی ہو۔ ورنہ بیعت ایک رسم بن کر رہ جاتی ہے۔ جسکا مقصود فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ بسا اوقات نری بیعت سلسلہ کی بدنامی کا سبب بن جاتی ہے۔

طریقہ بیعت

بیعت شیخ و مرید کے درمیان ایک معاہدہ ہے۔ اور اس بات کا اقرار ہے کہ شیخ اپنے علم و بصیرت و دیانت کے مطابق مرید کی رہنمائی، تربیت اور مشورہ میں کمی نہ کرے گا۔ اور مرید شیخ کی تعلیمات پر عمل کرنے میں کوتاہی نہ کرے گا۔ اور خلاف شرع اور غیر دینی زندگی کو چھوڑ کر آئندہ اللہ تعالیٰ کی رضاء کی نیت سے حضور پاک حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری و باطنی احکام و اسوہ کا اتباع و پیروی کریگا۔ گویا گذشتہ غلط زندگی پر ندامت اور آئندہ نیکی و اصلاح کا عزم بالجزم بیعت کا مدعا ہے۔ اور یہی 'توبہ' کی حقیقتِ معنوی بھی ہے۔ گویا بیعت اس معنیٰ میں توبہ کی ایک صورت اور ظاہری میثاق ہے۔ اسلئے حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیعت سے پیشتر بسا اوقات سچی توبہ کی تلقین فرما کر الفاظِ بیعت ارشاد فرماتے تھے، چنانچہ راولپنڈی کے ایک سفر میں ایک صاحب بندہ کے سامنے بیعت ہوتے حضرت والاؒ نے پہلے انہیں توبہ پڑھنے اور سچے دل سے تمام گناہوں سے توبہ کرنے کی تلقین فرمائی، پھر بیعت فرمایا، اس بات (بیعت سے پیشتر توبہ کرانے) کی شہادت حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے بعض ان مکتوبات سے بھی ملتی ہے۔ جو ان حضرات کو

لکھے گئے ہیں، جن سے غائبانہ بیعت ہوئی ہے۔ ان مکتوبات کی متعلقہ عبارات سے کیونکہ بیعت، طریقہ بیعت، و الفاظِ بیعت پر روشنی پڑتی ہے۔ اسلئے نقل کرتا ہوں۔

ایک خادم کو تحریر فرمایا:۔

"میں بیعت میں آپ کو لینے کو تیار ہوں، اللہ تعالیٰ اس سے مجھے اور آپ کو فائدہ پہنچائے،

آپ کو جب یہ خط ملے تو بعد نماز مغرب، یا جس وقت آپ کو طمانیت ہو، اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز تنہائی میں نماز توبہ کی نیت سے پڑھیں، اور پھر اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہیں۔ اور اسکے بعد یہ کلمات اپنی زبان سے ادا کریں، اور پھر مجھے اپنا پورا حال لکھیں کہ کیا ہوا، اور کیسے ہوا۔

کلمات یہ ہیں:۔

" اے اللہ میں تیری طلب میں حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانویؒ کا ہاتھ اونکے مجاز سلیمان ندوی کے واسطے سے پکڑتا ہوں، اور اپنے کو سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں ان کے ذریعہ سے داخل کرتا ہوں۔ اے پاک پروردگار مجھے اس راہ پر قائم رکھ اور صراطِ مستقیم پر لے چل۔ اور بھٹکنے نہ دے۔ اے اللہ مجھے اپنے احکام کا تابع بنا اور اپنے رسولؐ کا متبع کر، اور اپنی محبت اور خشیت میرے دل میں ڈال اور اے پروردگار اس سلسلے کی برکات سے مجھکو مستفید فرما۔"

اول و آخر نماز والا درود پڑھکر ختم کریں، سلسلہ چشتیہ صابریہ کا شجرہ

مناجات مقبول میں موجود ہے۔ درود اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ
اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ اور اَلْحَمْدُ پڑھکر اس کا ثواب حضرت مولانا اشرف علیؒ
اور بزرگان سلسلہ کو بخشیں۔"

اِن ہدایات کی تعمیل کے بعد طالب نے وقتِ بیعت کے احوال کی حضرۃ الشیخؒ کو اطلاع دی تو تحریر فرمایا :-

"آپ نے وقت بیعت کا حال لکھا ہے، وہ محمود ہے۔ تفصیل آگے آتی ہے۔ میں نے آپ کو سلسلہ چشتیہ صابریہ میں حضرت مرشدی مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ رحمہ اللہ تعالیٰ کے واسطے سے داخل کر لیا، اور بیعت کر لیا، اللہ تعالیٰ اِس سلسلہ کو ہم دونوں کیلئے فائدہ مند بنائیں۔

۱:- آپ نے خدا کا ہاتھ محسوس فرمایا، بیعت کی یہی حقیقت مثالی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے :-

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ الآیۃ [۱]

۲:- چشمہ جاری عمل خیر سے عبارت ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔ ذٰلِکَ عَمَلُہٗ [۲]

۳:- قدیم صوفیہ میں یہی رواج تھا کہ مرید ہوتے وقت شیخ اپنی کلاہ مرید کو عنایت کرتے تھے [۳]

---

۱ :- حسب ارشاد بیعت کے وقت کی حالت لکھتے ہوئے طالب مذکور نے لکھا تھا: "جس وقت یہ الفاظ پڑھے۔ "اے اللہ میں تیری طلب میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ہاتھ انکے مجاز سلیمان ندوی کے واسطے سے پکڑتا ہوں" تو ایسا محسوس ہوا۔ گویا اس فقیر کے یہ ہاتھ اللہ سبحانہ وتقدس کے ہاتھ پکڑ رہے ہیں اور ذات عالی کے غیر مرئی ہاتھ کو چھو رہے ہیں۔ (سُبْحَانَ اللّٰهِ تَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ وَلَهُ الْکِبْرِیَاءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)

۲ :- طالب نے لکھا تھا: "اس کے بعد ایسا محسوس ہوا گویا قلب عاصی کا تعلق ایک بہتے چشمہ سے کر دیا ہے"

۳ :- طالب نے تحریر کیا تھا: "اسکے بعد دیکھتا ہوں کہ میری پرانی ٹوپی اتار کر ایک دوسرے شخص کی ٹوپی میرے سر پر رکھ دی گئی ہے اور تعریف کیجا رہی ہے کہ یہ ٹوپی تمہیں زیادہ اچھی معلوم ہو رہی ہے۔" نوٹ ۱، ۲، ۳ سب غائبانہ بیعت کیوقت کے حالات ہیں۔ م۔ ا

ایک صاحبِ علم طالب کی درخواستِ بیعت پر ارقام فرمایا۔

"بسم اللہ وعلی برکۃ اللہ۔ یہ فقیر ہیچمدان اپنی بے بضاعتی کے باوجود حسبِ استطاعت خدمت کو حاضر ہے۔

آپ اس خط کو پاکر کسی اطمینان خاطر کے وقت اچھی طرح وضو کر کے بخلوص دوگانہ نفل توبہ ادا کریں۔ اور اسکے بعد استغفر اللہ من کل ذنب واتوب الیہ ستّو دفعہ پڑھکر درگاہِ باری تعالیٰ میں جملہ گناہوں اور تقصیرات سے توبہ کریں۔ اور اپنی اس عزیمت اور توبہ پر قائم رہیں، کہ آج سے میری نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ' اور اس کے بعد الحمد' اور قل ھو اللہ احد الخ ۳ بار اول و آخر درود پاک کیساتھ بزرگانِ چشتیہ صابریہ پر علی العموم اور خصوصیت کے ساتھ نام لے کر حضرت مولانا شاہ امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ اور حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب قدس سرہٗ کو اسکا ثواب بخشیں، اور زبان سے عہد کریں، کہ آج سے میں اپنے شیخ کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر صداقت سے بغیر تعلل کے عمل کروں گا۔ پھر یہ آیت کریمہ پڑھیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ، یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا"

اس کے بعد مجھے اطلاع دیں، اور معمولات شروع کریں، نوافل اوابین و اشراق و تہجد پر استقامت کریں، اور اپنے رذائل پر نظر رکھیں ، اور

ایک ایک کی اصلاح کی کوشش اسطرح کریں کہ پہلے اس کی حقیقت سمجھیں، پھر اسکے ازالہ یا امالہ کی تدبیر دریافت کریں، واللہ یوفقکم وبیص کم" ـــ الفقیر الی اللہ سلیمان، احدی مسترشدی حضرت شاہ مولانا اشرف علی قدس سرہٗ طالب مذکور نے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے اِس والا نامہ کے مطابق بیعت کر کے حضرت والاؒ کو خط لکھا اور داخل سلسلہ کرنے کا شکریہ ادا کیا، حضرت والاؒ نے ان کے تفصیلی خط میں جواباً ارقام فرمایا :۔

"یہ میرے لئے موجب سعادت ہے۔ کہ آپ کو اس ذرۂ بے مقدار کے ذریعہ اس آفتاب رشد و ہدایت کے ساتھ نسبت حاصل ہوئی،

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ　　ذرہ آفتاب تابانیم

میرا یہ احسان نہیں جسکی شکر گذاری کریں...... شکر اللہ تعالیٰ کا ادا فرمائیں یہ حقیر بھی اور آپ بھی، کسی بندہ کے شکر کی حاجت نہیں...... آپکو بیعت میں داخل کر لیا گیا، ہمارے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے بقول یہ بیعت طرفین سے معاہدہ ہے۔ مفید کی طرف سے اس بات کا کہ وہ تعلیم اور شفقت میں اپنے جانتے کمی نہیں کرے گا۔ اور مستفید کی طرف سے اس بات کی کہ وہ اتباع میں حسب استطاعت کمی نہ کریگا۔" درسالہ بنیات صفر ۱۳۸۴ھ ص۱۱۱ تا ۱۱۹

ایک صاحب جنہوں نے مع اپنی دو رشتہ دار عورتوں کے حضرت الشیخ قدس سرہٗ سے غائبانہ بیعت کی درخواست کی تھی اور حضرت والاؒ نے تینوں کی بیعت قبول فرمالی تھی، تحریر فرمایا :۔

"آپ اور جن صاحبوں نے بیعت کی۔ ان سب کو چاہیئے کہ میرے

اس خط کے پڑھنے کے بعد اسی روز یا ایک آدھ روز کے بعد کسی جمعیت خاطر کے وقت اچھی طرح وضو نیت کیساتھ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم کہکر کریں اور دو رکعت نماز کمالِ خشوع و خضوع کیساتھ نماز توبہ کی نیت سے پڑھیں۔ پہلی میں قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ اور دوسری رکعت میں قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ پڑھا جائے، اور اسکے بعد کمالِ استقامت کیساتھ گذشتہ معاصی سے بدرگاہِ الٰہی پوری انابت، عاجزی، مسکینی سے توبہ کیجائے، اور آئندہ ان معاصی سے بچنے کے اہتمام کا عزم صمیم کیا جائے، معاصی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جنکی تلافی نہیں ہوسکتی۔ جیسے کفر و شرک کا صدور ہوا ہو، کسی سے زنا کا صدور ہوا ہو، تو اسکی توبہ اپنے قصور کا اعتراف بدرگاہِ باری اور ایمان کی تجدید ہے۔ اور اعمال ناقابلِ تلافی کی توبہ محض اعتراف اور عفوِ تقصیر کی طلب ہے۔ اور ندامت اور پشیمانی کا اظہار زبان سے اور دل سے اور آئندہ سے احتراز کا وعدہ،

دوسرے وہ گناہ جن کی تلافی ہوسکتی ہے۔ جیسے نمازیں قضا ہوں، یا روزے چھوٹے ہوں، یا زکواۃ نہ دی ہو، یا کسی بندہ کا حق باقی ہو، یا قرض باقی ہو، زمین غصب کی ہو، چوری کی ہو، تو اسکی توبہ یہ ہے۔ کہ عفوِ تقصیر کی طلب کے ساتھ انکی تلافی کرے، نماز اور روزہ قضا کو ادا کرے، اسی طرح بندہ کے سب باقی حق ادا کرے یا اس سے معاف کرائے، اگر وہ مرگیا ہو، تو اسکے وارثوں کو ادا کردے یا معاف کرائے اگر وارثوں کا پتہ نہ چلے تو اسکے نام سے خیرات کردے اور اسکے حق میں

دعائے مغفرت کرے۔"

مندرجۂ بالا اقتباسات سے غائبانہ طریقۂ بیعت کی وضاحت ہوجاتی ہے، نیز یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے۔ کہ بیعت توبہ اور اپنی اصلاح کے عزم بالجزم کا دوسرا نام ہے۔

حضرت والا قدس سرہٗ ہر شخص کی استعداد کی رعایت فرماتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عورتوں کیلئے الفاظِ بیعت بھی آسان تحریر فرماتے تھے، چنانچہ ایک طالبہ کو لکھا :۔

"بیعت کی اہمیت اسی قدر ہے کہ اس سے طبائع میں مزید مستعدی پیدا ہوجاتی ہے، .... آپ حسبِ ذیل عبارت اپنے قلم سے لکھکر بھیج دیجئے'

'میں آپ کی وساطت سے سلسلہ اشرفیہ امدادیہ صابریہ چشتیہ میں داخل ہوتی ہوں"

جب موصوفہ نے یہ تحریر خدمت شیخ میں بھیج دی۔ تو ارقام فرمایا :۔

"میں نے سلسلہ اشرفیہ امدادیہ صابریہ چشتیہ میں آپ کی بیعت قبول کی، اللہ تعالیٰ اسکے برکات سے آپ کو مالامال کریں۔"

حضرت الشیخ قدس سرہٗ کا بالمشافہ بیعت کا طریقہ یہ تھا کہ طالب قبلہ رو بیٹھ جاتا تھا، حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ اسکے روبرو تشریف رکھ کر اپنا ہاتھ آگے بڑھادیتے تھے مرید با اخلاص اپنے دونوں ہاتھوں سے حضرت والاؒ کے دست مبارک پکڑلیتا تھا۔ حضرت والاؒ پہلے قرآنؑ کی چند آیات متعلقہ بیعت خطبہ کے طور پر پڑھتے تھے۔ اس کے بعد طالب کو کلمۂ توحید (بعض اوقات کلمہ شہادت بھی) اور ایمان مفصل و ایمان مجمل کی تلقین اسطرح فرماتے تھے، کہ خود پڑھتے جاتے تھے اور طالب انہیں الفاظ کو دہراتا جاتا تھا۔ پھر فرائض و واجبات کی پابندی، سنت کے اہتمام، معاصی و بدعات سے احتراز

اور شیخ کے تحتِ شرع احکام کی کامل پیروی کا عہد لیکر مختلف اشخاص کو انکی استعداد ومناسبت کے مطابق مختلف سلاسل کے انتساب کے ساتھ سلسلہ میں داخل فرماکر بیعت فرمالیتے تھے، (مثلاً کسی شخص کو محض چشتیہ صابریہ میں داخل فرمالیتے۔ کسی کو چاروں سلسلوں میں بیک وقت قبول فرمالیتے)۔

بیعت کے بعد انتہائی تضرع وزاری، الحاح وعاجزی سے بارگاہ ربانی میں طالب کی اصلاح ظاہری وباطنی کیلئے دعا مانگتے اور طالب کو مربی حقیقی کے حوالہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے:۔

"کہ اے بارالہا! تو ہی سنبھال اور جانبین کو اس عہد کے نبھانے کی توفیق نصیب فرما۔"

غرض دعا پر یہ عمل ختم ہوتا۔

شیخ کی حیثیت محض آلہ و وسیلہ کی ہے

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کو اپنے شیخ عالی مقام حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ سے جو محبت و عقیدت تھی، اس کا کچھ اندازہ گذشتہ اوراق سے ہو سکتا ہے۔ بقول مخدومی حضرت مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی :۔

"حکیم الامت و امام طریقت حضرت تھانویؒ کا آخری زمانہ تھا۔ کہ ان سے عقیدت پیدا ہوئی، اور والہانہ حد تک پہنچ گئی، بیعت ہوئے اور مرشد کے اندر ایسے جذب ہوئے کہ ایک لفظ فنا فی الشیخ جو مدت سے سننے میں آرہا تھا، اسکا عملی نمونہ پیش کر دیا (صدق جدید ۱۹ دسمبر ۱۹۵۲ء)

تاہم شیخ کی اس محبت و عقیدت و اسمیں فنائیت کے باوجود حضرت سیدی نور اللہ مرقدہ ایک محقق صوفی کی حیثیت سے شیخ کو محض ایک آلہ اور ذریعہ سمجھتے تھے۔ اور اللہ تبارک تعالیٰ کو معطی حقیقی گردانتے تھے، کہ شیخ کی حیثیت حدیثِ نبوی أنا قاسم و اللہ معطی سے اسی قدر معلوم ہوتی ہے۔ اس بنا پر ہمیشہ تلقین یہی تھی، کہ نظر صرف اللہ تعالیٰ پر ہونی چاہیئے۔ چنانچہ ایک خادم کو اس تحریر کا کہ" ہر وقت نظر کرم کا طالب ہوں" ان الفاظ میں جواب دیا :۔

"نظر ہر وقت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر چاہیئے کہ ان میں تلبس کیا ہے جو کسی انسان کو دے سکے ...... اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے خود دیتے ہیں۔ شیخ صرف واسطہ ہوتا ہے۔ جیسے سیرابی پانی سے ہوتی ہے۔ مگر پانی کسی ظرف سے پیا جاتا ہے۔ تو ظرف کو بجز واسطہ کے کوئی دخل نہیں ہوتا۔ معطی اللہ تعالیٰ ہے۔"

ایک مسترشد خاص نے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی شعر میں تعریف کی، حضرت شیخ قدس سرہٗ نے لکھا :۔

"یہ آثار محبت ہیں .... میری نسبت اس حد تک ہے۔ جس حد تک ایک متوسط کی ایک دوست کا خط دوسرے دوست تک پہنچانے کی ہے (تذکرہ ص۱۳۹) - ان کو مختلف مکتوبات میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"جو کچھ ہوا، اور ہوتا ہے وہ سب حق تعالیٰ کا فیض ہے۔ بندہ مامور ہے" (تذکرہ ص۵۶۲)

"بہر حال آپ کو اس ہیچمدان کے خطوط سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ وہ سب اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں۔ جو آپ کو آپ کے حسن نیت اور اخلاص پر عطا ہوتے ہیں۔ اللّٰھم زد فزد (تذکرہ ص۳۹۶)

شیخ کے حقوق اور انکی ادائیگی

ھمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک شیخ کے حقوق کی ادائیگی کے معنٰی یہ تھے کہ اُسکی جو ہدایات شرع کے مطابق ہوں، انکی بجا آوری میں کوتاہی نہ برتی جائے۔ ایک گرامی نامہ میں ارقام فرماتے ہیں۔

"اس (یعنی شیخ) کے حقوق کی ادائیگی یہی ہے۔ کہ اس کے ہدایات کو جو تحتِ شرع ہوں بجالانے کی کوشش میں لگا رہے۔"

ایک طالب کو لکھتے ہیں:۔

"بتائے ہوئے طریقے تو بے وجہ بلا مجبوری نہ چھوڑیں۔"

ایک خادم کو تحریر فرمایا:۔

"میرا کوئی حق نہیں جو آپ نے تلف کیا ہو، اس کی فکر نکریں۔"

مراد یہ ہے۔ کہ اگر سالک شیخ کی ہدایات و تعلیمات کی کامل پابندی ہمت و عزیمت سے کرتا رہے۔ تو یہی شیخ کے حقوق کی ادائیگی ہے۔ دگر رسمی امور کی فکر میں مبتلا اور رواجی آداب و تعلقات کے درپے ہونا مفید نہیں۔ اصل مقصد کام ہے نہ کہ عامیانہ قیود و رسوم اور ظاہری تکلفات کی پابندی،

تصوّر شیخ

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ تکلف کے ساتھ تصور شیخ کو منع فرماتے تھے۔ اور اگر خود بخود آجائے تو اسے برا نہیں سمجھتے تھے۔ ایک طالب کو تحریر فرماتے ہیں :۔

"تصور شیخ پر ہمارے ہاں بِنا نہیں، اگر از خود بلا تکلف کبھی تصور آجائے تو حرج بھی نہیں کہ بالقصد اس کا تصور کرنا اور اسکو قائم رکھنے کی کوشش کرنا درست بھی نہیں۔ کیونکہ اس سے شیخ کے حضور کے غلط عقیدہ کی رہبری ہوتی ہے، جو بڑھ کر شرک تک پہنچ جاتا ہے۔ میرا تصور بغیر تکلف کے آجائے تو کوئی حرج نہیں، کہ یہ بہ تقاضائے محبت ہے۔ مگر تکلف کے ساتھ تصور میں لانے کی کوشش نہ کریں۔"

ایک دوسرے طالب کو جن پر حضرت شیخ قدس سرہٗ کا دھیان مستولی ہو گیا تھا ارقام فرمایا :۔

"یہ صرف آپ کی محبت کا کرشمہ ہے۔ اپنے اختیار و ارادہ سے تصور جمانا غلط ہے۔ اگر از خود ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ یہ ایک حال ہے (جسکا) ذکر میرے ایک شعر میں بھی ہے ؎

سجدہ طرف کعبہ ہے دل تیری طرف ہے
اب قبلہ بھی اے قبلہ نما بھول گیا ہوں

ایک ارادتمند کو لکھتے ہیں :-

"اس فقیر کو یاد کرنا محبت فی اللہ کا ثمرہ ہے۔ زادنا اللہ تعالیٰ حبًا فیہ، اپنا ایک شعر یاد آیا لکھتا ہوں ؎

ہر سمت نظر آتے ہیں، ہر وقت وہ مجھکو
دوری مسافت کا گلہ بھول گیا ہوں

غرض اگر شیخ کا تصور بلا قصد و تکلف آجائے، اور غلبہ حال کی بنا پر شیخ کا دھیان چھا جائے تو حرج نہیں، لیکن احتیاط اسی میں ہے۔ کہ خود تکلفاً تصور نہ جمائے،

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں :-

"تصور شیخ بلا قصد ہو تو حرج نہیں۔"

توجّہ شیخ

توجہ سے (اصطلاحاً) مراد شیخ کا تصرّف و تاثیر ہے۔ کہ شیخ اپنے مریدین کی اصلاح باطنی کیلئے اپنی ہمت و دعاء کو استعمال کرتا ہے۔ اور طالبین کی طرف پورے فراغِ قلب سے متوجہ ہوکر ان کی قلبی حالت میں باذن اللہ تصرّف کرتا ہے۔ اس توجہ سے وقتی طور پر سالک کو فائدہ پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اسکا اثر دائمی نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے یہ توجہ عارضی طور پر مفید رہتی ہے۔ اسمیں مصالح بھی ہیں اور بعض امراض باطنی کیلئے توجہ گاہے زود اثر بھی ہوتی ہے۔ لیکن بعض مفاسد کی وجہ سے ہمارے طریق میں اسکا عمومی چلن اور اشتغال نہیں ہے۔ شیخ کیلئے اسکا بڑا نقصان یہ ہے کہ توجہ کے دوران میں مخلوق (یعنی جسکی طرف توجہ کیجاتی ہے) کی طرف کاملاً متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ اور غیرتِ توحید اسے نہیں چاہتی۔ منفعل یعنی جس پر توجہ کیجاتی ہے۔ وہ شیخ کی توجہ پر تکیہ کرلیتا ہے۔ اور ذاتی محنت و کوشش سے بے پرواہ ہوجاتا ہے۔ اسلئے "سلوک سلیمانی" میں توجہ پر مدار نہیں ہے۔ بلکہ مسنون طرق وعظ و نصیحت اور دعاء سے "توجہ" کا کام لیا جاتا ہے۔ اور طالب کے عزم و ہمت کو مہمیز کیجاتی ہے۔ ایک خادم نے حضرت سیدی قدس سرہ کو لکھا :-

"سننے میں آتا ہے۔ کہ کئی بار اللہ تعالیٰ کے بندوں نے اپنی دُعا و ہمت سے نا اہلوں کو کام کا بنا دیا۔ اگر یہ حقیقت ہے تو یہ نابکار نگاہ کرم کا سب سے زیادہ محتاج ہے۔" حضرت الشیخ نے کیا پُر حکمت جواب دیا :۔

"ہاں بھائی یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت و رحمت خصوصی ہے۔ جو وہ اپنی مشیت سے کسی پر کرتے ہیں۔ ورنہ سنت اللہ جو جاری ہے۔ ہم کو تو اس کے راستے سے ان تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور اس میں لگے رہنا چاہیئے ؎

ملنے نہ ملنے کا وہ مختار آپ ہے پر تجھکو چاہیئے کہ لگا دو لگی رہے"

لیکن اسکا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس سلسلہ میں تاثیرِ باطنی یا برکتِ شیخ اور فیضِ صحبت کی کمی ہے جاننے والے جانتے ہیں۔ کہ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایسے صاحبِ برکت بزرگ تھے جنکی مثال کم ہی ہوگی۔ آپ کے متعلقین شاہد ہیں۔ کہ حضرتؒ نے مریدین سے زیادہ مجاہدات نہیں کرائے تھے۔ لیکن تھوڑی سی محنت پر وہ اثرات مرتب ہو جاتے تھے۔ جسکا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ حضرت شیخ قدس سرہٗ کسی اخبار کا مطالعہ فرما رہے تھے۔ راقم قلبِ اقدس کیطرف متوجہ تھا۔ کہ ناگاہ دل میں یہ خطرہ گذرا۔ کاش حضرت کچھ ارشاد فرماتے، اس خطرہ کے گذرتے ہی مسکرا کر فرمایا۔ "لوگ کہتے ہیں کچھ کہیئے اور اکبر کہتے ہیں؟

تاثیر دکھا تقریر نہ کر"

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں گو معروف توجہ کا دستور و اہتمام نہ تھا۔ لیکن صحبت کے ضمن میں ایک واقعہ بیان کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا، حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ

کی خدمت میں میری آخری حاضری ۲، جولائی ۱۹۵۳ء سے ۱۷، اگست ۱۹۵۳ء تک رہی، میرا قیام دوسری جگہ تھا۔ مگر روزانہ حاضری ہوتی تھی۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی طبیعت عموماً علیل وکمزور رہتی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ حضرتؒ کو وقتِ موعود کے قریب آنے کا گمان ہو چلا تھا۔ اسلئے اشارے تصریح کی حد تک واضح تھے۔ چنانچہ بارہا ارشاد فرمایا کہ:۔

"اپنے آخری ایام میں شبلی مرحوم کہا کرتے تھے" ع۔ چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک۔

جس سے حضرت والا کی اپنی ذات مراد ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک حکیم صاحب نے نبض دیکھکر کہا۔ "تیرہ بار نبض چل کر ٹھہر جاتی ہے۔" فرمایا۔ "اتنی عمر چلتی رہی ہے، آخر آرام بھی کریگی۔ بہر حال حضرت سیدی قدس سرہٗ کو گویا یقین تھا کہ یہ اس کم نصیب کی آخری حاضری ہے اسلئے لطف و کرم کا دریا جوش پر تھا۔ راقم نے عرض بھی کیا تھا۔

اشرف فقیر است وگدا افتادہ در شہر شما ، شاید کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری اے

میری واپسی کے قریب پوچھا۔ "کب روانگی ہے۔" جب دو دن رہ گئے۔ تو ایک دن تنہائی میں اس فقیر کے حال پر توجہ خاص فرمائی، تھم تھم کر ملفوظات سے سعادت بخشتے رہے۔ اس دوران میں راقم کو توجہ باطنی کا ایسا شدید احساس ہوا کہ معلوم ہوتا تھا کہ دل بیٹھ جائے گا۔ اس تاثیر کی یاد و اثر آج تک تازہ ہے ؎

خدا جانے مجھے کیا دے کے ساقی نے پلایا ہے ، وہ کب کا جا چکا پھر بھی نظر آتا ہے محفل میں

مکاتیب

کہا جا چکا کہ طریق کی بنا محبت ہے۔ اور غیاب میں اسکا بدل محبت شیخ و مکاتبت ہے،
حضرت سیدی (فداہ روحی) نور اللہ مرقدہٗ لکھتے ہیں:-

"مجالست نہ ہو۔ تو مکاتبت اسکی قائم مقامی کر سکتی ہے، جو استطاعت ہو، اس میں تو کمی نہ کیجائے۔"

ایک دوسرے خط میں ارقام فرماتے ہیں:-

"تاثیر و تاثر کی صحیح بنا محبت ہے۔ ہمارے سلسلے میں اسکی بڑی اہمیت ہے۔ اور اسکا قائم مقام مکاتبت ہے۔"

سلوکِ سلیمانیؒ اور سلسلہ اشرفیہؒ میں مکاتبت کی اہمیت ایک اور وجہ سے بھی ہے۔ شیخ و مرید کی مثال معالج و مریض کی ہے، بسا اوقات متعدد وجوہ کی بنا پر مریض اپنا حال کما حقہٗ شیخ کے سامنے زبانی بیان کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اپنی حالت کو لکھ کر پیش کر دینا نسبتاً آسان ہے۔ شیخ اس 'احوال نامہ' اور 'امراض' کا جائزہ لیکر تشخیص کے بعد نسخہ تجویز کرتا ہے، اور اسے قلمبند کر کے مرید کے حوالے کر دیتا ہے۔ مرید صادق کیلئے یہ نسخہ باطنی اور علاج روحانی صحت کا بفضلہ تعالیٰ سامان بن جاتا ہے۔ اس نسخہ کے

استعمال کے اثرات و نتائج سے معالج روحانی کو مطلع کرنا بھی ضروری ہے، تاکہ علاج باقاعدہ جاری رہ سکے، اسطرح یہ باہمی خط و کتابت و علاج معالجہ کا سلسلہ مرید کی شفائے کامل تک جاری رہے گا۔ اسے اصول چہارگانہ (جنکا ذکر گذر چکا) کے مطابق 'اطلاع' کہتے ہیں۔ غرض مرید کی طرف سے باقاعدہ اپنا احوالنامہ پیش کرنا اور شیخ کا اسکا تحریراً علاج تجویز کرنا "مکاتبت" ہے۔ جسکی اہمیت اور ضرورت مسلّم ہے۔ کہ اسکے بغیر رذائل کی بیخکنی اور فضائل سے آراستگی طبعاً مشکل ہے۔ ایک ایک رذیلہ کی حقیقت، اسکی پہچان اور اسکا علاج، اپنی ایک ایک حالت و کیفیت کا حسن و قبح جاننا، مکائدِ نفس سے آگہی اور بچاؤ غرض سلوک کی نازک راہ کا مرحلہ شیخ کی رہنمائی و ارشاد کا محتاج ہے۔ جو متواتر 'مکاتبت' ہی سے ممکن ہے۔ اسلئے 'مکاتبت' اصلاح کیلئے بہت ضروری ہے۔

سالکین کی تربیت بڑا دقیق فن ہے۔ حضرت سید الملۃ نور اللہ مرقدہ، کو اللہ تعالیٰ نے اس فن میں اتنی مہارت، بصیرت، دقت نظر، تاثیر اور برکت عطا فرمائی تھی، کہ سالک نے اپنا کوئی حال لکھا اور حضرت الشیخؒ کی جوابی تحریر نے اس حال کو بہتر حال، سے بدل دیا۔ ؎

نسخۂ اکسیر و دارُوئے شفا تیرے ہاتھوں کا لکھا مکتوب ہے۔

اس تاثیر پر ایک طالب نے لکھا:۔ "حضرت والا کے خطوط بندہ کے حق میں شفاء و مرہم کا حکم رکھتے ہیں، ...... ایک خاص قسم کی طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ اور اکثر دیکھا ہے۔ کہ ایک حالت کا غلبہ تھا، اور حضرت کا جواب پڑھنے سے وہ حالت بہتری کی طرف فوراً منتقل ہو گئی۔"

متواضع شیخ نے کیا بلیغ جواب لکھا:۔ "یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور آپکی محبت ہے۔"

حضرت والاؒ اس 'مکاتبت' میں۔ انتہائی دقت نظر سے کام لیتے تھے۔ اور مریدین کے خط (احوالنامہ) کی چھوٹی چھوٹی بات پر گہری نگاہ رہتی تھی، اور کمالِ حذاقت سے اسکا جواب دیتے تھے۔ یہاں تک کہ الفاظ و کلمات کے استعمال پر بھی فنی اعتبار سے مشفقانہ ہدایات سے سعادت بخشتے تھے، مثلاً ایک صاحب نے لکھ دیا:-

"کہ اپنا احوال نامہ حضرت والاؒ کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔" حضرتؒ والاؒ نے 'شرف' کے لفظ پر تنبیہ فرمائی اور لکھا:-

"شرف عزّت کو کہتے ہیں۔ ہم فقیروں سے کسی کو عزت حاصل نہیں ہوتی عزّت کے معنی غیروں کی نگاہ میں اس کے مرتبہ کا بڑھنا ہے۔ وہ یہاں مطلوب نہیں۔ مطلوب اس سے سعادت و برکت ہے۔"

ایک دوسرے طالب نے لکھا تھا۔ "افتخار نامہ مل کر باعث ہدایت ہوا۔" حضرت شیخ قدّس سرہٗ نے 'افتخار' کے لفظ پر تحریر فرمایا:-

"افتخار تو نام ہے۔ دوسروں پر اپنی بڑائی کے اظہار کا، تو پھر افتخار نامہ تو وجہ بزرگی بنا، کیا یہ توجیہہ دل کو پسند آتی ہے۔"

اِسی طرح بعض طالبین نے خط کے شروع میں سلام مسنون نہیں لکھا۔ انہیں تنبیہہ فرمائی اور مختلف حضرات کو ارقام فرمایا:-

"خط میں ابتدا بالسلام مسنون ہے۔ آپ نے شاید سہواً چھوڑ دیا۔"

"آپ کے خط میں سلام نہیں ہے۔ یہ ترک سنت ہے۔"

یہ مثالیں اسلئے پیش کیگئی ہیں۔ کہ حضرت والاؒ کی تربیت کے بارے میں، دقیقہ رسی، بالغ نظری، عمق نگاہی اور ہمہ جہتی اصلاح کا اندازہ ہو سکے۔ کہ جب

بادی النظر میں ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی اصلاح کا یہ فکر تھا، تو دگر امور میں کس قدر اہتمام ہوگا۔ حضرت والاؒ کے تربیتی مکتوبات کے بغور مطالعہ ہی حضرتؒ کے اس پہلو کو اجاگر کر سکتا ہے۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ طالبین کے مکتوبات کے جواب انتہائی پابندی اور عجلت کے ساتھ دیتے تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ حتی الوسع ایک دن کے خط کا جواب دوسرے دن پر ملتوی نہیں فرماتے تھے۔ چنانچہ ہم خدام ڈاک کے آنے جانے کے دنوں کا حساب لگاکر حضرت والا قدس سرہٗ کے جوابی خط کا انتظار کرتے تھے ؎

دن گنے جاتے ہیں قاصد کیلئے انتظارِ نامہ محبوب ہے۔

اور اگر کبھی کسی ناگزیر عذر کی بنا پر کچھ تاخیر ہو جاتی، تو طالبین سے کمالِ تواضع کے ساتھ معذرت طلب فرمالیتے تھے، چنانچہ ایسے خطوط میں اس قسم کی عبارات ملتی ہیں :-

"چند دن کی دیر بوجہ مشاغل ہوئی، معاف کیجئے۔"

ایک صاحب کو تاخیر جواب کی شکایت پر لکھا :-

"آپ کے ہر خط کا جواب جا چکا۔ شاید اب پہنچا ہو۔"

خط و کتابت کا یہ اہتمام مرض الوفات کے آخری دنوں تک رہا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ

اگر طالب شیخ کو خط نہ لکھے تو اسمیں اسی کا نقصان ہے۔ مربی کا اس میں کیا حرج ہے۔ تاہم ہمارے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی شفقت کی بنا پر اس خدمت کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اور انتہائی اخلاص و محبت سے طالبین کی خیریت کے جویا رہتے

اور ان کو مکاتبت کی طرف متوجہ فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک طالب کو ارقام فرماتے ہیں:۔

"مدت سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ اور مجھے بھی فرصت ہاتھ نہیں آئی مگر دل برابر آپ کی خیریت کا جویا رہا۔ اور آپ کے حسنِ احوال کے لئے دعاگو رہا۔ امید ہے آپ بخیریت ہونگے۔"

ایک دوسرے طالب کو لکھتے ہیں:۔

"آپ کا خط گو زمانہ سے نہیں آیا تھا، اور آپ کا نام و پتہ یاد نہ تھا۔ مگر رہ رہ کر آپ کا خیال آتا تھا۔ اور چونکہ فقیر اپنے تمام محبین کیلئے جو یاد ہوں یا نہ یاد ہوں، دعا کرتا ہے۔ اسلئے اگر اللہ تعالیٰ نے اس بندۂ محتاج کی دعاء کو قبول فرمایا۔ تو آپ بھی اس میں داخل ہوں گے۔"

ایک اور گرامی نامہ میں تحریر فرمایا:۔

"رات ہی آپ کا خیال آیا کہ آج صبح کو آپ کا خط ملا ؎

دل را بدل رہے است درین گنبد سپہر

ایک طالب کی اس تحریر پر کہ "آنجناب کو روز روز تکلیف دیتے ڈرتا ہوں۔" کمالِ تواضع و شفقت سے ارقام فرمایا:۔

"آپ کی ہر خدمت دینی ثواب ہے، جس کا یہ بندۂ قاصر محتاج ہے۔"

اِسی طرح ایک صاحب نے لکھا۔ "دل شرف مکاتبت کیلئے بیتاب ہوتا ہے لیکن ادب ہاتھ روکتا ہے۔" حضرۃ شیخ نے تحریر فرمایا:۔

"حسنِ ادب مانع مکاتبت نہیں ہے خصوصاً جبکہ مکاتبت ازدیاد فوائد کا باعث ہو۔"

ایک ندوی طالب کو لکھتے ہیں :۔

"آپکا خط پاکر بہت خوشی ہوئی۔ اور آپکے حسنِ جذبہ پر دل سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، ہمارے ندوی بھائیوں میں سے جب کوئی ادھر متوجہ ہوتا ہے تو مجھے دلی خوشی ہوتی ہے۔ اور اسکے حق میں دل سے دعا نکلتی ہے۔"

جب کوئی شخص حضرتؒ کے خطوط کا شکریہ اور اپنی احسانمندی کا اظہار کرتا تو اس طرح کے فقرے لکھ دیتے :۔

"یہ احسان نہیں ہے۔ یہ فرض کی بجاآوری ہے۔ مزدور جو مزدوری کرتا ہے۔ وہ اس پر شکریہ کا مستحق نہیں۔ اس نے تو اپنا فرض ہی ادا کیا۔" (تذکرہ سلیمان صـ ۳۹۲)

مکتوباتِ شیخؒ حضرت والاؒ کے مکتوبات بھی محبت و شفقت، رأفت و رحمت کا گنجینہ ہوتے تھے، اور ان کا ہر ہر لفظ لطف و مرحمت اور طالبین کے درد دل کیلئے مرہم شفا ہوتا تھا۔ حضرتؒ کے مکتوبات کی شان ان کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے۔ جو انہوں نے اپنے شیخؒ کے مکاتیب کی تعریف میں لکھے تھے :۔

آج آیا ہے پیارے کا پیارا مکتوب　　دلکش و دلبر و دلچسپ و دلآرا مکتوب
قوتِ جان، قوتِ دل، سرمۂ بینش تحریر　　روح افزا و دل آویز و دلآرا مکتوب
روشنائی نظر آئے گی سوادِ خط میں　　دیدۂ کور بھی دیکھے جو تمہارا مکتوب
پڑھ لے کوئی تو معطر ہو مشام دل و جان　　نافۂ مشک ہے یا عنبر سارا مکتوب
سر بسر شوق و ہمہ درد ہماری تقریر　　سر بسر مایۂ تسکین ہے تمہارا مکتوب

نامۂ یار کے دیدار میں عالم یہ ہے
ہمہ تن آنکھ ہوں اور آنکھ کا تارا مکتوب "

شفقتِ شیخ

حضرت سیدی و مرشدی قدس سرہٗ اپنے خدام و مسترشدین کے ساتھ انتہائی محبت و شفقت سے پیش آتے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رأفت و رحمت کا پورا عکس حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی ہر ادا سے ظاہر ہوتا تھا۔ طالبین کی تربیت و فیض رسانی جس لطف و کرم اور تواضع و شفقت سے فرماتے تھے۔ اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ فقیر نے بہت سے آستانوں میں حاضری دی۔ لیکن جس تواضع و خاکساری، فنائیت و شفقت کا عملی مظاہرہ آستانۂ سلیمانی میں دیکھا۔ کہیں نظر نہ آیا۔ ؎

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

بارگاہِ سلیمانیؒ میں جو قدر و منزلت مساکین و فقراء کی تھی، وہ امراء و اغنیاء کی نہ تھی، فرماتے تھے:۔

"امراء اور وزرا سے ملکر قلب پر جو سیاہی آتی ہے اسکے دھونے کیلئے تالاب چاہئیں۔

ایک صاحب کو تحریر فرمایا:۔

"گوشہ گیری اغنیاء و کبرائے سے مناسب ہے۔ فقراء اور طالبینِ حق سے نہیں۔"

ایک غریب طالب جنکے سوالات اور باتوں سے سننے والے بھی تنگ آجاتے تھے، حضرت اقدسؒ دو دو گھنٹے تک پورے انشراح سے انکی باتوں کو سنتے اور خندہ پیشانی سے انکے جوابات دیتے اور ان کی تسلی کرتے۔

لائلپور کے سفر میں حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی طبیعت ناساز تھی، خادم (راقم) ساتھ تھا، ایک صاحب نے دو صفحہ کا ایک لمبا خط جس میں اپنی پریشانیاں لکھی تھیں حضرتؒ کو دینا چاہا۔ میں نے اس خیال سے کہ حضرتؒ کی طبیعت نڈھال ہے۔ اور ان کا منشاء صرف دعاء ہے۔ واپس کرنا چاہا۔ حضرتؒ نے دیکھا تو باوجود ضعف کے باہر تشریف لے آئے، پورا خط پڑھا۔ اور ایک دعائے ماثورہ پڑھنے کیلئے لکھ دی۔

یہ ناکارہ جب اپنی آخری حاضری کے بعد واپس آنے لگا۔ تو کس محبت و شفقت سے رخصت فرمایا، دعائیں دیں۔ معانقہ فرمایا، مصافحہ کے وقت دعائے ماثورہ

استودع اللہ دینکم اماناتکم وخواتیم اعمالکم۔

عجب پرتاثیر انداز میں پڑھی، ان الفاظ پر ہی اکتفا نہ فرمایا، یہ گنہگار جب رخصت ہوکر باہر آگیا، تو حضرت والاؒ برہنہ پا رخصت کرنے کیلئے باہر نکل آئے یہ دیکھ کر دل کی عجیب کیفیت ہوئی، دعاء کی درخواست کے بعد عرض کیا، حضرت کو تکلیف ہو رہی ہے اب آرام فرمائیں، آہ کیا معلوم تھا، یہ رخصتی دائمی ہے، محبت و شفقت کا یہ بے مثل منظر شیخ کی رخصتی، نظر و مصافحہ اور فقیر کی اشکبار آنکھوں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ختم ہوا، کاش جانتا کہ یہ آخری دید ہے ـــ!۔

دل بھر کے دیکھ لو یہ جمال جہاں فروز　　　پھر یہ جمال نور دکھایا نہ جائے گا۔

ایک مرتبہ ایک جلسہ کے سلسلہ میں پنڈی تشریف لائے، ایک عقیدت مند

کے یہاں قیام تھا، راقم بھی ملاقات کی غرض سے حاضر خدمت ہوگیا۔ انتہائی مسرور ہوئے اور فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ ہر جگہ کوئی نہ کوئی خدمت کا بندوبست فرما دیتے ہیں۔" رات کو میں نے اجازت چاہی کہ کسی ہوٹل میں قیام کر لوں، فرمایا۔ "آپ فقیر آدمی ہیں، یہیں پڑ رہیئے۔"

اسی طرح ایک مرتبہ کراچی جا رہا تھا، حضرت والاؒ لاہور پنجاب یونیورسٹی کمیشن کی میٹنگ کے سلسلہ میں آئے ہوئے تھے، مجھے علم نہ تھا، لاہور ریلوے اسٹیشن پر میرے کاندھے پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا، پلٹ کر دیکھا تو حضرت شیخؒ کا پُر نور چہرہ اور متبسم نگاہیں نظر آئیں۔ اس وقت مجذوب کے اس شعر کا منظر نگاہ کے سامنے آگیا۔

چمکتی آنکھیں دمکتا ہے چہرہ ۔۔۔ بڑھاپے میں بھی جانِ جاں ہو رہا ہے

پھر بحمداللہ تعالیٰ کراچی تک ہمسفری کی سعادت نصیب ہوئی۔"

فنائیت و تواضع شیخ

حضرت الشیخ قدس سرہٗ کی فنائیت و تواضع آپکی اس شفقت کے ساتھ مل کر عجب تاثر پیدا کرتی تھی، حضرت والاؒ کے تربیتی خطوط کا لفظ لفظ اور حرف حرف اس پر گواہ ہے۔ کہ سلیمانیؒ قلب محبت و پاکیزگی، لطف و رحمت، رأفت و شفقت فنائیت و تواضع کا گنجینہ تھا، طالبین کی تربیت فرماتے تھے، ان سے اجر و مدح اور تحسین کے طالب نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ الٹا اسے احسان ربانی سمجھکر

طالبین کے شکر گزار ہوتے تھے۔

ایک مسترشد خاص کو لکھتے ہیں:۔

"ان خیالات کا شکریہ، جو آپ کی محبت کا تقاضا ہے، ورنہ ع

من آنم کہ من دانم

مجھ میں بجز اسکے کچھ نہیں ہے۔ کہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا دست گرفتہ ہوں۔ اب جو کچھ ہے، یہی نسبت ہے۔ اور اسی کا بفضل خدا بھروسہ ہے۔ آپ میرے لئے دعاء کریں، میں آپ کیلئے دعاء کرتا ہوں، ہر مسلمان بھائی کی دعاء دوسرے مسلمان بھائی کے حق میں قبول کی استعداد تام بدرگاہ باری تعالیٰ رکھتی ہے۔" (تذکرہ سلیمان ص۴۲۹)

ایک سالک نے لکھا:۔ تو دستگیر شوائے خضر پے حجستہ کہ من

پیادہ می روم وہمرہاں سوار انند

حکیم شیخؒ نے جواباً لکھا:۔

"دل سے دعاء ہے، یہ خضر پے مجستہ توفیق الٰہی ہے۔ جسکی دعاء مانگنی چاہیئے"...

میں کہاں سے بزرگ آیا، یہ حسن لیلیٰ نہیں، چشم مجنوں کا کرشمہ ہے۔" (تذکرہ سلیمان ص۵۶۱)

ایک طالب کو لکھتے ہیں:۔

"اس ناچیز کے ساتھ آپکی غائبانہ محبت مجھ پر اللہ تعالیٰ کے افضال میں سے ایک ہے، جو میری بے استحقاقی کے باوجود دوستوں کو میری طرف محض اپنے فضل وکرم سے متوجہ فرماتے ہیں..... مجھ سے جو خدمت متعلق ہو۔ اسکے لئے خاکسار کو اپنا خادم سمجھئے۔"

ایک صاحب کے استفسار پر لکھتے ہیں :۔

" یہ خاکسار لفظاً پیر ہے۔ اللہ تعالیٰ معناً بھی بنا دیں' ..... مجھے حضرت والا (مولانا تھانویؒ) سے تعلق خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی تعلیمات کی برکت سے بہرہ مند فرمائیں۔"

طالبین جب شیخؒ کے احسانات وشفقت یا کمالات کا تذکرہ کرتے تو اس قسم کے فقرے لکھ دیتے :۔

" استغفر اللہ میں خود قاصر العمل ہوں اور سب سے کم درجہ' اپنے احباب اور دوستوں کے ساتھ تعلق خاطر رکھتا ہوں' اور آپ تو خاص تعلق و وابستگی رکھتے ہیں ع

تا نسوزد شمع کہ پروانہ شیدا می شود" (تذکرہ سلیمان ص۴۱۳)

" اللہ تعالیٰ اس تعلق کو میرے اور آپ دونوں کیلئے مفید کریں' میرا ایک شعر ہے ؎

احباب کے حسن ظن کا ممنون ہوں میں جو مورِ ضعیف کو سلیمان سمجھے'

یہ سب آپ کی محبت کے کرشمے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم دونوں کو اخلاص کے ساتھ الحب فی اللہ تعالیٰ کا مرتبہ عنایت فرمائے۔ یہ (تربیت و خدمت) احسان نہیں ہے۔ یہ فرض کی بجا آوری ہے۔"

ایک اور طالب کو ارقام فرمایا :۔

خدا کا شکر ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو توفیق خیر بخشی' محنت راہرو کی ہوتی ہے' راہ کا بتانے والا اپنا فرض ادا کرتا ہے ..... یہ احوال

میرے نہیں خود آپ کے ہیں۔ آئینہ میں اپنا ہی چہرہ نظر آتا ہے۔
غیر کا نہیں۔"

فقیر کی دلجوئی فرماتے ہوتے ارشاد فرماتے ہیں :۔

" میرا کوئی حق نہیں جو آپ نے تلف کیا ہو، اسکی فکر نہ کریں، میری
نسبت آپ جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ وہ صرف آپ کا حسنِ ظن ہے۔
باقی سچ ہے، ممکن ہے آپ کی طلب کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ
مجھ کو واسطہ محض بنا کر آپکو بیش از بیش عطا فرمائیں۔"

ایک گرامی نامہ میں ارقام فرماتے ہیں :۔

" یہ آپ کے اخلاص و محبت کا کرشمہ ہے، خدا کرے کہ اللہ تعالیٰ اِس کو
مزید حسنِ عمل کا ذریعہ بنائیں ..... میرا کیا شکریہ، شکر اللہ تعالیٰ کا ہے
جس نے مجھے اور آپ کو یہ توفیق بخشی۔"

ایک طالب جو ملازمت کے سلسلے میں کراچی سے بصرہ جا رہے تھے انہیں
کیا شفقت کے پیرایہ میں لکھتے ہیں :۔

" یہ فقیر الی اللہ جب سے پاکستان آیا ہے، آپ کی محبت برابر اسکے
ساتھ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی جزائے خیر دیں اور دین و دنیا
میں آپ کو سعادت عطا فرمائیں، آپ جا رہے ہیں، میری دلی دعائیں
آپ کیساتھ ہیں۔ وصیت کرتا ہوں، کہ قدم استقامت کی راہ پر رہے،
اور نگاہ محارم سے بچے۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصانیف زیر مطالعہ
رہیں، نماز با جماعت کا حتی الوسع اہتمام رہے۔ مشائخ رحمہم اللہ کے

طریق پر ایک تسبیح ودائی ہدیہ کے طور پر قبول کریں، اللہ تعالیٰ برکت دیں...... ہمیشہ کیلئے یہی نصیحت ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت نہ ہو، تہجد اور ذکر کا اہتمام رہے، حضرت والاؒ کی تصانیف کا مطالعہ انشاء اللہ تعالیٰ ہر بے راہ روی سے آپ کو بچائے گا۔ اور آپ کے قلب کو اللہ تعالیٰ سے وابستہ رکھے گا۔ عراق کی سرزمین عجائبات سے لبریز ہے۔ لغزش پا کا موقع ہر رہگذر پر ہے۔ ؎

ہشدار کہ رہ بردم تیغ است قدم را

معاملات پر خصوصیت سے نظر رہے۔"

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ فنائیت کے اس مقام پر تھے۔ جسکا تصور بھی ہماشما نہیں کر سکتے، ایک مسترشد کو لکھتے ہیں۔

"فقیر تو اپنے کو حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے حلقہ میں صفِ نعال کے قابل بھی نہیں سمجھتا، اور نہ ہی میرے احباب اس سے زیادہ مجھے سمجھیں، مجھے اپنے اندر کوئی بات بھی معلوم نہیں ہوتی، سراپا نقص اور مجموعہ عیوب۔" (تذکرہ سلیمان ص ۶۶۴)

دوسرے مکتوبات میں للہیت وفنائیت کا نقش ثبت فرماتے ہوئے رقم فرماتے ہیں:۔

"بزرگوں کا حسن ظن اس بے استحقاق کیساتھ میرے لئے نعمت بھی ہے، اور ابتلا بھی، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائیں..... میری نسبت جس حسن ظن کا آپ نے اظہار کیا ہے۔ خدا کرے کہ وہ آپکی کامیابی اور ترقی کا ذریعہ ہو۔" (تذکرہ سلیمان ص ۶۰۷)

ایک مرید نے لکھا۔ "کہ حق تعالیٰ حضرت والاؒ کو قطب الاقطاب بنائے اور ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کو بیش از بیش توفیق رجوع عطا فرمائے۔"

متواضع شیخ نے کیا وجد آور جواب ارقام فرمایا :-

" فقیر سب دوستوں کی دعاء کا محتاج ہے۔ لیکن اسکی آپ کی دعاء سے زیادہ اس دعاء کی ضرورت ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں اور مجھے اپنا بنائیں۔"

غرض حضرت سیدی قدس سرہٗ سراپا شفقت و فنائیت اور للہیت و تواضع کا پیکر تھے۔ اور آپ کی تربیت انہیں صفات عالیہ کا آئینہ و نمونہ تھی۔

(رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ وارزقنا اتباعہٗ)

تصانیف تھانویؒ

حضرت سید الملۃ قدس سرہٗ سلوک وفن، حقیقت ارادت و مشیخت کے سمجھنے دین کا صحیح فہم حاصل کرنے اور عمل کی ہمت پیدا کرنے کیلئے اپنے شیخ حضرت مجدد الملۃ حکیم الامۃ مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی کتابوں کے مطالعہ کی بہت تلقین فرماتے تھے۔ خصوصاً ملفوظات و مواعظ کے متعلق تو انتہائی تاکید تھی، کہ ان کا بغور بغرضِ استفادہ مطالعہ کیا جائے، اور حق یہ ہے کہ جس نے بھی ان مواعظ و ملفوظات کا مطالعہ کیا، ان سے متأثر ہوا۔ اور اسکی زندگی میں بحمد اللہ تعالیٰ کچھ نہ کچھ مذہبی انقلاب ضرور پیدا ہوگیا۔ اسی لئے نگاہ سلیمانیؒ میں ان کی اتنی قدر و قیمت تھی، کہ میری پہلی حاضری کے وقت استفسار فرمایا۔ "آپ نے مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ملفوظات و مواعظ پڑھے ہیں۔ راقم نے نفی میں جواب دیا تو فرمایا:۔

"ملفوظات و مواعظ پڑھیئے، وہاں ہر چیز اندر سے پھوٹ کر نکلی ہے۔"

متعلقین و منتسبین کو بکثرت انکے مطالعہ کی تاکید فرماتے تھے ایک صاحب سے جنہیں فقیر کے سامنے راولپنڈی میں بیعت فرمایا تھا۔ ارشاد فرمایا: "کم از کم ساٹھ یا ستر مواعظ مطالعہ فرمالیجئے۔"

اس سلسلہ میں حضرت والاؒ کے مکتوبات کے بعض اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں، جن سے ان مواعظ وملفوظات کی اہمیت ظاہر ہوگی، شاید اس سے کسی طالب حق کو فائدہ پہنچے،

"مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مواعظ وملفوظات کا مطالعہ ضرور کیا کریں، بیحد منافع اور علم صحیح اللہ تعالیٰ عنایت فرمائیں گے اور تمیز حق و باطل عطا ہوگی۔"

"ان کتابوں (ملفوظات ومواعظ اور انفاس عیسیٰ) کا بغور بغرض استفادہ مطالعہ انشاء اللہ تعالیٰ مفید عمل، محرّکِ عمل اور مثمر برکات ہوگا۔"

"اگر آپ حضرت تھانویؒ کے مواعظ پڑھا کریں، تو اس سے سب مرحلے طے ہونگے۔"

"اگر کسی زندہ کی صحبت حاصل نہ ہوسکے۔ تو حضرت تھانوی (رحمہ اللہ تعالیٰ) کے مواعظ اور ملفوظات دیکھا کریں، اور بری صحبت سے پرہیز کریں انشاء اللہ تعالیٰ صحبت کے فوائد حاصل ہونگے۔"

"اگر آپ دین کا صحیح فہم حاصل کرنا چاہیں۔ تو حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ملفوظات اور مواعظ مطالعہ فرمائیں۔ اس کام میں مجھ سے جو امداد ہوسکے گی، انشاء اللہ تعالیٰ وہ ضرور ہوگی۔ بے جان نماز میں جان پڑجائیگی انشا اللہ تعالیٰ، پہلے آپ ان کتابوں کے مطالعہ سے دین کا صحیح فہم پیدا کریں"

"آپ مواعظ اور ملفوظات تو ضرور ہی پڑھیں اور کوشش کر کے پڑھیں

ہمت اور کوشش کے بغیر دین کی راہ بھی طے نہیں ہو سکتی۔"

"اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائے، ملفوظات اور مواعظ سے جو ملے اسکو مطالعہ کریں، کم از کم چالیس پچاس وعظ پڑھ لیں۔"

"آپ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں سے پہلے قصد السبیل پھر تعلیم الدین پڑھیے۔ اور حضرت کے جسقدر مواعظ و ملفوظات مل سکیں، مطالعہ کرتے رہیں۔"

"حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مواعظ کم از کم ایک سو پڑھیں اسکے بعد استفسار مزید فرمائیں، تعلیم الدین کو بار بار مطالعہ کی خاطر نہیں، بلکہ عمل کی نیت سے پڑھیں اور عمل پر دھیان دیں۔"

"آپ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کو دیکھا کریں۔ (اپنے) عیوب ونقائص کا پتہ چل جائیگا۔ اور ان کا علاج بھی معلوم ہوگا۔ انفاسِ عیسیٰ ... ...مطالعہ میں رکھیئے۔ بڑی عجیب کتاب ہے۔"

"جی ہاں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات و تالیفات کے مطالعہ سے نئی قوت پیدا ہوگی، دس پندرہ منٹ بھی غنیمت ہیں۔"

"آپ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات و مواعظ پڑھا کریں۔ یہ خود قائم مقام صحبت ہیں۔"

"خوشی ہوئی کہ قصد السبیل کو آپنے پڑھ لیا، اور مواعظ کا مطالعہ کر رہے ہیں مواعظ و ملفوظات کا مطالعہ مثمر برکات اور باعث ترقیات ہے۔"

"ہمارے حضرتؒ کی تصانیف میں سے جس قدر مواعظ و ملفوظات ملیں

مطالعہ کیجئے، ان میں سے التکشف اور شرح دیوان حافظ پڑھیئے۔"

"حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مواعظ و ملفوظات کا مطالعہ رکھیں اس سے انشاء اللہ تعالیٰ کشفِ حجابات ہوگا، اور سلوک کی سیدھی راہ معلوم ہوگی، اور استقامت میں بڑی مدد ملے گی۔"

"حضرت تھانویؒ کے مواعظ و رسائل کا مطالعہ اکسیر ہے۔"

"مولانا تھانویؒ کی تصانیف کا مطالعہ جاری رکھیں یہی ہمارے یہاں طریقہ فیض ہے۔"

"مواعظ و ملفوظات کے مطالعہ کی مداومت ہر مرض کیلئے اکسیر ہے۔ اور روحانی ترقی کی کامیاب تدبیر ہے..... وہاں (یعنی بصرہ) جانا مبارک ہو۔ خدا کرے کہ دنیا کیساتھ دین کا بھی فائدہ ہو، اسکے لئے بہتر ہے کہ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے کچھ مواعظ و رسائل ساتھ لیتے جائیں اور مطالعہ میں رکھیں۔"

"انفاسِ عیسیٰؒ کے متعلق ارشاد فرماتے تھے:۔" یہ ہمارے مطب کا قرابادین ہے۔" اور اس ناکارہ سے تو آخر میں فرمایا تھا۔ "کہ اسے دیکھ کر اپنا علاج کیا کریں۔"

یہ چند اقتباسات اسی محتاط قلم کے ہیں۔ جسکی علمی دیانت مسلمہ ہے۔ ان سے مواعظ و ملفوظاتِ اشرفی کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ مواعظ و ملفوظات طرزِ ادا کی خوبی تاثیر و دلپذیری کے لحاظ سے نئے طبقہ کیلئے بھی اتنے ہی نافع ہیں۔ جتنے پرانے طبقے کیلئے، اللہ تعالیٰ امت کو ان سے استفادہ کی پوری توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین)

(باب سوم)

توحید

سلوک کا مقصودِ اعظم توحیدِ تامہ کا کامل حصول اور مکمل ایقان و اذعان ہے۔ سلوک کے احوال و مقامات اسی توحیدِ کاملہ کی سعی و حصول کے ثمرہ و نتیجہ ہوتے ہیں۔ جس قدر سالک کا قدم توحید کی طرف بڑھتا چلا جائے گا۔ صبغۃ اللہ کے رنگ میں نکھرتا چلا جائے گا۔ صفات الٰہیہ کا انعکاس اسے فضائل و اخلاق سے متجلّی اور رذائل سے پاک بنا دے گا، خشیت و محبت الٰہی کا رسوخ اسے معاصی سے مجتنب، اوامرِ الٰہی کا پابند اور یادِ الٰہی میں شاغل کر دے گا۔ فاعلیتِ حقہ، کا استحضار اسے اپنا نفع و ضرر، خیر و شر، عزت و ذلت صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات ہی میں منحصر دکھائے گا۔ اور وہ ہر ایک سے کٹ کر ایک اللہ تعالیٰ ہی کا ہو جائے گا.... کہ اس کے سوا سب ہیچ و باطل ہے اور وہی ایک ذات منبعِ برکات و فیوض و انعامات ہے ے

كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ وَاِنَّ فَضْلَ اللّٰهِ غَيْمٌ هَاطِلٌ (رومی)

(ہر چیز اللہ کے سوا باطل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا فضل ہی متواتر خوب برسنے والا بادل ہے)

جب سالک پر توحیدِ ربانی کی حقیقت کھلتی ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ ہی کو فاعل حقیقی ومؤثر اصلی جان لیتا ہے، اسباب ووسائل کے حجابات اُٹھ جاتے ہیں۔ ان کی حکمت ظاہر ہوجاتی ہے۔ اور وہ ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی سے ہوتی جانتا اور پاتا ہے، اس بنا پر وہ ہر لحاظ سے تکویناً وتشریعاً اپنے کو ذاتِ حق کے سپرد کردیتا ہے۔ اور اپنے جزو کل کو اسی ذات سے وابستہ کرلیتا ہے۔ اسکا قرار وہی ذات بے ہمتا اور اس کا سکون وہی ذات جمیل بن جاتی ہے، اسی کو وہ اپنا مقصود ومطلوب، ملجاء وماویٰ، وکیل وکفیل ھادی وناصر سمجھتا ہے۔ اسی میں سب کچھ دیکھتا ہے۔ اور اسی سے سب کچھ پاتا ہے

غرض "مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ" کی نصِ صریح کی حقیقت "توحید کاملہ" کے حصول سے ہی ہاتھ آتی ہے کہ اس طریق کا ہر راہی توحید کی مختلف گھاٹیوں ومنازل کا جادہ پیما ہوتا ہے ؎

اِس تجلّی گاہ کا ہر نازنین کشتۂ اندازِ الا اللہ ہے

اِس کے اعمال وافعال، گفتار وکردار، قلب ونظر اور روح وجسد کی جملہ حرکات وسکنات خود نمائی عجب وریاء اور کبر وناز کی کثافتوں سے پاک ہوجاتی ہیں، اور اسکی ہر ہر حرکت کا کعبۂ مقصود وہ ذات جمیل بن جاتی ہے جسکی رضا کونین کا حاصل اور جس کی محبت انسان کا سرمایۂ حیات ہے اور جس کے سامنے کائنات کا وجود عدم، مخلوقات کی حقیقت گم، ذی ارادوں کے ارادے ختم اور صاحبِ نطق گنگ ہیں، اسی

حی وقیوم کے وجود سے کائنات کی ہستی قائم، اس کے ہنگامے آباد اور اس کی مجلسیں پُر رونق ہیں، کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی محبت میں سرگرداں ہے کہ اس جمیل مطلق کے سوا کوئی قابل التفات نہیں۔ سالک کا منتہائے کمال بھی یہی ہے کہ سب سے کٹ کر اسی کی محبت میں مست اور اسی کے جمال میں محو ہو جائے۔ نہ نگاہوں میں اس کے سوا کوئی سمائے اور نہ قلب کی گہرائیوں میں کوئی اور بار پائے وہ محیط بے کراں اس کے روح وجسم پر اس طرح چھا چکا ہو۔ کہ اس کی ہر ادا اس فاعل حقیقی کے اشاروں کا عکس اور اسکا ہر عمل اسی کا پرتو ہو کہ اسلام کی حقیقت ہی یہی ہے کہ اپنے کو قلباً وجسداً، تشریعاً وتکویناً اسی ایک کے سپرد کر دیا جائے ؏

عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن ۔۔۔ دل بدست دیگرے دادن وحیراں بودن

اور شاید اسی رمز کی طرف موحد کامل خلیل علیہ السلام کے یہ الفاظ اشارہ کر رہے ہیں

قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (بقرہ ـ ۲)

(ابراہیمؑ نے کہا) میں فرمان بردار ہوا عالموں کے پروردگار کا۔

اسلام تسلیم وتفویض کا مترادف ہے، کہ اپنے کو اسی ایک کے حوالے کر دیا جائے "تکویناً" اس کی رضا پر راضی اور تشریعاً اس کے اوامر واحکام کی پابندی اختیار کی جائے، اور تمام عمر انقیاد وتسلیم کی مخلصانہ جدوجہد کے وظیفے میں گذر جائے، کہ زندگی وجان خلق وامر[1] دونوں لحاظ سے جاں بخشنے والے خالق وآمر کی ملک ہے اور بندہ کا انتہائے کمال یہ ہے کہ دینے والے آقا کیلئے خود کو مٹا دے کہ اس مٹنے کا نتیجہ ابھرنا اور اس فنا کا حاصل بقا ہے۔

---

[1] اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (القرآن)

آں کسے را کہ چنیں شاہے کشد　　سوئے تخت و بہتریں جائے کشد

اسلام کی جو حقیقت سید الانبیاء (روحی فداہ) صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مبارک سے ظاہر ہوئی یہی تھی کہ اپنی جانوں کو بالکل اللہ تبارک تعالیٰ کے حوالے کر دیا جائے اپنے ظاہری و باطنی امور کو اسی قاضی الامور کو سونپ دیا جائے، مخلوق سے قطعاً بے نیاز ہو کر اسی غنی مطلق کا نیاز مند اور سارے سہاروں کو چھوڑ کر اسی کا سہارا قبول کیا جائے۔ کہ وہ ذات وحدہٗ لاشریک ہی وہ رکن شدید ہے[1] جس کی پناہ کے بعد خوف نہیں۔ اور جس کی مدد کے بعد ناکامی نہیں، ہمارے تمام امور اسی سے طے پا رہے ہیں۔ ہمارے تمام کاموں میں اسی سے جان اور ہمارے تمام اسباب میں اسی سے تاثیر آرہی ہے۔ ہمارے اعمال و افعال کی ہر حرکت اسی سے ہے۔ اور ہمارے ارادوں کی رنگ آمیزیاں اور تنوع اسی کے دم سے ہیں۔ وہی ذات اقدس کونین کے ہر ہنگامہ اور ہماری جنبش کا باعث و سبب ہے بقول عارف رومی

یا خفی الذات محسوس العطاء　　انت کالماء و نحن کالرحا

انت کالریح و نحن کالغبار　　یختفی الریح و غبراہ جہار

تو بہاری ما چو باغ سبز و خوش　　او نہاں و آشکارا بخششش

تو چو جانی ما مثال دست و پا　　قبض و بسط دست از جاں شد ادا

تو چو عقلی ما مثال این زباں　　ایں زباں از عقل می یابد بیاں

تو مثال شادی و ما خندہ ایم　　کہ نتیجہ شادی فرخندہ ایم

جنبش ما ہر دمے خود اشہد است　　کو گواہ ذوالجلال سرمد است

---

[1] اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ (القرآن)

گردشِ سنگِ آسیا در اضطراب | اشہد آمد بر وجود جوئے آب

اے بیروں از وہم وقال وقیل من | خاک بر فرقِ من وتمثیل من

وہ کریم مطلق جو اندرون وبیرون، غیب وشہادت، ظاہر وباطن کے ہر ہر امر کا مؤثر حقیقی اور لاشریک وبے مثال خالق ہے، جس کی ربوبیت سے موجودات کا ذرہ ذرہ قائم ہے۔ اور جس کی عظمت کے سامنے ہر شے سرافگندہ ہے۔ اِسی لائق ہے کہ ماسواء کی ہر چیز کی نفی کرتے ہوئے اسی سرچشمۂ بقا وحیات کیطرف کلیتہً متوجہ ہوکر اپنے کو اس کے سپرد کر دیا جائے کہ تسلیم ورضا کا مقام اور محبت وخلت کی نعمت "آفلین" کے ترک کے بغیر ملنی مشکل ہے۔ اسی لئے دین حنیفی کے موسس اول ابوالانبیاء سیدنا ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اپنی 'ملکوتی سیر' میں پہلا قدم 'آفلین' کی نفی سے کیا:۔

قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ (انعام۔۹) میں چھپ جانے والے سے محبت نہیں رکھتا۔

اور پھر پکار اُٹھے:۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (انعام۔۹)

ترجمہ:۔ "میں نے متوجہ کرلیا اپنے منہ (و دل) کو اسی کی طرف جس نے بنائے آسمان اور زمین، سب سے یکسو ہوکر اور میں نہیں ہوں شرک کرنے والا۔"

پس ملتِ ابراہیمی کے ہر پیروکار کا یہ فرض ہے کہ ہر طرف سے ٹوٹ کر اسی کی طرف یکسوئی اختیار کرے۔ کہ حنیفیت ظاہر وباطن میں کسی غیر کی طرف

توجہ کو برداشت نہیں کرسکتی اور کسی سفلی وعلوی مخلوق سے قرار نہیں پاسکتی ۔
اس کی اصلی منزل اور اس کا مقصد ذات متعال ہے ؂

بزیدۂ کنگرہ کبریائش مردانند فرشتہ صید وپیمبر شکار ویزداں گیر

مردِ حنیف کی تمناؤں کا محور، اس کی امنگوں کا منتہا اس کے ارادوں کا نشیمن وہی ذاتِ جمیل ہے۔ جس کے سوا محبوب بننے کا سزاوار کوئی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسنِ ازل کے سب سے بڑے اداشناس فداہ ابی وامی صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کو جن تعلیمات سے روشناس کیا' اس میں سرعنوان یہ مضمون تھا، کہ کائنات کی کوئی ہستی، علویات کی کوئی شئے، سفلیات کی کوئی چیز حمید مطلق کے سوا تمہارا کعبہ مقصود نہ ہو، عزت وجاہ کی خواہش، مال ودولت کی حرص، نمود ونمائش، کبر وتفاخر اور کوئی نفسانی خواہش تمہاری توجہ کا مرکز نہ بنے۔ بلکہ تمہاری پوری کی پوری زندگی کا منشا و مقصد صرف ذات باری تعالیٰ ہو۔ ارشاد ربانی ہے

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ط اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (الزمر-۱)

" سو بندگی کر اللہ کی خالص کر کے اس کے واسطے جان لو! کہ اللہ ہی کیلئے ہے بندگی خالص۔"

حنیف وموحد بندے کی پہچان ہی یہی ہے کہ اس کا سرنیاز بارگاہ قدس کے سوا کہیں جھکنے نہ پائے۔ اسکا دل حریم ذات کے جلووں میں کھو کر رہ گیا ہو۔ اور اس کی نگاہیں اس حسنِ بے جہت سے اس طرح مسحور ہو چکی ہوں کہ التفات توجہات کا مرکز مولائے قدوس کے سوا کوئی نہ رہا ہو ؏

مصطفیٰ راضی نشد الابذات

کہ وہ دل جس میں وہ سما جاتا ہے۔ اس کے سوا کسی کی طرف نگاہ نہیں ڈال سکتا۔ جیسے سورج کی روشنی میسر آجائے ذروں سے اقتباس نور نہیں کیا کرتا، اس حسنِ بے پردہ کے سامنے تمام حسن مستور اور محبوب ازل کے سامنے تمام محبتیں ماند پڑ جاتی ہیں۔

ے وہ شہ دلربا جب سامنے آجائے ہے
تھامتا ہوں دل کو پر پہلو سے نکلا جائے ہے

کہ دل پر جب حسنِ ازل کا فیضان ہوتا ہے تو وہ انوار و تجلیات الٰہی سے متاثر ہو کر سراپا اس کے جلوؤں میں مستور اور کیفیات سرمدی میں مخمور ہو جاتا ہے۔ اور اس کی زندگی کاملاً اسی کے تابع ہو کر اسی سے ہو جاتی ہے۔ اور وہ نائب حق، مظہرِ ربانی اور خلیفہ الٰہی کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ بقول عارفِ رومی!

من زجاناں زندہ ام و زجاں نیم — من زجاں بگذشتم و جانا نیم
چشم و گوش و دست و پائیم او گرفت — من بدر رفتم سرائیم او گرفت
ایں بصر ایں سمع چوں آلات اوست — بلکہ ذرات تنم مرأتِ اوست
نغمہ از نائیست، نے از نے بداں — مستی از ساقیست نے از من بداں
گفتنِ من گفتنِ اللہ بود — گرچہ از حلقوم عبداللہ بود
من چوں مست از دیدنِ ساقی شدم — مست گشتیم از فنا باقی شدم

کہ جب عین حیات و قیّم محض وہ ہی حیّ قیّوم ہے تو پھر عالم کی ہنگامہ آرائیاں اس سے نہ ہوں تو کس سے ہوں

بات یہ ہے۔ کہ اسلام میں عقیدہ "توحید" نرا نظریہ ہی نہیں بلکہ مسلمان

کی زندگی کے جزوکل پر حاوی اور اسکے ایمان واعتقاد واخلاق وکردار، اعمال و افعال، احساسات وجذبات کی جان ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدائی وحدت وعظمت، ربانی صفات کی جامعیت، محامد الہی کی کاملیت وہمہ گیری کو اس طرح پیش کیا، کہ انسانی قلوب نے کائنات کے ذرہ ذرہ میں اسی جمال جہاں آرا کا حسن منعکس پایا، اور ہر وجود کی حقیقت ہر حرکت کا محرک، ہر سکون کی وجہ اور ہر سبب کا مسبب اسی وحدۂ لاشریک ذات متعال کو سمجھا، اللہ تبارک وتعالیٰ کی جمالی وکمالی صفات نے مسلمانوں کو اسکا والا وشیدا بنادیا اور اسکی جلالی وتنزیہی صفات نے ان میں عبدیت وسرافگندی طاعت وانقیاد کو وجود بخشا، حضرت سید الملۃ رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :-

"...... محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خدا کا جلوہ نمایاں کیا، جو آسمان کے اوپر سے لیکر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے۔ اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ اس کی شاہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں، اس کے کارخانۂ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں۔ کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں، دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں، شجر، حجر، جنگل، پہاڑ، صحرا، دریا، سورج، چاند، زمین، آسمان، انسان، حیوان، زبان والے اور بے زبان سب اس کے آگے سربسجود اور اس کی تسبیح وتہلیل میں مصروف ہیں۔ سب کمزور ہیں، وہی ایک قوت والا ہے۔ سب جاہل ہیں۔ اسی ایک کو علم ہے۔ سب فانی ہیں، اسی ایک کو بقا ہے۔ سب محتاج ہیں، وہی ایک بے نیاز ہے۔ سب اس کے بندے ہیں۔ وہی ایک شہنشاہ ہے، غرض عرش

سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے۔ اور اس پر صرف اسی کی حکمرانی ہے وہ ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے منزّہ۔ اور ہر الزام سے بری ہے۔ وہ ہر قسم کی صفات عالیہ، اوصاف کمالیہ اور محامد جمیلہ سے متصف ہے۔ اس کی مانند کوئی نہیں، اسکی شبیہ و مثال کوئی نہیں، وہ تشبیہ و تمثیل سے بالاتر اور انسانی رشتہ ناطے سے پاک ہے،

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۚ — وہ ہے اللہ تمہارا رب۔ اسی کی بادشاہی ہے

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (زمر-۱) — اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (زمر-۱) — آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (انعام-۲) — آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنیوالا۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (انعام-۹) — چھپی اور کھلی کا جاننے والا۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ — اسی کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے

لَهُ الْحُكْمُ (قصص-۹) — اسی کے ہاتھ میں فیصلہ کی طاقت ہے

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (شوری-۲) — اس کے مانند کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (مومن-۷) — وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ (انعام-۷)

غیب کی کنجیاں اسکے پاس ہیں۔ اسکے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا۔ خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ اسکو جانتا ہے، درخت کا کوئی پتہ نہیں گرتا اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہے، لیکن وہ اسکے علم میں ہے۔

اَللّٰھُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي	اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو جس کو
الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ	چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے
الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ	اور جس کو چاہے عزت دے۔ اور جسے چاہے
مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ	ذلت نصیب کرے۔ تیرے ہاتھ میں بھلائی
تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ	ہے۔ بیشک تو ہر بات پر قادر ہے
اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ	(آل عمران۔ ۳)
وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ	اور اگر اللہ تجھے مصیبت پہنچائے، تو اس کے
فَلَا كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ	سوا اسکا کوئی دور کرنے والا نہیں۔ اور
وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا	اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کرنا چاہے
رَآدَّ لِفَضْلِهٖ يُصِيْبُ بِهٖ	تو اسکے فضل و کرم کا کوئی روکنے والا نہیں
مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ	اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اپنا فضل پہنچا دیتا ہے
الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝	اور وہی گناہوں کو معاف کرنے والا اور
(یونس۔ ۱۱)	رحم کرنے والا ہے۔

...... ان معنوں کی ہزاروں آیتیں قرآن پاک میں ہیں۔ ان تعلیمات نے خدا کی عظمت، جلالت اور کبریائی کا وہ جلوہ پیش کیا، جس کے سامنے معبودانِ باطل کی عزت خاک میں مل گئی۔ بتوں کی بڑائی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ سورج چاند تاروں کی خدائی کا چراغ ہمیشہ کیلئے بجھ گیا۔ جن و انس، شجر و حجر، بحر و بر، سب اس کے جلال و جبروت کے سامنے سربسجود نظر آتے۔ پھر اس کے سوا کون تھا جو نیرنگ وجود کے ساز سے اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ (میں ہوں خدا جسکے سوا کوئی خدا نہیں) کی

صدا بلند کرسکتا " (سیرت النبی ص۱۷۸ تا ص۱۸۱ ج۴)

.... (حضرت) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ربّانی تعلیمات سے انسانوں[۱] کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا، اس کی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا۔ اس کی مشیت وارادہ اور قدرت ووسعت سے آگاہ کیا، ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی ان کو تعلیم دی، جسکی قدرت بے انتہا، جس کی وسعت غیر محدود ہے۔ جس کی مشیت کائنات کے ہر ذرہ میں نافذ ہے۔ جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل ہے۔ دلوں کے اسرار زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو ہیں۔ اسکے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جوابدہ اور ذمہ دار ہے۔ اس کے مواخذہ کا خوف اور اس کی رحمت کی امید ہے، وہ محبوبِ ازل ہے۔ اس کی محبت کا نشہ ہمارے دلوں کی ہشیاری ہے۔ اس کے فضل وکرم اور لطف ومحبّت کی نیرنگیاں اوپر سے نیچے تک پھیلی ہیں۔ اس کی قوّت ہر قوت پر غالب ہے، اسکا ارادہ ہر ارادہ میں نافذ اور اسکا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے۔ اس کی عبادت ہر مخلوق پر فرض اور اسکی اطاعت ہر مکلف پر واجب ہے۔ وہ ہر عیب سے پاک ومنزّہ اور ہر وصف کا مستحق، اور اسی سے متصف ہے، انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور ان کے تزکیہ واصلاح کے لئے رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجتا رہا۔ اور ان سے ہم کلام ہوتا رہا، اس کے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین ہیں، جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے وہ اندھیرے کی روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسوں کی امید، زخمیوں کا مرہم بے قراروں کی تسلی اور بے کسوں کا سہارا ہے۔ وہ ہم سے ہماری گردن کی رگ سے

---

۱ اصل میں اُن ہے یعنی عربوں کو

بھی قریب تر ہے۔ ہم اس کو جب پکاریں وہ سنتا ہے۔ وہ نیکیوں کو پسند اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے۔ وہ جب چاہے آسمان وزمین کو فنا کر دے۔ اور جب چاہے ان کو پھر رچا دے، اس کی محبت دنیا کا حاصل، اس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اسکی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (رعد-۴) ہاں خدا کی یاد سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

ان تعلیمات کا اثر ہوا کہ وہ لوگ جن کو بھولے سے بھی خدا کا نام یاد نہ آتا تھا۔ وہ اس کے سوا سب کچھ بھول گئے۔ اور اسکی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو گئے، وہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر حال میں اس کی یاد میں سرمست و سرشار رہتے تھے۔

يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران-۲۰) وہ خدا تعالیٰ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے ہیں۔

اسی سرمستی و سرشاری میں بھی انہوں نے جنگلوں میں راہبانہ زندگی بسر نہیں کی، دولتمندوں کی بھیک کو اپنا سہارا نہیں بنایا۔ دنیا کی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے بزدلانہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دے کر اختیار نہیں کیا، بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جدوجہد اور سعی و کوشش کو اپنا مذہب سمجھا اور خدا کا حکم جان کر اس کو پوری مستعدی کے ساتھ بجالائے۔ اور ان تمام ہنگاموں کے ساتھ دل کا معاملہ دلدارِ ازل کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا، خدا نے ان کی مدح کی کہ:-

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ — وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت
وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور-۴) — خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

ان کی محبتِ الٰہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آگیا، خدا نے ان کی توصیف کی کہ

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ — ایمان والے سب سے زیادہ خدا
حُبًّا لِّلّٰهِ (بقرہ-۲۰) — سے محبت کرتے ہیں۔

ان کا توکل، ان کا صبر، ان کا استقلال، ان کی استقامت، ان کی بہادری، ان کی بے خوفی، ان کی صداقت، ان کی راستبازی، ان کی اطاعت، غرض ان کی ہر چیز ان کے اسی جذبۂ ایمانی کا پرتو تھی۔ اور ہر وقت ان کے پیش نظر یہ تعلیم رہتی تھی کہ

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ — جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے۔ تو خدا
فَهُوَ حَسْبُهٗ (طلاق-۱) — اس کو بس ہے۔
اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ — کیا خدا اپنے بندہ کو کافی نہیں۔
عَبْدَهٗ (زمر-۴)
وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ — اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے۔ حالانکہ
اَنْ تَخْشٰهُ۔ (احزاب۔) — سب سے زیادہ خدا سے ڈرنا چاہیئے

ان میں یہ تمام روحانی و اخلاقی جوہر اسی ایمان باللہ کے بدولت پیدا ہوئے" (سیرت النبی جلد ۴ ص ۴۸۷ تا ۴۹۰)

حضرت سیدی قدس سرہٗ نے فقیر سے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا۔ "میرا ایک شعر ہے"

کارفرما ایک آتا ہے نظر
منکشف اب رازِ الا اللہ ہے۔

اسے توحید افعالی کہتے ہیں۔ اس کے بغیر توحید کامل نہیں ہوتی۔ حاصل کرنے کی تو یہ چیز ہے کہ یہ اذعان ویقین پیدا ہو جائے کہ ہر چیز کے فاعل اللہ تعالیٰ ہیں۔ وہی مؤثر ہیں۔ جو چیز بھی نظر آرہی ہے اس سے نگاہ ہٹ جائے اور ہر چیز اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے ہوتی نظر آئے، عرض کیا گیا۔ اس کے حصول کی کیا صورت ہے ؟ فرمایا۔ "پہلے اس عقیدہ کو معلوم کیجئے" عرض کیا گیا۔ عقیدہ تو ہے۔ فرمایا۔ "عقیدہ نہیں ہے۔ کیا آپ کو ہر چیز یونہی نظر آتی ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ اسباب پر سے نظر اٹھ جاتے اور یہ یقین پیدا ہو جاتے کہ ہر چیز کے کرنے والے اللہ تبارک وتعالیٰ ہیں۔ اسباب میں تاثیر ان ہی کی ذات سے آرہی ہے۔ اسباب کے متعلق حضرت والا (مولانا تھانوی) رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک ملفوظ مجھ سے شعر میں ادا ہو گیا ہے۔

یہ اسباب ہیں دستِ قدرت میں یوں
قلم دستِ کاتب میں جیسے رہے

اسباب کی حقیقت اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ یہ تو بس ایک آلہ ہے۔ اس سے نگاہ اٹھ کر اللہ تعالیٰ کی ذات پر آجائے، یہ سب لا الٰہ الا اللہ میں شامل ہے

سب کچھ کرنے والے اللہ تعالیٰ ہیں

کیا مخلوق کو مؤثر یا کرنے والا سمجھنا شرک نہیں ؟ ہر نبی کو کسی خاص، صفت میں خصوصی کمال حاصل تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام تدبیر و توکل کے

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ — وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت
وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور-۵) — خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی،

ان کی محبتِ الٰہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آگیا۔ خدا تعالیٰ نے ان کی توصیف کی کہ:-

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ — ایمان والے سب سے زیادہ
حُبًّا لِّلّٰهِ (بقرہ-۲۰) — خدا سے محبت کرتے ہیں۔

ان کا توکل، ان کا صبر، ان کا استقلال، ان کی استقامت، ان کی بہادری، ان کی بے خوفی، ان کی صداقت، ان کی راستبازی، ان کی اطاعت، غرض ان کی ہر چیز ان کے اسی جذبۂ ایمانی کا پرتو تھی، اور ہر وقت ان کے پیشِ نظر یہ تعلیم رہتی تھی کہ:-

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ — جو خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے
فَهُوَ حَسْبُهٗ (طلاق-۱) — تو خدا اس کو بس ہے۔
اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ — کیا خدا تعالیٰ اپنے بندہ کو
(زمر-۴) — کافی نہیں۔
وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ — اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے حالانکہ
اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ (احزاب) — سب سے زیادہ خدا سے ڈرنا چاہیئے۔

ان میں یہ تمام روحانی و اخلاقی جوہر اسی ایمان باللہ کے بدولت پیدا ہوئے (سیرۃ النبی ج ۴ ص ۴۸۱ تا ۴۸۲)

حضرت سیدی قدس سرہٗ نے فقیر سے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا میرا ایک شعر ہے۔

؎ کار فرما ایک آتا ہے نظر — منکشف اب رازِ الا اللہ ہے

جامع تھے، قرآن کریم میں ہے کہ جب یعقوب علیہ السلام کے بیٹے مصر جانے لگے، توآپ نے ان سے ارشاد فرمایا۔

یٰبَنِیَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْ	اے میرے بیٹو، سب کے سب ایک ہی
بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ	دروازے سے مت جانا، مختلف دروازوں
اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ وَمَا اُغْنِیْ	سے داخل ہونا، اور میں خدا کے حکم کو تم
عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ	پر سے نہیں ٹال سکتا، حکم تو بس اللہ ہی کا
اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ	چلتا ہے (باوجود اس تدبیر ظاہری کے دل سے)
وَعَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ	اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں۔ اور اسی پر

بھروسہ کرنیوالوں کو بھروسہ رکھنا چاہیئے

اس سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی تدبیر و توکل کی جامعیت معلوم ہوتی ہے۔ ظاہر میں اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا، لیکن باطن میں ان اسباب پر کچھ بھروسہ نہ تھا۔ بلکہ یہ یقین راسخ تھا، کہ حقیقت میں تو وہی ہوگا جو اللہ تبارک وتعالیٰ چاہیں گے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ وہ علم تھا جو ہم نے یعقوب علیہ السلام کو مرحمت فرمایا تھا۔ اسباب کے ہوتے ہوئے اسباب پر نگاہ نہ ہونا اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہی میسر آتا ہے۔

درکفِ جام شریعت درکفِ سندان عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سندان باختن

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی توحید سب سے کامل تھی، ان کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ ارشاد فرمایا ہے:۔

.... فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ، وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ، وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ط (الشعرا۔ ۵)

وہ بت) میرے دشمن ہیں مگر تمام عالم کا پروردگار جس نے مجھے پیدا کیا وہی مجھے ہدایت دے گا۔ وہی ہے جو مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے۔ اور میں جب بیمار پڑتا ہوں تو شفا دیتا ہے۔ وہی مجھے مارے گا، اور پھر زندہ کرے گا۔ اور وہی ذات ہے جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہوں کو معاف کر دے گا

اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام جو ہر قسم کے شرک سے پاک تھے۔ ان کی توحید افعالی ہے۔ پس اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ بغیر اس کے توحید کامل نہیں ہوتی، عرض کیا گیا، کہ اسباب کو ترک کر دیا جاتے فرمایا۔ " اسباب دو قسم کے ہیں۔ اسباب حقیقی و اسباب ظنّی، اسباب حقیقی کا ترک جائز نہیں کہ اس کے فاعل تو اللہ تعالیٰ ہیں۔ جیسے کھانا کھانے سے اللہ تعالیٰ بھوک رفع کرتے ہیں۔ اولاد بیوی کے پاس جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ظنّی جیسے سفارش کرنا، وغیرہ ہیں۔ انہیں ترک کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال فاعل اور مؤثر حقیقی اللہ تبارک وتعالیٰ کو جانیں ......"

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک مسترشد خاص کو ارقام فرماتے ہیں:

"توحید کا بڑا مفہوم تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر کام اور ہر معاملہ میں ہمارا 'اِلٰہ' ہو۔ اور اس کے سوا کسی میں نفع و ضرر اور عطا اور عدم

عطا کی قوت نہیں، سب اس کے اذن و مشیت سے ہوتا ہے، وہی جو چاہتا ہے، سو ہوتا ہے، اور جو نہیں چاہتا سو نہیں ہوتا۔ سارا عالم اس کے زیر فرمان ہے۔ اس کے سوا کسی پر حقیقی نافع وضار اور معطی و مانع ہونے کا گمان بھی نہ ہو"۔ (تذکرہ سلیمان ص ۵۹)

ایک سالک کو لکھتے ہیں :۔

" جوش و خروش کی کمی کی فکر نہ کیجئے۔ کام میں لگے رہیئے۔ اور اپنی اصلاح و تربیت کی دھن میں لگے رہیئے۔ تا آنکہ اللہ تعالیٰ کے سوا دل سے ہر چیز کی محبت فنا ہو جائے اور لا إله الا الله کی تکمیل ہو۔"

ایک اور صاحب کو تحریر فرمایا :

"ماسوا سے بے نیازی کیلئے لا إله إلا الله کا ذکر و مراقبہ اسکے معنیٰ کے استحضار کے ساتھ کافی ہے۔"

صفاتِ الٰہیہ

اِس عالم میں ہر چیز اپنے خصوصی خصائص وصفات سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کی پہچان ومعرفت اس کی صفات واسماء سے ہی ہو سکتی ہے۔ حضرت سید صاحب قدس سرہٗ ارقام فرماتے ہیں :۔

" دنیا کے آغاز میں خدا نے کہا تھا کہ 'ہم نے آدمؑ کو سب نام سکھائے'۔ دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی۔ اور علم کی وسعت کہاں سے کہاں پہنچی، مگر غور کیجئے تو ناموں کے ہیر پھیر سے ہم اب تک آگے نہیں بڑھے۔ یہی ہماری حقیقت رہی ہے اور یہی ہمارا فلسفہ ہے ہم اپنے مفروضہ اصولِ منطقی کی بنا پر ذاتیات اور حقائق کے مُدعی بن گئے ہیں۔ لیکن ہزاروں صدیاں گزرنے پر بھی ذاتی اور حقیقی تعریف (حد منطقی) کی ایک مثال بھی پیش نہ کر سکے۔ جو کچھ کر سکے وہ یہ کہ صفات و عوارض اور خواص کے مختلف رنگوں سے نئی نئی طفلانہ شکلیں بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ جب مادیات کا یہ عالم ہے تو وراء الوراء ہستی میں ہماری بشری طاقت اس سے زیادہ کا تحمل کیونکر کر سکتی ہے، تجلّی گاہ

طور اسی رمز کی آتشیں تصویر ہے۔

ہم خدا کو بھی اس کے ناموں، اس کے کاموں اور اُس کی صفتوں ہی سے جان سکتے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں (عرب کے جاہلوں) کو اسی نصابِ انسانی کے مطابق تعلیم دی ..... تعلیمِ محمدیؐ ..... نے آگاہ کیا۔ کہ خدا کے اسماء وصفات کی کوئی حد نہیں اس کو سب ہی اچھے ناموں سے پکارا جا سکتا ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط اَيًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ط (اسرائیل-۱۲)

کہدو (اے پیغمبر) کہ (خدا کو) اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو، سب اچھے نام اُسی کے ہیں۔

..... آپؐ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں۔ اور اس کی باتوں کی کوئی انتہا نہیں۔ آپؐ نے یہ دعاء سکھائی، "اے خداوند تیرے ہر اس نام کے وسیلہ سے، جو تو نے اپنا رکھا، یا اپنی کتاب میں اتارا یا کسی مخلوق کو سکھایا، یا اپنے لئے اپنے علم غیب میں اسکو چھپا رکھا، میں تجھ سے مانگتا ہوں۔"

حضرت عائشہ صدیقہؓ کو یہ الہامی دُعا تعلیم ہوئی۔ "خداوندا! میں تیرے سب اچھے ناموں کے وسیلہ سے جن میں سے کچھ کو ہم نے جانا اور جنکو نہیں جانا تجھ سے درخواست کرتا ہوں" .....

الغرض تمام اچھے اور کمالی نام اسی کیلئے ہیں۔ اور اسی کو زیبا ہیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ نہیں ہے کوئی معبود، لیکن وہی اللہ،

الحُسْنٰی (طٰہٰ-۱) اسی کیلئے ہیں سب اچھے نام،
بڑائی کا ہر نام، اور خوبی کا ہر وصف اسی ذات بے ہمتا کیلئے ہے
خواہ اس کو خدا کہو، یا اللہ کہو، لغت اور زبان کا کوئی فرق اسمیں خلل انداز
نہیں، ...... لیکن مشرکوں کی طرح اس کو ایسے ناموں سے نہ پکارو، جو
اس کے کمال اور بڑائی کے منافی ہیں، اور بتوں اور دیوتاؤں کے
ناموں سے بھی اس کو یاد نہ کرو،

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ (اعراف-۲۲)

اور اللہ ہی کیلئے ہیں سب اچھے نام، اس کو ان ناموں سے پکارو، اور اُن لوگوں سے علیحدہ رہو، جو اس کے ناموں میں کجی کرتے ہیں۔

تعلیم محمدی کا صحیفۂ وحی اللہ تعالیٰ کے تمام اوصاف حمیدہ اور اسمائے
حسنیٰ سے بھرا ہوا ہے۔ بلکہ اس کا صفحہ صفحہ خدا کے اسماء وصفات
کی جلوہ گریوں سے معمور ہے۔ قرآن کریم کا کم کوئی ایسا رکوع ہوگا جس کا
خاتمہ خدا کی توصیف اور حمد پر نہ ہو۔ اور یہ تمام اوصاف اور نام
اس عشق و محبت کو نمایاں کرتے ہیں۔ جو اس محبوب ازل اور
نور عالم کے ساتھ قرآن کے ہر پیرو کے دل میں ہونا چاہیئے۔ ......"

(سیرت النبی ص۴۱۹ تا ص۴۹۶ ج ۴ ملا)

صفات الٰہیہ کا عقیدہ اسلام میں نرا نظریہ ہی نہیں، بلکہ الٰہی اسماء وصفات
کے کچھ لازمی نتائج وتقاضے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہر اسم پاک کی خاص صفت ہے

اور اسکی یہ صفت 'ظہور' چاہتی ہے، اسکا خاص 'تقاضا' و تجلی ہے۔ یہ تقاضا و تجلی ایسے فعلِ الٰہی کو چاہتی ہے۔ جس میں وہ خاص اسم و صفت جلوہ گر ہو۔ مثلاً اللہ تعالیٰ 'خالق' ہیں۔ ان کی صفتِ خلق کا تقاضا ہے کہ وہ 'مخلوق' کو پیدا فرمائیں۔ گویا اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق کی تجلی کا ظہور 'مخلوق' ہے۔ وہ 'رازق' ہیں انکی رزاقیت ایسی مخلوق کو چاہتی ہے جسے وہ رزق دے۔ وہ 'رب' ہیں انکی 'ربوبیت' کا تقاضا مخلوق کی پرورش کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ 'الملک' ہیں، اور ان کی بادشاہی 'مملکت' حکمرانی، تدبیر، تصرف، نفاذِ احکام، عدل و نظم، ثواب و عتاب اور دگر امورِ شاہی کی متقاضی ہے وہ 'حکیم' ہیں۔ ان کا ہر فعل پُر حکمت ہے۔ وہ 'حمید و مجید' ہیں۔ وہ محامد و صفات جمیلہ کا ظہور انسان میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور ان صفات کے ذریعہ اسے عزّ و شرف بخشتے ہیں، وہ غفور، عفو ہیں۔ وہ گناہوں کے صدور کے بعد اس کو اپنی مغفرت سے بخشنا چاہتا ہے، اور عفو و درگذر کے مناظر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ غرض ان کی ہر 'صفت' و ہر 'نام' اپنے ظہور کا طالب ہے۔ اور اسماء و صفات کا یہ 'ظہور' اور اسکے 'آثار' 'خلق و امر' میں برابر ساری و طاری ہیں۔ اور خاصانِ خدا کے اس قول کا کہ 'عالم' مظہر صفاتِ حق ہے۔ یہی مدعاء ہے۔ جملہ مخلوقات میں ان ہی کے اسماء و صفات و افعال کی جلوہ گری ہے۔

انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس بنا پر حکمت الٰہی نے اسے اپنی صفات و شیئون کا مظہر اتم بنایا ہے۔ 'خلق و امر' کی نیرنگیاں اس 'عالم اصغر' میں جمع فرما کر اسے اپنی 'خلافت' کا سزاوار بنایا۔ اور جملہ کائنات میں اسے اپنی 'نیابت' کیلئے چنا، اور 'عبدیت تامہ' اور 'معرفت خاصہ' سے اسے نوازا، اور مخلوقات

سے استفادہ کی صلاحیتیں اس میں رکھیں۔ اور اپنی ذات عالی سے انتفاع وقربت کے طریقے اِس پر کھولے۔

حضرت سید الملتہ قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وحی کی زبان سے ..... یہ نکتہ سوجھایا۔ کہ انسان اس عالم خلق میں تمام مخلوقات سے اشرف ہے اور وہ اس دنیا میں خدا کی نیابت کا فرض سرانجام دینے کیلئے آیا ہے قرآن کی ابتدائی سورہ میں آدمؑ کی خلافت کا قصّہ محض داستان نہیں بلکہ انسان کی اصلی حیثیت کو عیاں اور نمایاں کرنے والی تعلیم کا اولین دیباچہ ہے۔ اس کو فرشتوں کا مسجود بنانا گویا تمام مخلوقات کا مسجود بنانا تھا۔ اس کو تمام اسماء کا علم عطا کرنا گویا تمام اشیاء کو اس کے تصرف میں دینا تھا۔ وہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کے فرمان کی رو سے اس عالم میں خدا کا نائب ہے۔ اور اسکا سر خلافتِ الٰہی کے تاج سے ممتاز ہے، کروڑوں مخلوقاتِ الٰہی میں خدا کی امانت کا حامل وہی منتخب ہوا، یہ منصبِ اعلٰی نہ فرشتوں کو ملا، نہ آسمان کو عطا ہوا۔ نہ زمین کے حصہ میں آیا، نہ پہاڑ اس کے مستحق قرار پائے، صرف انسان ہی کا سینہ تھا جو اس امانت کا خزینہ دار ہوا۔ اور اِسی کی گردن تھی جو اس بوجھ کے قابل نظر آئی فرمایا:۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی	ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر، اور زمین
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ	پر، اور پہاڑوں پر پیش کی تو سب

فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط (احزاب - ۹)

نے اس بار (امانت) کے اٹھانے سے انکار کیا، اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔

وحیِ محمدیؐ نے انسان کا رتبہ یہ بتایا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بزرگیوں سے سرفراز فرمایا عالمِ مخلوقات میں برتر بنایا اور انعام و اکرام سے معزز کیا ہے

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل - ۷)

ہم نے آدمؑ کی اولاد کو عزت دی، اور ہم نے خشکی اور تری میں ان کو سواری دی، اور ستھری چیزوں کی ان کو روزی بخشی اور اپنی بہت سی پیدا کی ہوئی چیزوں پر ان کو فضیلت عطا کی۔

انسان ہی وہ مخلوق ہے۔ جو سب سے معتدل قویٰ اور بہترین اندازہ کیساتھ دنیا میں پیدا ہوئی۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (تین - ۱)

البتہ ہم نے انسان کو بہتر اندازہ پر پیدا کیا۔

یہاں تک کہ انسان خدا کی صورت کا عکس قرار پایا۔ متعدد حدیثوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "خدا نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔" ..... ان حدیثوں کا یہ مطلب نہیں۔ کہ انسان کی طرح خدا کی کوئی خاص جسمانی شکل ہے۔ اور آدم کی شکل اس کی نقل ہے۔ کہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ق بلکہ یہ مطلب ہے۔ کہ انسان میں خدا کی صفات کی ایک دھندلی سے جھلک موجود ہے۔

علم قدرت، حیات، سمع، بصر، ارادہ، غضب، رحم، سخا وغیرہ کی صفات کی ناقص مثالیں اس کے اندر اللہ نے ودیعت رکھی ہیں۔ اور چونکہ انسان کے اعضاء میں اس کا چہرہ اس کی شخصیت کا آئینہ دار اور اس کے اکثر حواس کا مصدر ہے۔ جن سے اس کے تمام اوصاف کا ظہور ہوتا ہے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کے اعضا میں اسی کو فیضِ رحمانی کا مورد ظاہر کیا۔" (سیرت النبی ۴۸۱ تا ۴۸۲ ج ۴)

دوسری جگہ مزید تشریح فرماتے ہیں :-

"گذر چکا ہے۔ کہ قرآن کا پہلا سبق یہ ہے کہ بحکم اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (بقرہ-۴) آدم کا بیٹا زمین میں خدا کا خلیفہ اور نائب بنایا گیا ہے۔ خلیفہ اور نائب میں اصل کے اوصاف و محامد کا پرتو جتنا زیادہ نمایاں ہوگا۔ اتنا ہی وہ اپنے اندر اِس منصب کا استحقاق زیادہ ثابت کریگا۔ اور نیابت کے فرائض زیادہ بہتر ادا کر سکے گا۔ یہانتک کہ اِس میں وہ جلوہ بھی نمایاں ہوگا۔ جب وہ سراپا خدائی رنگ میں رنگ کر نکھر جائے گا۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (بقرہ-۱۶) خدا کا رنگ اور خدا کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے۔

یہ حدیث اوپر گذر چکی ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ، خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ اور ساتھ ہی اس کی تشریح بھی گذری ہے۔ کہ اس "صورت" سے مقصود جسمانی نہیں بلکہ معنوی

شکل وصورت ہے۔ یعنی یہ کہ خدا نے انسان میں اپنی صفاتِ کاملہ کا عکس جلوہ گر کیا ہے۔ اور اُن کے قبول کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ اور ان میں حدِ بشری تک ترقی کی استعداد بخشی ہے اور انسان کو اخلاق وصفات میں ملاءِ اعلیٰ سے تشبّہ اور ہمشکلی کا جوہر مرحمت فرمایا ہے۔ اور یہی صوفیہ اور خاصانِ خدا کے اس مقولہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ (خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو۔) کا مطلب ہے۔ حدیث میں یہی مفہوم بروایت طبرانی ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ "حُسن الخُلق خلق اللّٰہ الاعظم"

حسن خلق خدا کا خلق عظیم ہے۔" (سیرت النبی صفحہ ۵۱۶، صفحہ ۵۱۷ ج ۶)

اس کا مدعا یہ ہے کہ بقول حضرت سید الملۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

" (اللہ تعالیٰ) کے محامد واوصاف اخلاقِ انسانی کا معیار ہیں۔ ان اوصاف کو چھوڑ کر جو اس ذوالجلال کے لئے خاص ہیں۔ اور جو بندہ کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ ہیں۔ بقیہ اوصاف و محامد انسان کیلئے قابل نقل ہیں، کہ وہ خدا کے محامد واوصاف سے دور کی نسبت رکھتے ہیں۔ اس لئے انسان پر فرض ہے کہ اگر وہ خدا سے نسبت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ تو اپنے اندر اسکے محامد و اوصاف سے نسبت پیدا کرے اور اُن کو خوبیوں کا انتہائی معیار جان کر اُن کی نقل اور پیروی کی خواہش کرے۔ محامدِ الٰہی گویا استادِ اعلیٰ کی وصلی ہے۔ جس کو دیکھ کر شاگرد کو اپنے خط کی خوبی میں ترقی کرنی چاہیئے۔ اس لئے انسان کو

ہر حرف کے لکھنے (محامد الٰہی کی نقل اتارنے) میں ایک نظر استاد ازل کی وصلی پر ڈال لینی چاہیئے تاکہ معلوم ہو۔ کہ اسکی ذاتی مشق کہانتک اصل وصل کے مطابق ہے (سیرت النبی صفحہ ۵۱۹ ج ۴)

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ محامد واوصاف الٰہی کی نقل بندہ کو ذاتِ حق عزاسمہ سے کسی قسم کی (العیاذ باللہ) برابری عطا نہیں کر دیتی۔ کہ ایسا گمان سراسر شرک و زندقہ ہے۔ بلکہ صفات الٰہی کا یہ ہلکا سا انعکاس بندہ کو ذات باری تعالیٰ سے ایک ادنیٰ درجہ کی مناسبت عطا کر دیتا ہے۔ حضرت سید الملۃ نور اللہ مرقدہ ارقام فرماتے ہیں :۔

"یہ بات ذہن میں رہے کہ کوئی مخلوق خالق تعالیٰ کی کسی صفت میں برابر کی شریک نہیں ہو سکتی، ایسا سمجھنا سراسر شرک ہے۔ بات اتنی ہے کہ بندہ کے جس وصف کو خدا تعالیٰ کی جس صفت سے مناسبت ہوتی ہے اس پر اس صفت کا اطلاق مجازاً کر دیتے ہیں۔ جیسے خدا کے علم کے سامنے بندہ کے علم کا مرتبہ اتنا بھی نہیں ہے جتنا سمندر کے سامنے قطرہ کا ہے۔ مگر خدا کی اس صفتِ علم کیساتھ بندہ کے اس وصف کو بھی علم کہہ دیتے ہیں، حالانکہ حقیقی صفتِ علم خدا میں ہے بندہ میں نہیں۔ لیکن چونکہ خدائے تعالیٰ اپنی صفتِ علم سے بندہ میں ایک انکشافی شان پیدا کر دیتا ہے۔ اسلئے بندہ کی اس ادنیٰ انکشافی شان کو بھی علم کہہ دیتے ہیں۔ ورنہ درحقیقت ان دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں، یہی حال بندے کے دوسرے صفات اور اوصاف کے اشتراک کا ہے اسلئے بہت سے اہل حق اور اہل تحقیق کے نزدیک ان دونوں میں اوصاف کا اشتراک اشتراک بادنیٰ مناسبت ہے اور بس لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَّهُوَ

السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (شوریٰ۔ ۲) سیرت النبی جلد ششم ص۲،۳)

بہرحال اسمائے الٰہیہ اور صفاتِ ربانی کا ظہور گو وہ با دنیٰ مناسبت ہو انسان کی ذات سے ہوتا ہے اور دیگر مخلوقات کی نسبت سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اسلئے انسان کو مظہرِ صفات الٰہی کہتے ہیں۔ حضرت والا اقدس سرہٗ ایک مسترشدِ خاص کو لکھتے ہیں کہ :-

"اس (حدیث شریف ان اللہ خلق ادم علی صورتہ) کی بہترین توجیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنے اسماءِ حسنیٰ کا مظہر بنایا ہے" (تذکرہ سلیمان ص۴۲۷)

اور اسکا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی صفات سے محبت ہے اور وہ ان صفات کا ظہور جس ذات میں پاتا ہے۔ اس صفت کی وجہ سے اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ علامہ ابن قیم نے خوب لکھا ہے :-

وھو سبحانہ یحب موجب اسمائہ وصفاتہ	اللہ سبحانہ اپنے اسماء وصفات کے موجبات ومظاہر کو پسند فرماتا ہے۔
فھو علیمٌ یحب کل علیم	وہ علیم ہے ہر علم والے کو محبوب رکھتا ہے
"جوادٌ یحب کل جواد وترٌ"	سخی ہے ہر سخی کو پیار کرتا ہے 'طاق' ہے
یحب الوتر "عفو یحب العفو	طاق کو پسند کرتا ہے۔ وہ 'عفو' ہے معافی
واھلہ" حییٌ " یحب الحیاء	اور معاف کرنیوالوں سے محبت رکھتا ہے
واھلہ" برٌ یحب الابرار	وہ حیادار ہے حیا اور حیا والوں کو چاہتا ہے
	بَر ہے نیکوکار اسے پیارے ہیں
"شکورٌ یحب الشاکرین" "صبورٌ	'شکور' ہے شکر گذاروں سے اسے محبت ہے
یحب الصابرین، "حلیمٌ	'صبور' ہے صبر والے اسے پسند ہیں۔ حلیم ہے

یحب حلیم" (مدارج السالکین صفحہ ۲/۴۲۰) بردباری کو پسند فرماتا ہے۔

حضرت سید الملۃ قدس سرہ نے سیرت النبی (چہارم و ششم) میں ان مباحث پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

غرض صفات الٰہیہ کا انعکاس و ظہور انسان میں مختلف صورتوں اور نوعیتوں سے ہوتا ہے۔ بقول حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ (اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کی چند قسمیں ہیں)، جلالی، کمالی، تنزیہی اور اجمالی۔ صفاتِ جلالی جو کبریائی عظمت شہنشاہی اور بڑائی کے اوصاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا مخلوقات انکی مستحق نہیں اور نہ یہ اوصاف بندگی و عبودیت کے رتبہ کے مناسب ہیں۔ ان کا انعکاس یہ ہے کہ بندوں میں انکے مقابل کے صفات پیدا ہوں، یعنی عاجزی، تواضع، فروتنی، اور خاکساری اسلئے ترفع، تکبر اور بڑائی کا اظہار منع ہے۔ اور اسی لئے آدمؑ جس نے فروتنی اختیار کی اور عجز و قصور کا اعتراف کیا، وہ مغفرت کے خلعت سے سرفراز ہوا اور شیطان جس نے ترفّع اور غرور ظاہر کیا دائمی لعنت کا مستحق ٹھہرا۔

اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ (بقرہ۔۴) اس (شیطان) نے (آدم کے سجدہ سے) انکار کیا اور غرور کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔

قرآن پاک میں ہے، کہ بڑائی اور کبریائی صرف خدا کیلئے ہے اس کے سوا اور کوئی اسکا مستحق نہیں۔

وَلَہُ الْکِبْرِیَآءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (جاثیہ۔۴) اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لئے بڑائی ہے۔

..... اَلْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ (حشر۔۲) اسی کی شان ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ

اپنی عزت وجلال اور قوت وجبروت کا فیضان بعض بندوں اور امتوں پر نازل کرتا ہے۔ اور وہ ان کو طاقت اور قوت اور بادشاہی عطا کرتا ہے۔ مگر اس نوازش کے بعد بھی نیک بندوں اور صالح امتوں کا فرض یہی ہے۔ کہ عین اسوقت جب ان کے دست و بازو سے قوتِ حق اور ربانی جاہ وجلال کا اظہار ہو رہا ہو۔ ان کی پیشانیاں فرطِ عبودیت سے اس کے آگے جھکی ہوں۔ اور سرِ نیاز اظہار بندگی کیلئے اُس کے سامنے خم ہوں کہ عزّت وجلال خاص خدا کی شان ہے جس کا فیضان رسولؐ پر ہوا، اور رسول کی وساطت سے مومنوں پر ہوا، یہ ترتیب خود قرآن میں ملحوظ رکھی گئی ہے۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (منافقون-۱)

اور عزت خدا کیلئے ہے اور اسکے رسول کیلئے اور مومنوں کیلئے ہے

...... خدا کی صفاتِ کمالی میں سے وحدانیت اور بقائے ازلی وابدی کے سوا کہ ان سے تمام مخلوقات اور ممکنات طبعاً محروم ہیں۔ بقیہ اوصاف سے انسان مشرف ہوتا ہے۔ صفات تنزیہی ...... سے بھی مخلوقات تمامتر محروم ہے۔ ان کی تنزیہیہ یہی ہے۔ کہ وہ خدا کے عصیان، نافرمانی اور گنہگاری کے عیب سے بری اور پاک ہوں۔

خدا کے صفاتِ جمالی وہ اصلی اوصاف ہیں۔ جن کے فیضان کا دروازہ ہر صاحب توفیق کے لئے حسب استعداد کھلا ہوا ہے۔ ان صفات کا سب سے بڑا مظہر عفو و درگذر ہے ...... قرآن کہتا ہے کہ "تم دوسروں کو معاف کرو کہ خدا تم کو معاف کرتا ہے" ...... ایک دفعہ عہد نبوت میں بارگاہ عدالت قائم تھی ایک مجرم کو سزا دیجا رہی تھی۔ سزا کا منظر دیکھ کر حضورؐ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ ادا شناسوں

نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ :-

امام تک معاملہ پہنچنے سے پہلے ہی اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا کرو۔ خدا معاف کرتا اور عفو و درگذر کو پسند کرتا ہے۔ تو تم بھی معاف اور درگذر کیا کرو۔ کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ خدا تمہیں بھی معاف کرے۔ وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے (مستدرک للحاکم کتاب الحدود)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ...... فرمایا:- خدا جمیل ہے۔ جمال کو پسند کرتا ہے وہ سخی ہے۔ سخاوت کو پسند کرتا ہے۔ وہ صاف ستھرا ہے۔ صفائی اور ستھرے پن کو پسند کرتا ہے ..... اخلاق عالیہ سے محبت اور بد اخلاقیوں سے نفرت رکھتا ہے۔" ..... "خدا نرمی والا ہے نرمی کو پسند کرتا ہے .... خدا پاک ہے پاک ہی کو قبول کرتا ہے۔"

رحمت و شفقت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے۔ مگر خدا کی رحمت و شفقت کے وہی مستحق ہیں۔ جو دوسروں پر رحمت و شفقت کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔" "رحم کرنے والوں پر وہ رحم کرنے والا بھی رحم کرتا ہے۔ لوگو! تم زمین والوں پر رحم کرو، تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا ...... رحم کی جڑ رحمان ہے۔ خدا فرماتا ہے۔ کہ اے رحم، جو تجھکو قطع کرے گا۔ میں اس کو قطع کرونگا۔ جو تجھکو ملائیگا میں اس کو ملاؤنگا" ..... یہ نصیحت بھی فرمائی کہ:" جو بندہ دوسرے بندہ کی پردہ پوشی کرے گا۔ قیامت میں اس کی پردہ پوشی خدا کرے گا" یہ بھی تعلیم دی گئی ہے۔ کہ:

"جب تک تم اپنے بھائی کی مدد میں ہو۔ خدا تمہاری مدد میں ہے" ....

آپؐ نے فرمایا کہ" خدا بھی غیرت والا ہے۔ اور مومن بھی غیرت والا ہے

اور خدا کی غیرت یہ ہے کہ اس نے اپنے مومن پر جس بات کو حرام کیا ہے اگر کوئی اسکا ارتکاب کرے تو وہ اس پر خفا ہو۔

اللہ تعالیٰ ظلم سے پاک ہے...... اس لئے اس کے بندوں کا فرض ہے کہ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی زبان سے اس کی عملی تعلیم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا...... اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے۔ اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے۔ تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا

پاکیزگی اور لطافت خدا کی صفتیں ہیں۔ اسلئے خدا کے ہر بندہ کو بھی پاک وصاف رہنا چاہیئے۔ آپ نے فرمایا۔ " خدا پاکیزہ ہے۔ پاکیزگی کو پسند کرتا ہے اور پاک وصاف ہے۔ پاکی اور صفائی کو پسند کرتا ہے۔ تو تم پاک وصاف رہا کرو، یہودیوں کی طرح گندے نہ بنو۔ (سیرت النبی ج ششم ص۵۱۷ تا ص۵۲۳ ملخصاً)

غرض اللہ تعالیٰ اپنی صفات کا انعکاس بندوں میں دیکھنا پسند کرتا ہے۔ اور ان کا ظہور انسانی اخلاق میں پسند فرماتا ہے۔ اس بنا پر اسلامی نظریہ اخلاق کی بنیاد تمام تر صفات باری تعالیٰ کے عقیدہ اور معرفت پر ہے۔ جس کی تشریح انشاء اللہ تعالیٰ اخلاق کے ذیل میں آئے گی۔

صفات الٰہیہ کا استحضار اور ان سے استفادہ

سالک کیلئے صفاتِ الٰہی میں سے ہر صفت کی معرفت اور اس کا استحضار قوت و طاقت کا لامتناہی خزینہ ہے۔ جس سے ہر آن اس کی تربیت ہوتی ہے۔ اور اس کے ایمان ویقین کی قوت بڑھتی ہے۔ اور اس میں براہِ راست اس صفت سے استفادہ کی صلاحیت پیدا ہوتی اور بڑھتی ہے۔ صفات الٰہیہ کا مشاہدہ اسے مخلوق سے ہٹا کر خالق میں شاغل کر دیتا ہے۔ اور صفات الٰہیہ کی نیرنگیاں اسے کائنات کے ہر ذرہ، تصرفات کونی کی ہر حرکت وسکون میں نظر آتی ہیں کائنات کے تغیّر وتبدّل، احوال وظروف کی تبدیلی میں اسے مصرّف الامور کا غیر مرئی ہاتھ ہر آن دکھائی دیتا ہے۔ وہ اشیاء سے نہیں دیکھتا۔ خدا سے دیکھتا ہے۔ وہ مخلوق کو نہیں پاتا خالق کی جلوہ سامانیاں صفات کے ظہور کی رنگا رنگی میں مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کے لئے پورا عالم مرآۃِ صفاتِ حق بن جاتا ہے۔ جس کا وجود وبقا، قیام وظہور خالق وقیّم حیّ وقیّوم ذات ستودہ صفات سے ہے اس عالم میں جو کچھ ہوتا ہے۔ اسے وہ ذاتِ حق سے

کا تعین ہوتا پاتا ہے۔ فاعلیتِ حقہ کی حقیقت اس پر مستور ازل کی کارفرمائی کے راز کو کھول دیتی ہے 'مجاز' کے آئینہ میں 'حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے۔

بقول سید الملۃ قدس سرہٗ

دیدۂ دل اگر ہوں باز راز رہے نہ راز میں

جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینۂ مجاز میں

اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات کا ظہور و تاثر عارف کو ہر ایک سے بے نیاز وبیگانہ اور ذات سرمدی کا نیاز مند کر دیتا ہے وہ اس کے جلوؤں میں مستور اور کیفِ الٰہی میں مسرور و مخمور ہو جاتا ہے۔ بقول عارف شیرازیؒ:۔

ما در پیالہ عکسِ رخ یار دیدہ ایم — اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

خدا آشنا عارف جو ہر ایک سے ٹوٹ کر اسکا ہو جاتا ہے اور "وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا" کی حقیقت جسکا حال بن جاتی ہے، اسکی تربیتِ روحانی وجسمانی ذاتِ جمیل ومتعال اپنی بارگاہ خاص سے کرتا ہے۔ اور صفات باری تعالیٰ کی تجلیات خاصہ اسکی ترقی وقرب کا ذریعہ بن جاتی ہیں ارشاد باری "یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَاءُ" اور "یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَاءُ" سے بھی ادھر اشارہ پایا جاتا ہے۔

صفات الٰہیہ کا انعکاس جب بندۂ مومن کے قلب پر ہوتا ہے۔ تو اولاً اس پر اپنی ہیچ میرزی اور فقر واحتیاج کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ اور معاً وہ اپنی ضروریات وحاجاتِ روحانی وجسمانی کو ایک اللہ تعالیٰ کی ذات میں منحصر پانے لگتا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ ج وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ (فاطر-۸) کی حقیقت اس پر کھل جاتی ہے۔ عبدیت کاملہ اور فقر تامہ اس کا حال بن جاتا ہے۔ اور وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔ رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ۔

اب سالک پر تربیت کا وہ صفاتی رستہ کھلتا ہے جس کو اصطلاح میں "سیر فی اللہ" کہتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفاتِ حاکمیت، حکمت، خلق، ملکیت، رزاقیت اور قدرت وغیرہ کا یقین و اذعان استحضار و مشاہدہ اس میں تشریعی و تکوینی امور میں اوامر الٰہیہ کی پابندی، توکل و تفویض صبر و شکر اور جملہ فضائلِ اخلاق پیدا کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ سے استفادہ کی راہ اس پر کھل جاتی ہے۔ معرفت الٰہی کی منازل طے ہونے لگتی ہیں۔ اور احوال خاصہ اور مقامات سے اسے نوازا جاتا ہے۔

عارف کیلئے اللہ تعالیٰ کی ہر صفت اور اسکی تجلّی استفادہ اور تربیت کا مستقل ذریعہ بن جاتی ہے۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے ایک ملفوظ سے اندازہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا یقین و مشاہدہ کس طرح بندۂ مومن کی زندگی کو متأثر کرتا ہے۔ اس طویل ملفوظ میں صفت "بصیر" کے مراقبہ کے اثر کی تشریح فرمائی گئی ہے۔ وضاحت کیلئے ملفوظ مبارک نقل کرتا ہوں:

"مسلمانوں کے عقیدہ میں ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے اللہ تعالیٰ ہر حال میں دیکھتے ہیں۔ "لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ" یعنی دنیا میں کوئی شخص خدا کو نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ سب آنکھوں کو دیکھ رہے ہیں۔ ارشاد ہے۔ أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللَّهَ يَرَىٰ۔ ان آیتوں اور بہت سی حدیثوں سے معلوم ہوا۔ کہ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو دیکھ رہے ہیں۔ کوئی شخص کتنے ہی رات کے اندھیرے میں ہو، کوئی اسے نہ دیکھ رہا ہو، مگر اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے چھپ جاؤ، ممکن نہیں، جس مسلمان سے پوچھو یہی عقیدہ رکھتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہر آن اور ہر جگہ ہے۔ لیکن بات یہ ہے۔ کہ یہ عقیدہ حال بن کر ہم پر طاری

نہیں ہوا، اگر یہ حال ہو جائے تو کوئی گنہگار گناہ نہیں کر سکتا، جیسے پولیس کی موجودگی کے وقت جرم کی ہمت نہیں ہوتی۔ اگر یہ عقیدہ ہمارا حال بن جائے تو ہم سے کوئی برائی سرزد نہ ہو، اگر ہم یہ سمجھیں کہ لوگوں سے چھپ چھپ کر گناہ کریں۔ اور ان کے دیکھنے اور شہادت سے بچ جائیں اور اسطرح سزائے الٰہی سے مامون ہو جائیں، تو یہ غلط ہے۔ ہم لوگوں سے تو چھپ اور بچ سکتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ سے نہیں بچ سکتے۔ کہ وہ ہر آن و ہر جگہ موجود اور ہمیں دیکھ رہا ہے۔ انسان اگر اس چیز کو اپنے اندر پیدا کر لے تو تمام برائیوں کا سدباب ہو جائے۔ پس معلوم ہوا۔ کہ ہر قسم کی برائیوں سے بچنا ہو تو اس عقیدہ کو دل کے اندر جمالیا جائے۔

نیت کے بغیر نماز نماز ہے، نہ روزہ روزہ، نیت کے استحضار سے عبادت عبادت بنتی ہے۔ پس انسان ہر عمل کی نیت کرتے وقت یوں سمجھ لے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حاضر وناظر ہیں۔ اور کڑی نگہبانی فرما رہے ہیں۔ اسطرح اگر اندھیری رات میں چٹان کے نیچے چیونٹی چل رہی ہے۔ تو اسے بھی جانتے ہیں، اگر یہ حال پختہ ہو جائے، تو انشاء اللہ تعالیٰ گناہ کا صدور نہ ہو سکے گا۔

انسان کے شہوات یا جذبات جب ایمان پر غالب آجاتے ہیں تو جرم ہوتا ہے۔ اسلئے ضرورت ہے کہ اس عقیدہ کو اسقدر مستحضر کر لیا جائے۔ اور اللہ تعالیٰ کے حاضر وناظر ہونے کا دھیان اسطرح غالب ہو جائے کہ شہوات وجذبات کی بنا پر گناہ سرزد ہونے نہ پائے، تمام مسلمان نماز کی نیت کرتے ہوئے اس چیز کو مستحضر کریں، کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے ہیں۔ اور ہمارے قلب کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ

استحضار اسی طرح نمازوں میں بڑھتا جائے گا، اور ایک دن اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا ہو جائے گا۔ تو پھر نہیں جائے گا۔ اور اس حاضر و ناظر ہونے کے یقین کی بنا پر انسان برائی نہیں کر سکے گا۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے :

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ

نماز اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر جاننے کے دھیان کو حاصل کرنے کا بڑا وسیلہ ہے۔

جو لوگ اس سے زیادہ کی ہمت رکھتے ہوں، بزرگوں نے ان کے لئے اور کئی طریقے بتائے ہیں، جن میں ذکر اور مراقبہ بھی ہے۔ کچھ دیر آنکھیں بند کرلے اور سوچے اور تصور کرے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ میرے دل کو دیکھ رہے ہیں تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کی ساری زندگی پر اس کا اثر پڑے گا۔ مراقبہ کا مطلب نگرانی ہے۔ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کو نگران سمجھ کر دھیان کیا جائے گا۔ تو ہر وقت اللہ تعالیٰ سامنے رہیں گے، اور یہ تصور اسقدر غالب آجائے گا کہ برائی کا صدور جاتا رہے گا۔ ایسے تو ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں۔ عیاں اور پوشیدہ، اس سے چھپ نہیں سکتے، قرآن میں ہے ”دو سرگوشی کرنیوالوں میں تیسرا وہ ہوتا ہے۔“ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ، جب اللہ تبارک و تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں۔ تو اس عقیدہ کا حال اپنے اوپر کیوں نہ طاری کرلیا جائے، اگر اس عقیدہ کو پختہ کرلیا جائے تو انسان گناہوں سے بری ہو جائے گا۔ عقیدہ کو عقیدہ کی حد تک نہ رکھیں، بلکہ اپنے پر اسے طاری کرلیں، نماز بے التفاتی سے نہ پڑھیئے۔ بلکہ یہ تصور کیجئے۔ کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں۔ رکوع و سجود و تلاوت کے وقت یہی دھیان ہو۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کے وقت یہ تصور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہیں۔ ان کی تعریف کر رہے ہیں۔ گناہوں کا ارتکاب اس لیئے ہوتا ہے۔ کہ عقیدہ مستحضر نہیں رہتا، صحابہ کے حال میں لکھا ہے کہ انہیں اکیلے میں بھی برہنہ نہاتے ہوئے حیا آتی تھی۔ جبکہ انسان برہنہ ہو سکتا ہے۔ مگر اللہ تبارک وتعالیٰ کا دھیان کر کے ان کو اس سے شرم آتی تھی۔ صحابہؓ کا یہ حال اس بنا پر تھا کہ اللہ تعالیٰ کا دھیان اسقدر غالب و مستولی ہو گیا تھا۔ کہ تنہائیوں میں اپنے لیئے برہنگی پسند نہیں کرتے تھے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہر شخص کے گناہوں کو جانتے ہیں۔ لیکن اس پر فرشتوں کی شہادت قیامت میں پیش کریں گے۔ جن اعضاء کے لیئے ہم گناہ کرتے ہیں وہی ہم پر گواہی دیں گے اور یوں کہیں گے۔

" اَنْطَقَنَا اللّٰہُ الَّذِیْ اَنْطَقَ کُلَّ شَیْءٍ۔ پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ شراب خانہ کی طرف گیا تھا۔ بری نگاہ کی آنکھ گواہی دے گی۔ آج ہم آنکھ کی لذّت کیلئے گناہ کر رہے ہیں۔ مگر کل وہی آنکھ ہمارے خلاف گواہی دے گی۔ ہاتھ سے پرایا مال چرایا، ہاتھ اس کی گواہی دے گا۔ غرض جسم کا ایک ایک عضو جس کی خواہش اور لذّت کیلئے ہم گناہ کر رہے ہیں۔ ہمارے خلاف شہادت دے گا۔ اللہ تعالیٰ تو دیکھ ہی رہے ہیں۔ لیکن یہ ہاتھ پاؤں بھی تو ہمیں نہیں چھوڑتے۔ ان کو تو چھوڑ کر ہم عمل بھی نہیں کر سکتے ہمارا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کی خفیہ پولیس ہے، اور کل وہ ہمارے مخالف گواہ ہوں گے۔ سو افسوس ہے اس احمق پر جو بان کو خوش کرنے کیلئے گناہ کرے۔ اور وہ اس کے خلاف پھر گواہی دیں۔ اس لئے گناہوں سے بچنا چاہیے اور اس

عقیدہ کو حال بننا چاہیئے تاکہ گناہ سرزد نہ ہوسکیں۔

اس تشریح سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ایک صفت بصیر کا علمی دھیان و مراقبہ اور اسکے حاضر وناظر ہونے کا تصور بندھ جائے تو تنہا یہ حال انسانی زندگی کو برائیوں سے روکنے کی کتنی عظیم تاثیر رکھتا ہے۔ یہی حال دوسری صفات الٰہیہ کا ہے۔ صفت بصیر کے متعلق چند اور فوائد لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ کے حاضر وناظر جاننے کے مراقبے کی بہت تاکید فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ راقم سے فرمایا۔ "ہر وقت اللہ تعالیٰ کو حاضر وناظر جانیں۔"

ایک طالب کو ایک والا نامے میں تحریر فرماتے ہیں

"آپ کو ان اوقات میں سے جو آپ کی تعلیم سے فارغ ہوں۔ تھوڑا وقت مقرر کرکے ہر روز خواہ پندرہ ہی منٹ ہوں۔ آنکھیں بند کرکے اپنے آپ کو خدا کے سامنے سمجھکر گویا ہم دیکھ رہے ہیں۔ تصور کیجئے کہ ہم خدا کے سامنے ہیں۔

دوسرے گرامی نامہ میں اس کی مزید تشریح فرماتے ہیں۔

"اس مراقبہ سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حاضر وناظر ہونے کا جو ایمان ہے۔ وہ عملاً نمایاں ہو۔ اب آپ آگے بڑھیں۔ اب یہ کوشش کیجئے کہ نمازوں میں قائم ہو۔ کہ آپ خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہیں۔ اور وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ نیت کرتے وقت دل میں یہ توجہ کیجئے۔ کہ بندہ اب بارگاہ الٰہی میں حاضر ہے۔

اسی طالب نے ایک مرتبہ لکھا کہ "اللہ تعالیٰ کی قربت تو اس مراقبہ کی وجہ

سے سائنس سے بھی زیادہ نزدیک معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بعض کوتاہیاں ہو جاتی ہیں" تو تحریر فرمایا

"جب انسان اللہ تعالیٰ کو ایسا حاضر وناظر یقین کرتا ہے، تو اس سے ضروری اعمال صالحہ کی بجاآوری میں سستی کیونکر ہو سکتی ہے، وہ جب یقین کرلے کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں، اور ہم سے قریب ہیں تو اس کو شرمندہ ہونا چاہیئے کہ اس حالت اور اس عنایت کے باوجود اعمال صالحہ میں کوتاہی کیوں ہو، اگر پھر بھی حالت نہ بدلے تو موت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے اور یہ سوچنا چاہیئے کہ ایک دن خدا کے سامنے حاضر ہونا اور ایک ایک کا جواب دینا ہے۔ اس وقت بندہ اپنی کوتاہی کا کیا جواب دے گا۔ اور پھر دنیا کی دولت وثروت جس کی محبت میں انسان گرفتار ہے۔ کیا کام آئے گی۔ اس وقت صرف اعمال صالحہ کام دیں گے۔ اس سے خدا کا خوف پیدا ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔"

مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"کسی وقت کو مقرر کرکے اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی کے مضمون کو سوچا کیجیئے۔ اس تفکر کا اصطلاحی نام مراقبہ ہے۔ اس تصور کا اثر اعمال پر پڑے گا۔ اور ہر عمل پر اس حیثیت سے نظر پڑنے لگے گی کہ سب کچھ اس کے سامنے ہے۔ اب حق وباطل، صحیح وغلط اور جائز وناجائز پر غور کرنے کا رُخ بدل جائے گا۔ اور ہر عمل کے وقت

دل کو ٹٹولنے لگیں گے کہ میرے عمل کا قلبی مقصد کیا ہے۔ اس سے حسن نیت پیدا ہوگا۔ اور حدیث شریف کی یہ حکمت کھل جائیگی۔ الا ان فی الجسد لمضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ۔ کیا یہ بدعت ہے؟ غور کیجئے اور ہو سکے تو عمل کیجئے"

ایک طالب نے پوچھا کہ " اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے اور آپکی ذات عالی پر یقین اور حسن ظن کی کیفیت میں کس طرح ترقی ہوگی"۔ حضرت شیخ قدس سرہٗ نے جواب میں ارقام فرمایا۔ " اسطرح کہ آپ ہر روز کسی خاص سکون کے وقت میں تھوڑی دیر اس کا مراقبہ کیا کریں کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہیں اور ہر وقت ہم کو دیکھ رہے ہیں"۔

ایک صاحب نے استفساراً لکھا :۔

" اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایمان اپنا بہت کمزور ہے جو پختگی و رسوخ ہونا چاہئے وہ نہیں ہے۔ اسلئے نماز و ذکر وغیرہ میں جان معلوم نہیں ہوتی اور جو معاصی ہو جاتے ہیں ان کا سبب بھی یہی کمزوری معلوم ہوتی ہے، حصولِ تقویتِ ایمان اور اس کی حلاوت کیلئے کیا تدابیر اختیار کیجائیں ۔"

حضرت الشیخ قدس سرہٗ نے تحریر فرمایا :

" صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کے عیانی یقین کی کمی ہے آپ تنہائی میں کسی وقت خاص میں کم از کم آدھ گھنٹہ باوضو بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے پہلے استغفار کریں ۱۲ مرتبہ، پھر ۱۲ مرتبہ درود پڑھیں پھر

یہ مراقبہ کریں اور سوچیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو دیکھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے پاس ہیں۔ آپ کی ہر آواز اللہ تعالیٰ سن رہے ہیں۔ اور آپ کی ہر حالت دیکھ رہے ہیں۔ اگر آدھ گھنٹہ کا وقت نہ ملے تو دس (۱۰) منٹ پندرہ (۱۵) منٹ جس قدر وقت ہو سکے اس کو مقرر کر لیجئے۔"

اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر جاننے کا

نتیجہ

کیفیت احسان و حضور

اللہ تبارک وتعالیٰ کے حاضر وناظر جاننے کے دائمی دھیان کا نتیجہ احسان و حضور کی وہ کیفیت ہے۔ جو خاصانِ الٰہی کا سرمایۂ تسکین ہے ؎

قرب بے غیبت نماز عاشقاں — فی صلوٰۃٍ دائمونم آرزوست

خوش نمی آید نماز بے حضور — فی صلوٰۃٍ خاشعونم آرزوست

می برد بے تابیٔ دل کو بکو — بر درت صبر و سکونم آرزوست

بسکہ وزدیدہ نظر برمن فگن — نشترِ زخم درونم آرزوست

(سید الملۃ ؒ)

حضرت شیخ ؒ کا ایک اور شعر ہے

حاصل ہے یہ کیفیت ہر وقت حضوری کی — آ دل میں مرے چھپ جا اے صوت جانانہ

جب اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا مراقبہ پختہ ہو جاتا ہے۔ اور ذات باری تعالیٰ کا دھیان رسوخ حاصل کر لیتا ہے تو خود بخود حضور و احسان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور تحسین عمل کے جذبہ سے اعمال میں حسن و خوبی اور صدق و کمال پیدا ہو جاتا ہے۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

" مرتبہ احسان یہ ہے۔ کہ اعمال اس طرح ادا ہوں جیسے مزدور مالک

کے حضور میں کام کرتے ہیں۔"

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کے حاضر وناظر ہونے کا یقین اس طرح چھا جائے کہ گویا وہ بالکل سامنے ہیں اور وہ ہمارے کام کو غور سے دیکھ رہے ہیں کہ ہم اس کی بجاآوری میں کوتاہی تو نہیں کرتے، اس اذعان کا اثر یہ ہوگا۔ کہ اللہ تعالیٰ کے دھیان کی نعمت نصیب ہوگی دوسرے اعمال کو سنوار کر ادا کرنے کی کوشش کیجائیگی، کہ مالک کے سامنے مزدور کام کو بگاڑا نہیں کرتے۔ حضرت الشیخؒ ایک دوسرے مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں:-

"(حدیث احسان کا) صحیح (ترجمہ) یوں ہے ' اللہ کی عبادت ایسی کرو کہ گویا تم اس سے دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے۔"

اب خواہ ہم بادشاہ کو دیکھ رہے ہوں۔ یا بادشاہ ہم کو دیکھ رہا ہے؛ دونوں کا حاصل ایک ہے۔ کہ ہم اپنی نماز کو پورے خضوع، آداب اور انہماک کے ساتھ ادا کریں (تذکرہ سلیمان ص۲۱۱)

مراد یہ ہے کہ اپنی عبادت کو خوب سنوار کر تمام حسن وکمال اور ظاہری وباطنی احکام وآداب کے اہتمام کے ساتھ انجام دیں۔ کہ جو شخص اللہ تبارک وتعالیٰ کو گویا عیاں دیکھ رہا ہو۔ یا اس کا یقین واستحضار ہو کہ اللہ تعالیٰ خلوت وجلوت ہر حالت میں مجھے دیکھ رہے ہیں۔ وہ شخص عبادات وجملہ احکام کی بجاآوری میں ذرہ برابر بھی کوتاہی نہیں کرے گا۔ اور اپنی ظاہری وباطنی جملہ صلاحیتوں کو اپنی پوری قدرت وطاقت کے ساتھ عبادت کی تکمیل، اس کے حسنِ ادا اور اسے باحسن الوجوہ

پورا کرنے میں صرف کر دے گا۔ جیسا کہ حدیثِ احسان کی تشریح میں امام نوویؒ نے وضاحت کی ہے (صحیح مسلم مع شرح نووی ص۲۸ ج ۱) اور حدیث کیفیتِ احسان کا نام ہی بقول حضرت تھانویؒ اس لئے 'احسان' ہے کہ اس سے عبادت میں حسن و کمال پیدا ہوتا ہے۔

مرتبہ احسان کی اس دوگونہ تاثیر و دلکشی کا اندازہ عارفِ صادق یا عبدِ کامل ہی کر سکتا ہے۔ کہ عبادت کی تکمیل سے عنایاتِ رب اسکی طرف متوجہ ہوتی ہیں اور کیفیت احسان سے اسے حضور اور دھیان کی وہ کیفیت نصیب ہوتی ہے جس کی کیف انگیزیوں کے بیان سے نطق گنگ اور قلم عاجز ہے۔

'مرتبۂ احسان' کی تشریح حضرت والا قدس سرہٗ نے ایک جگہ یوں ارقام فرمائی ہے:-

"مرتبۂ احسان' اصطلاح حدیث نبوی ہے۔ جس کے معنٰی یہ ہیں کہ عبادت اس طور سے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا دل میں پورا استحضار رہے کہ وہ مجھے دیکھ رہے ہیں یا یہ کہ میں انھیں دیکھ رہا ہوں۔ (تذکرہ ص۵۱۲)

یہ کیفیت احسان ایک نعمت ہے اس لئے حضرت شیخؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ کیفیت احسان گاہے گاہے بھی میسر آئے تو بہت ہے۔ اس پر شکر کیجئے، اور ترقی کی دعاء مانگا کیجئے۔"

ایک دوسرے گرامی نامہ میں ہے:-

"حضورِ قلب کا حصول ذکر و شغل کی ترقی کے ساتھ ہوتا جائیگا۔ انشاء اللہ، قلب کو افکار سے خالی رکھنا چاہیئے۔ تاکہ اس میں

نور الٰہی بھر سکے" (تذکرہ ص ۲۷۲)

حضور کی کیفیت کا دوام بھی کم خوش قسمتوں کو نصیب ہوتا ہے حضرت والاؒ نے ایک صاحب کو لکھا۔

"جس قدر بھی حضور نصیب ہو وہ شکر کے قابل ہے۔ دوام حضور کم کسی کو نصیب ہوتا ہے۔"

لیکن اس کمی سے سالک کو ہمت پست نہ کرنا چاہیئے۔ اور استقامت سے اپنے کام میں لگا رہنا چاہیئے۔ جو کچھ عطا ہو اس پر شکر ادا کرنا چاہیئے، لیکن بعض بندگان خاص ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں قرب و حضور کی دائمی دولت نصیب ہوتی ہے۔ حضرت شیخؒ قدس سرہٗ ایک گرامی نامے میں کسی طالب کو ارقام فرماتے ہیں،

"دائم حضوری بھی انشاءاللہ تعالیٰ کبھی حاصل ہوگی۔ لیکن اس وقت بھی جو کچھ حاصل ہو جاتی ہے۔ شکریہ کے قابل ہے۔ شکر سے نعمت کی زیادتی ہوتی ہے۔"

معیت الٰہی | یہی احسان و حضور کی کیفیت راسخ ہو کر عارف کو قرب و معیتِ الٰہی کے دھیان سے شاد کام رکھتی ہے۔ اس کا دل مناجاتِ الٰہی میں مشغول اور کیفیاتِ سرمدی میں مخمور رہتا ہے اور بس یہی دل چاہتا ہے کہ ع

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

حضرت شیخؒ کا شعر ہے:-

سجدہ میں جہاں سر ہے گویا کہ ترا در ہے
کیا کیا نہ کہا تجھ سے پایا جو سراپا گوش

ایک سفر کے دوران میں حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی طبیعت بیماری کی وجہ سے پژمردہ سی تھی، عصر کا وقت تھا۔ جس جگہ قیام تھا وہاں ملاقاتیوں کا ہجوم تھا، احقر نے حضرتؒ کے آرام کے خیال سے عرض کیا، اگر خواہش ہو تو کچھ دیر باہر سیر کے لئے چلا جائے، طبیعت تازہ ہوا سے شگفتہ ہو جائے گی۔ اس کے جواب میں دلبرانہ تبسم کے ساتھ ارشاد فرمایا:۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درا
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بچمن درا

حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"معیت اور قرب تام کا یہ مطلب نہیں۔ کہ انسان اللہ تعالیٰ کی گود میں جا بیٹھتا ہے۔ بلکہ یہ حال ہے جو اہل دل ہی جانتے ہیں۔"

معیتِ الٰہی کے حصول کیلئے ایک سالک کو ارقام فرماتے ہیں:۔

"اب آپ کو 'اللہ معی' کا مراقبہ شروع کرنا چاہیئے ...... یعنی "اللہ معی" کا تصور کہ ہر وقت وہ ہمارے ساتھ ہے اور ہمارے قریب ہے۔ اسکے مضمون پر غور کیا جاتے اور اسکے مناسب آیات کا استحضار رہے جیسے وَاِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ، وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ، یا وَهُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ اور وَلَا تَخْفٰى عَلَيْهِ خَافِيَةٌ اور وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ اور نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ اور اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ اور اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ——— اِسی کیفیت کا رسوخ اصل روح ہے۔ جسکا طریقہ ذکر اور شغل۔"

مسئلہ معیت الٰہی کے متعلق مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ گرامی کو تحریر فرماتے ہیں۔

" مسئلہ معیت الٰہی میں تین قسم کی آیتیں قرآن پاک میں ہیں۔ ایک میں بدلالت قرینہ معیتِ رحمت ونصرت مقصود ہے جیسے :- اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ ۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُحْسِنِیْنَ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰہُ مَعَکُمْ، لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ، اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وغیرہ

اور دوسری وہ آیتیں ہیں، جن میں معیت علمی مقصود ہے۔ وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ، وَمَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا ھُوَ رَابِعُھُمْ وَلَا خَمْسَۃٍ اِلَّا ھُوَ سَادِسُھُمْ وَلَا اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَا اَکْثَرَ اِلَّا ھُوَ مَعَھُمْ وغیرہ

تیسری وہ آیات ہیں جن میں اطلاق ہے۔ جیسے اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ، وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ، نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ــــ

اب سوال یہ ہے۔ کہ ان آیات میں کونسا قرب اور معیت مراد ہے ایک گروہ معیت علمی کی آیتوں کے قیاس پر ان سے معیت وقرب علمی سمجھتا ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک کی ان آیتوں کا منشأ ہے ۔ وَسِعَ کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ، اِنَّ اللّٰہَ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ، وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا ،

اور بعض صاحبوں نے لغت پر اعتبار کر کے قرب ومعیت ذاتی

کومراد لیا، لیکن چونکہ قرب و معیت ذاتی کے ماننے پر بعض اشکالات پیش آتے ہیں اور وحدۃ الوجود (؟ واجب الوجود) کے بجائے بہتوں نے وحدۃ الوجود کا عقیدہ اختیار کر لیا۔ اس لئے متکلمین نے قرب و معیت ذاتی سے انکار کیا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب 'مبداء و معاد' میں اس معیت کو متشابہات میں قرار دیا ہے۔ غرض یہ ہے کہ معیت و قرب کا اجمالاً عقیدہ رکھا جائے اور اس کی تفصیل و تشریح کے پیچھے نہ پڑا جائے۔" (ماہنامہ صبح صادق لکھنو ماہ جون ۱۹۵۱ء صد ۱۵،۱۴)

بات یہ ہے کہ کنہ ذات کا ادراک ناممکن اور اس کا دھیان و تصور محال ہے کہ وہ ذات عالی وراء الورا ہے۔ اس لئے عارفین نے کہا ہے :-

کلّ ما خطر ببالك فهو هالك
والله اجل و اعلى من ذلك

نیز ؎
اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

حضرت والا قدس سرہٗ کا شعر ہے ؎
آتے ہو تصور میں بھر بھر کے نئے روپ
ان سب سے پرے سمجھیں تم کو تو یہ ایمان ہے

غرض بقول حضرت سید الملۃ قدس سرہٗ:

" وہ تو ہر چیز سے وراء الوراء ہیں"

اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی قرب ومعیت کا دھیان بے تکیف اور بے چوں اور بے چگوں ہوگا۔ عارف رومی کہتے ہیں:-

اتصالے بے تکیّف بے گمان وبے قیاس

ہست ربّ الناس باجانِ ناس

حضرت والا قدس سرہٗ ارقام فرماتے ہیں:

" تصور ذات کا نہیں ہوتا، اس کی صفات کا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کا تصور کیجئے (تذکرہ ص۵۸)

مراقبات

سلوک کی جان اللہ تعالیٰ کا ایمان اور ان کی صفات کا دھیان ہے جیسا گذر چکا۔ صفات الٰہیہ سالک کیلئے قوت وطاقت کا ایک لامتناہی و بے نہایت خزینہ ہے۔ ہر صفت اپنی خاص تجلّی میں سالک کیلئے اپنا مخصوص اثر رکھتی ہے۔ اس کا انعکاس سالک کے قلب وروح کو رنگین بناتا ہے۔ اور مختلف امراض باطنی کا ازالہ اور فضائل قلبی کا حصول صفات کے استحضار و دھیان سے ہوتا ہے۔ اسلئے اہل سلوک اور محقق مشائخ مختلف اوقات میں سالکین کو ان کے مختلف و متفاوت احوال اور استعدادوں کی بنا پر مختلف اسماء الٰہیہ اور صفات ربانی کے "مراقبات" کی تلقین کرتے ہیں۔ "مراقبہ" صفتِ حق کے رنگ کو اپنے میں لینے کا ایک عادی زینہ ہے۔ جو اپنی تاثیر و تأثر کی بنا پر خاص کیفیات و احوال کو وجود بخش کر "مقامات خاصہ" تک پہنچانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ "مراقبہ" سے قلب اس صفتِ خاص کے دھیان کا خوگر بن جاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس صفت کا استحضار اسکا حال بن جاتا ہے۔ اور اس صفت کی تجلّی کا تأثر قلب میں سما کر "یقین و ایمان" کی "زیادت" کا سبب بن جاتا ہے۔

غرض مراقبات ازدیادِ ایمان، اور اذعانِ صفات کے حصول کا ذریعہ اور استحضار و دھیان حق کی کلید ہیں۔ فضائل کے حصول اور رذائل کے ازالہ کیلئے ممدّ و معین ہیں۔

"مراقبہ کا لفظی ترجمہ" نگرانی یا نگہبانی ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے :۔

اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْباً — بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا نگہبان (نگران) ہے

اور اصطلاح میں بقول حکیم الامۃ تھانوی قدس سرہٗ :۔

" حق تعالیٰ کی ذات و صفات یا کسی مضمون کا دل سے اکثر احوال میں یا ایک محدود وقت تک اس غرض سے کہ اس کے غلبہ سے اس کے مقتضا پر عمل ہونے لگے، تدبّر تام سے متوجہ ہونا اور اس کا تصور مواظبت کے ساتھ رکھنا 'مراقبہ' کہلاتا ہے۔ جو اعمالِ مقصودہ قلب میں سے ہے۔"

اسی کی اصل اس حدیث میں ہے۔ جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس کو تلقین فرمائی تھی کہ :۔

احفظ اللہ یحفظك احفظ اللہ تجدہ أمامك ۔ (الدر المنثور للسیوطی ج۲/۶۱ بحوالہ احمد، ترمذی۔ عبد ابن حمید، ابن مردویہ، البیہقی)	اللہ تعالیٰ کا دھیان رکھ وہ تیری حفاظت و دھیان رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ کو دھیان و توجہ میں رکھ اسے اپنے سامنے پائیگا۔

مراقبات میں ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کے مراقبہ کو اہمیت دیتے تھے۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں "صفات الٰہی کا استحضار اور ان سے استفادہ" کی تحت تفصیلاً ذکر ہو چکا ہے۔

مراقبات کی افادیت کے مزید اظہار و وضوح کیلئے حضرت سیدی قدس سرہٗ کی تحریروں سے چند مراقبات نقل کرتا ہوں۔

فنائیت و تواضع کا حصول سلوک کے مقاصد مہمہ میں سے ہے۔ اس کا حصول اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت و جلالت کے مراقبہ اور دھیان سے میسر آتا ہے۔

حضرت سیدی قدس سرہٗ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اپنے کو مٹانا یہی ہے۔ کہ اپنے کسی کمال کو اپنا ذاتی نہ سمجھا جائے۔ بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی عطا بلا استحقاق بندہ سمجھا جائے اور اپنے کسی عمل کو مؤثر مستقل نہ سمجھا جائے، دل میں کبر و نخوت و عجب باقی نہ رہے۔ یہ حاصل ہوتا ہے اپنے ضعف اور بیچارگی کے تصور اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلالت کے استحضار سے۔"

ایک دوسرے خط میں ہے:۔

"تواضع کی کیفیت کی کمی اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت کے مراقبہ سے دور ہو گی۔"

ایک سالک کو لکھتے ہیں:۔

(اپنے کو ہیچ سمجھنے وغیرہ کی) یہ کیفیت بھی اچھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بے نیازی کے استحضار سے یہی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

خشیت ربانی جو دین کی بنیادی چیزوں میں سے ہے وہ بھی عظمت الٰہی اور جلالت خداوندی کے استحضار کا ثمرہ ہے۔ حضرت والا قدس سرہٗ ایک طالب کو ارقام فرماتے ہیں:

"(خشیت الٰہی کیلئے) اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت پر نظر رکھی جائے ..... اور (اس سلسلے میں) خشیت الٰہی کے مضامین اور آیات پڑھا کریں۔"

اسی طرح گناہوں سے احتراز بھی اللہ تعالیٰ کی عظمت و جبروت کے دھیان و مراقبہ سے نصیب ہو جاتا ہے۔ حضرت سیدی رحمہ اللہ تعالیٰ ایک طالب کے اس مغالطہ کے جواب میں کہ ـــــ " جب معصیت کا خیال پیدا ہوتا ہے تو ساتھ ہی شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ خیال بھی ہوتا ہے۔ کہ اگر گناہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ معاف فرمائینگے ـــــ اس سے گناہ کی طرف رغبت پیدا ہوتی ہے اور خشیت کم ہوتی ہے۔ ـــــ ارقام فرماتے ہیں:۔

" اللہ تعالیٰ کی قہاری اور جباری کا تصور کیجئے۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہر گناہ کے معاف کرنے کا وعدہ نہیں فرمایا۔ وہ چاہے معاف کرے نہ کرے۔ اور گناہ پر اصرار ایسا گناہ ہے جس سے صغیرہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے ۔ (اس تصور اور مراقبہ سے گناہ کا جذبہ انشاء اللہ مضمحل ہو جائے گا) "

انہیں کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں ،۔

" ایسی حالت میں (یعنی جب گناہ کا خیال پیدا ہو) فوراً عذاب الٰہی کا تصور کیجئے کہ دوزخ کی آگ دھک رہی ہے ۔ اور ہم اس میں پڑا چاہتے ہیں۔ یا موت اور قبر کا تصور کیجئے۔ سب مزہ کرکرہ ہو جائے گا۔ نیز یہ مراقبہ کیجئے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہم کو دیکھ رہے ہیں۔ "

لا الٰہ الا اللّٰہ کا ذکر و مراقبہ تو گویا ذات باری سے استفادہ کی چابی ہے یہ کلمۂ، کلمہ معرفت، و کلمہ عبدیت سب کچھ ہے، اسلئے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ غفلت سے دوری غیر اللہ سے بے خوفی اور ماسوا سے بے نیازی اور گوناگوں روحانی فوائد کے حصول کیلئے اس کلمہ کے ذکر و مراقبہ کی تلقین اس کے معانی کے استحضار کیساتھ فرماتے تھے۔ ایک سالک کو لکھتے ہیں ،۔

"ماسوا سے بے نیازی کیلئے لا الٰہ الا اللہ کا ذکر و مراقبہ اس کے معنیٰ کے استحضار کے ساتھ کافی ہے...... اس (غیر اللہ سے بے خوفی) کیلئے بھی یہی ذکر کافی ہے۔ اس کے معنیٰ کا استحضار چاہیئے۔ (یاد الٰہی کے دوام کیلئے بھی یہی ذکر ہے۔ اس کی کثرت غفلت کو دور کر دیتی ہے۔"

مسلمان کی قوت و طاقت کا منبع بھی قادر مطلق کی صفتِ قدرت کا استحضار ہے۔ اور اسی سے توکل اور اعتماد الٰہی میں جان پڑتی ہے حضرت والاؒ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"مسلمان کی قوت اللہ تعالیٰ پر توکل اور اعتماد سے ہے۔ قادرِ مطلق کی قدرت کا استحضار رکھیئے ۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور اَنَّ الْقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا کا مراقبہ کیجئے اور عمل خیر میں عجلت فرمائیے اور شر سے بچنے میں قوت دیکھائیے اور کسی غیر مسلم طاقت کے سامنے اظہار حق سے نہ گھبرائیے"

فکر آخرت کے پیدا کرنے کیلئے ایک طالب کو یہ مراقبہ تجویز فرمایا:۔

"آیت ہے۔ "گھاٹے میں وہ ہیں جو قیامت کے دن گھاٹے میں ہوں گے" اس کا استحضار رکھا کیجئے۔ اور سمجھئے کہ یہ ظاہری زندگی فانی اور آنی اور اصل زندگی اور غیر فانی زندگی آخرت کی ہے"

ایک اور مکتوب میں ہے:۔

"یہی مجاہدہ ہے کہ باوجود دلکشی و دلفریبی کے پھر دل کو روکا جائے اور دنیاوی جاہ و حشمت گو گو وہ ایک معنی میں۔ اگر بلا سعی مل جائے نعمت ہے مگر اس میں دل نہ لگایا جائے۔ آپ ایسے موقع پر اُن کے فانی و زائل ہونے کا تصور کر لیا کریں۔ اور سمجھیں کہ ان سب کا جنازہ سامنے رکھا ہے

اور ان کے نعیم کا حساب کتاب ہو رہا ہے اور وہ لاجواب ہو رہے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر مختلف استعدادیں اور قوتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ اہل باطل ان قوتوں کا بے محل استعمال کر کے انہیں ضائع کر دیتے ہیں اور اہل حق اسے مواقع خیر، جائز مصارف اور صحیح نہج پر صرف فرماکر اسکا اصل فائدہ حاصل کرتے ہیں اور نعمت الٰہی کو برمحل استعمال کر کے اسکا حق وشکر ادا کر دیتے ہیں۔ "مراقبہ" اور 'دھیان' کی قوت بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ جس کا مقاصدِ حسنہ کیلئے استعمال اس قوت میں بھی جلا دیتا ہے۔ اور ان مقاصد کے حصول میں معین و مددگار بن کر اپنی افادیت ثابت کر دیتا ہے۔ اور نتائج مراقبات کئی باطنی فوائد و مزایا کے حصول کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

ایک سالکِ صادق کے اس اشکال کے جواب میں کہ ـــــــ

"حق تعالیٰ کی تجلیات اور.... وارد شدہ کیفیات سب 'تصوری' 'ذہنی' معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے کوئی اپنے آپ کو ہپناٹائز (Self hepnotized) کرے تو جس نہج کا تصور باندھے گا۔ اس قسم کی کیفیات وارد ہوں گی۔"

ـــــ حضرت والا قدس سرہٗ نے کیا بصیرت افزا اور سرمہ بنیش جواب ارقام فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

"یہ شبہ بالکل صحیح ہے۔ اسی لئے یہ انوار و تجلیات جن کو عام طور پر انوار و تجلیات کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ نفسانی افکار ہیں۔ اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے اسی عملِ نفسیاتی کے ذریعہ بعض علمائے نفسیات

بیماری کا ازالہ اور صحت کا حصول کرتے ہیں۔ اور اسی نفسیاتی اصول سے صوفیہ امراضِ باطنی کا علاج کرتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ سے رابطہ پیدا کرتے ہیں۔ اب جس طرح پہلے یہ طے کیا جا چکا ہے۔ کہ صحت اچھی چیز ہے اور بیماری بری چیز ہے۔ اور بیماری کو دور اور صحت کا حصول اس تدبیر نفسیاتی سے کیا جاتا ہے۔ اور اس میں کامیابی ہوتی ہے۔ اسی طرح مشاہدہ و استحضار ربانی کی کیفیت جس کے حصول کا مطلوب ہونا الگ دلیل سے ثابت ہے اس کیلئے یہ نفسیاتی طریق کار اختیار کیا جاتا ہے اور اس میں کامیابی ہوتی ہے۔ اس طریق میں عموماً جو مشاہدات ہوتے ہیں وہ ذہنی ہی افکار ہوتے ہیں۔ جیسا کہ امام نقشبند (خواجہ بہاؤالدین نقشبند قدس سرہٗ) کا یہ فقرہ اس پر دلالت کرتا ہے :-

"کہ آنچہ دیدہ شود و دانستہ شود ہمہ غیر خدا است"

بحمداللہ کہ یہ حقیقت آپ پر ظاہر ہو گئی۔ غرض اصلاً یہ مشاہدات و تصورات مطلوب نہیں، یہ تو بطور تدبیر ہیں۔ اصل ان کے نتائج ہیں یعنی صحت۔" (تذکرہ سلیمان ص ۶۱۵، ص ۶۱۶)

وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود

راہِ سلوک میں بعض سالکین پر احیاناً صفاتِ حق کا استحضار ایسا غالب ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے بعض اسماء کی تجلّی اس وضوح و عظمت سے ہوتی ہے کہ موجودات، صفات کے پردہ میں چھپ جاتی ہیں۔ مخلوق 'صفت خلق' میں گم ہو کر رہ جاتی ہے اور "کائنات کی کثرت" وصور اَشکال اور انواع کا تعدد "المصور[1]" کی "تجلّی وحدت" میں پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ "تصرفات و تغیرات کونی" "فاعلیت وجود" کی نیرنگیاں اور "کائنات کے شئوں و احوال مختلفہ" "متصرفِ حقیقی کی فاعلیتِ مطلقہ" کا کلی کرشمہ نظر آنے لگتا ہے۔ تجلیات کا غلبہ، صفاتِ الٰہیہ کا غالب تأثر مخلوق کو اس کی نگاہوں سے محجوب کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی اپنی ہستی بھی اس سے پوشیدہ ہو جاتی ہے

اس غلبۂ حال میں وہ ایک سے دیکھتا ایک سے پاتا اور ایک ہی کو پاتا ہے

---

[1] فقیر پر 'وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود' کا مسئلہ بفضلہ تعالیٰ "ھُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ" کی یکجا تجلّی سے ہی واضح ہوا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الامور و علمہ۔ م ا ا

اس کیفیت خاص" اور حال کی غیر اختیاری حالت" کو باختلاف اصطلاحات و احوال "وحدت الوجود" و "وحدت الشہود" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

'وحدت الوجود' کا مدعا یہ ہے کہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی "موجود حقیقی متصف بکمال ہستی و موصوف بصفاتِ اصلی و ذاتی" نہیں یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات عالی قابل توجہ و لائق شمار و التفات ہے اور باقی جملہ موجودات کی ہستی گو موجود تو ہے لیکن اس ذاتِ متعال و کامل کے سامنے ان پر ہستی کا اطلاق بھی زیب نہیں دیتا۔ کہ اس حی و قیوم موجود حقیقی کے امر و ارادہ سے جملہ موجودات کے وجود کا ظہور و بقا و قیام ہے۔ وہ نہ چاہتے تو ہمہ کا وجود آن واحد میں عدم ہو جائے اسلئے اس کے سامنے جملہ وجود مضمحل و کالعدم ہیں۔ اور ایک ہی ہستی قابل اعتبار اور اس کا 'وجود' ہی حقیقتاً وجود ہے۔ مثلاً چاند کا نور سورج سے مستفاد ہے۔ بذاتہ چاند کا کوئی نور نہیں۔ سورج ہی کا نور اسکا نور ہے۔ اسی طرح بلاتشبیہ موجودات کا نورِ وجود ذات حق سے قائم ہے۔ ذاتی و مستقل کوئی وجود نہیں۔ محض ایک ظلی و عارضی وجود ہے جو خالق و مُعطیٔ قیُّومِ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ کی خلق و عطا ہے اور اسی سے اسکی بقا ہے وگرنہ ہیچ و عدم، ایسا 'پادر ہوا' وجود اللہ تبارک و تعالیٰ کی عظیم و جلیل ہستی کے سامنے بالکل لاشے اور ناچیز محض ہے۔ "غلبہ حال" میں جب سالک 'غیر' کے وجود کے ادراک سے غافل و عاری ہو کر ایک ہی 'وجود حق' کو پاتا اور سمجھتا ہے۔ اسے "وحدۃ الوجود" کہتے ہیں ـــــــ لیکن اس 'غلبہ حال' کے "ادراک ناقص" سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ حقیقتاً 'وجودِ غیر' عدم ہے۔ گو مغلوب الحال سالک سمجھ اور دیکھ نہ سکے۔ لیکن مخلوق کا وجود (کیسا ہی ناقص سہی) بہر حال ہے۔ جس پر نصوص شاہد

اور تجربہ گواہ ہے۔ اس لئے وجودی محققین، بھی عدم عالم کے کلیتہً قائل نہین ۔ جیسے انکی عموکی عبارات سے ظاہر ہوتا ہے) واللہ اعلم

"وحدۃ الشہود" شہود کے ایک ہونے کو کہتے ہیں یعنی واقعہ میں تو وجود متعدد ہیں۔ مگر سالک کو ایک ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے اور باقی سب موجودات کالعدم معلوم ہوتے ہیں۔ شیخ سعدیؒ نے کیا خوب مثال دی ہے۔

مگر دیدہ باشی کہ در باغ راغ ۔۔۔ بتابد بشب کرمکِ چوں چراغ

یکے گفتتش اے مرغکِ شب فروز ۔۔۔ چہ بودت کہ بیروں نیائی بروز

بیں کاتشیں کرمک خاک زاد ۔۔۔ جواب از سر روشنائی چہ داد

کہ من روز وشب جز بصحرا نیم ۔۔۔ ولے پیش خورشید پیدا نیم

مراد یہ ہے۔ کہ جگنو کا وجود اندھیرے میں چمکتا دکھائی دیتا ہے لیکن سورج کی جہانتاب روشنی میں اسکی روشنی باوجود ہونے کے عدم ہوجاتی ہے۔ اسی طرح جن پر نور ربانی اور صفات صمدانی اپنی تجلیات کے ساتھ پرتو افگن ہوتی ہیں۔ ان کی نگاہیں خالق کے مشاہدہ میں مشغول ہوجاتی ہیں اور مخلوق ان کے لئے قابل التفات واعتنا نہیں رہتی۔ گویا ایک معنی میں غیر ان کی نگاہوں سے کلیتہً محجوب ہوجاتا ہے۔ اور وہ گو وجود غیر کے قائل ہوتے ہیں۔ لیکن حالاً ان کے لئے 'غیر' کا وجود و عدم برابر ہوجاتا ہے۔

ان تشریحات[1] سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے۔ کہ (بقول حاجی امداد اللہؒ صاحب مہاجر مکی) وحدت الوجود و وحدت الشہود میں اختلاف لفظی ہے" حقیقت بادنی

---

[1] یہ تشریحات اکثر حضرت تھانویؒ کے افادات سے مستفاد ہیں ۔ م ۔ ا

تفاوت وہی ہے۔ کہ غلبہ حال میں سالک سے مخلوق محجوب ہو جاتی ہے۔ اور وہ ایک ہی وجودِ حق میں شاغل ہو جاتا ہے۔ اب جو ایک ہی وجودِ حق کو پاتا ہے۔ وہ 'وجودی' ہے اور جو ایک 'دیکھتا' ہے وہ شہودی ہے، وحدۃ الوجود کی اصطلاح ذیز و مردِ افگن ' ہے۔ اور عوام میں اس کے معنیٰ غلط مشہور ہو گئے۔ اس لئے ' وحدۃ الشہود ' کی اصطلاح کو اختیار کیا گیا۔ کہ دلالتِ معنوی کے لحاظ سے یہ اصطلاح زیادہ مناسب و احوط ہے۔

ان مباحث کا حاصل صرف اتنا ہے۔ کہ " وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود " کا مسئلہ ایک حالی کیفیت سے متعلق ہے۔ جس کی حقیقت " اہل حال " ہی سمجھ سکتے ہیں علمی و کلامی حیثیت سے اس میں زیادہ غور و خوض اور حکم جازم کرنا بقول حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے " سخت محل خطر و خلافِ مسلک سلفِ صالحین ہے۔ اجمالاً یہ اعتقاد تو جزم کے ساتھ رکھنا چاہیئے۔ کہ یہ عالم پہلے ناپید تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے علم و ارادہ و قدرت سے پیدا فرمایا اور اسکا ارادہ و قدرت ہی کائنات کے وجود کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ باقی اس بارے میں تفصیلی موشگافیاں خلاف احتیاط ہیں۔

بہرحال " وحدۃ الوجود " اور " وحدۃ الشہود " ایک کیفیت حالی کا نام ہے اور یہ حال حدود کی رعایت کیساتھ دگر 'احوال' کی طرح بعض کے لئے مثمر برکات و محمود ضرور ہے۔ لیکن کسی درجہ میں بھی مقصود نہیں۔ نہ ہی سلوک کا کسی درجہ میں اس حال کے علم و یافت پر مدار ہے۔ لیکن اکثر مشاہیر صوفیہ و سالکین پر یہ 'حال' جس طرح غالب و طاری ہوا۔ اور اسکی تشریحات زبان و قلم کی قاصر تعبیرات سے ادا ہوئیں اس سے بعض طبقے اسے ہی حقیقتِ تصوف جاننے لگے۔ اور شریعت مطہرہ "

کی نصوص کے خلاف اس کی تشریحات کرنے لگے ۔ حالانکہ 'وحدۃ الوجود' کی غیر اسلامی اور نوافلاطونی تعبیریں جو بھی ہوں۔ اسکی حقیقت صرف اتنی ہے کہ غلبہ حال میں سالک کی نگاہوں سے غیر اللہ بالکل اوجھل ہو جاتا ہے اور اس حالت کی کیف انگیزیاں اور سرخوشیاں اسے "مست ولایعقل از جام ہو" بنا کر بعض اوقات سکر کی حالت میں "ناگفتنی باتیں اس سے کہلوا دیتی ہیں جو کہ نہ لائق نقل و تقلید ہیں نہ سالک کی معذوری کی بنا پر قابل ملامت ، ویسے بھی ذوقیات وکیفیات" کا زبان وقلم سے اظہار وبیان ممکن نہیں ہے۔ اسلئے ہمارے حضرت والا قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ :- " وحدۃ الوجود کو تم قال سے سمجھنا چاہتے ہو۔ مگر یہ تو حال ہے جو اکثر سالکین پر طاری ہوتا ہے۔ اس حال میں غیر معدوم نہیں بلکہ محجوب (چھپ) ہو جاتا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے کمال کی معرفت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جیسے قطرہ جب اپنی ہستی کو دیکھتا ہے تو 'انا الماء' کہنے لگتا ہے۔ مگر جب سمندر کو دیکھتا ہے تو سمندر کے سامنے اپنا نام لینے سے بھی شرماتا ہے۔ اور اپنی ہستی کے ہونے کے گمان تک کو گم کر دیتا ہے۔" اس تشریح کے بعد سعدیؒ کے یہ اشعار پڑھے ۔ ؎

یکے قطرہ باراں ز ابرے چکید خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائے کہ دریاست من نیستم گر او ہست حقا کہ من نیستم
ہمہ ہر چہ ہستند از کمتر اند کہ با ہستیش نام ہستی برند

عارف رومیؒ کا شعر ہے ؎

اول و آخر توئی ما در میاں ہیچ ہیچے کہ نہ آید در بیاں

غرض حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وحدۃ الوجود کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ سالکین کو کبھی ایسا حال پیش آتا ہے کہ اس کی نگاہ سے غیر اللہ محجوب ہو جاتا ہے۔ خود ان کا شعر ہے۔

اب مسئلہ وحدت وکثرت کو میں سمجھا   پا کر تجھے سب تیرے سوا بھول گیا ہوں

اس شعر کے متعلق راقم کے استفسار پر فرمایا،

"محبت کی وجہ سے عاشق کو محبوب کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اور ہر چیز میں وہی دکھائی دیتا ہے۔ یہاں بھی یہی چیز مراد ہے۔ ہر چیز کو اللہ سمجھنا یہ تو وحدۃ الوجود نہیں بلکہ وحدت کو کثرت قرار دے لینا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا کسی کو غلبۂ حال کی وجہ سے نہ دیکھے۔ وحدۃ الوجود تو یہ ہے۔"

بات صرف اتنی ہے کہ وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود (اصطلاحات کے اختلاف) کے باوجود سالک کا ایک حال ہے۔ جو بعض صفات الٰہیہ کے دائمی استحضار وتأثر کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ سالک ان تأثرات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ مختلف صفات وشئون الٰہی کا ظہور مخلوق سے ہٹا کر خالق کی "مختلف الوان" میں 'تجلیات' و 'فاعلیت' کو سالک پر اس طرح کھول دیتا ہے کہ مخلوق کے وجود وبقا قیام اور اس کی صور واشکال، حوادث واحوال کوائف تغیرات کو ہر آن خالق وباری متعال سے کالعین ہوتا دیکھتا و پاتا ہے۔ وجود کے جملہ سلاسل اور کون وابداع کی جملہ نیرنگیوں میں اللہ تبارک تعالیٰ کی فاعلیت و قدرت و دیگر صفات کو جاری وساری پاتا ہے۔ اس بنا پر بعض سالکین غلبہ حال میں

"محبوب مخلوق" کے "التفات وتذکرہ" تک کو گم کر دیتے ہیں۔ "وحدۃ الوجود" کی یہ کیفیت گو محمود ہو، مقصود اس لئے نہیں، کہ مطلوب توحید تنزیہی ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کی صفات و شئون کا بھی کامل استحضار اور اس کی فاعلیت و تاثر کاملہ کا بھی ہر چیز میں مشاہدہ ہو لیکن "مخلوق" کا وجود "محجوب" و پوشیدہ نہ ہو جائے۔ بلکہ مخلوق میں خالق کائنات کی بے چون و بے چگوں فاعلیت و صفات کا ظہور دیکھے و پائے، لیکن مخلوق کو کلیتہً گم نہ کر دے۔ بلکہ اسے مرأۃِ صفاتِ حق سمجھے اور خالق و مخلوق کا صفات الٰہیہ کے دائمی استحضار کے باوجود وہ ہی رابطہ سمجھے جو نصوص و شریعت میں وارد ہے۔ صفات و شئون کی تجلیات میں گم ہو کر بھی شریعت کی حبل المتین اس کے ہاتھ سے نہ جائے، ذات باری تعالیٰ کو ادراک و کم و کیف سے وراء الورا سمجھے۔ اور مخلوق کے وجود کو خالق کی صفتِ خلق و ابداع و قدرت و مصوریت کا ظہور سمجھ کر اس میں صنّاع حقیقی کی صنعت گری کا مشاہدہ کرے۔ بقول عارفِ شیرازؒ

ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم   اے بے خبر لذتِ شربِ مدام ما

کہ عالم ہمہ اسی کی صنعت گری ہے۔ "صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ" اسی "المصور" کی "صورت گیری" اور اسی "قَيُّوْمُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ" سے ہر آن قائم و باقی ہے۔ گویا وجود و بقا، صورت و ابداع کا ہر ذرہ ذات باری کے صفات کے بے نہایت خزائن سے ہر آن وجود میں آرہا ہے اور "موجودات" و کائنات کو "باقی و قائم" رکھے ہوئے اور اس میں مختلف تغیرات و احوال کو وجود بخش رہا ہے بلا تشبیہ جیسے بھرے ہوئے بادلوں سے موسلا دھار بارش کے وقت لگاتار بارش کے قطرے یکے بار دیگرے برستے رہتے ہیں۔ اسی طرح وجود کے جملہ

سلاسل، ان کی صورتیں ان کے تغیرات صفات الہیہ کے لاتناہی خزائن سے ہر آن بغیر کسی انفکاک کے ظہور میں آتے رہتے ہیں اور مخلوق کو تھامے اور اس کے جملہ حوادث و تغیرات کو وجود بخشتے رہتے ہیں

بہر حال وجود و ابداع کی نیرنگیوں میں صفات و شئون کا مشاہدہ خالق و مخلوق کے ربط کے شرعی بیان و ایضاح کے مطابق ہو خالق کا اشتغال اور اس کی معرفت تنزیہ کے ساتھ ہو۔ اور مخلوق کا مشاہدہ صفات کی تجلیات میں احکام الہیہ کی پابندیوں کے ساتھ ہو۔ جوشِ طریقت، شوقِ حقائق، لذت و کیفیت احوال ہوشِ شریعت پر غالب نہ آجائے۔ کہ اصل "توحید" وہی ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت پر کھولی، جو صحابہؓ نے سمجھی، اور امت کے ائمہ ہدیٰ اور سلف صالحین نے جسے بیان فرمایا

حضرت سید الملۃ رحمۃ اللہ علیہ نے وحدۃ الوجود کی تشریح میں مولانا مسعود عالم مرحوم کو بعض تحریریں لکھی ہیں۔ جن سے اس مسئلہ پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے ان کو نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:۔

"وحدۃ الوجود کی بحثیں تمامتر فلاسفہ و حکماء کی الٰہیات میں موشگافیاں ہیں۔ یا یوں کہئے کہ فلاسفہ کے الٰہیات کے مقابلہ کا علم کلام ہے۔ شیخ اکبرؒ۔ صدر قونویؒ رومیؒ، عراقیؒ، جامیؒ، امام ربانیؒ یعنی مجدد الف ثانیؒ، افضل المحققین (یعنی شاہ ولی اللہ صاحب حسبِ اصطلاح صاحب طبقات) ان سب کی الگ الگ آراء ہیں یا مختلف تعبیرات ہیں۔ صاحب طبقات نے ان سب پر تبصرہ کیا ہے۔

اور یہ ثابت کیا ہے۔ کہ ان سب میں صرف اصطلاح اور تعبیر کا فرق ہے حقیقت کا نہیں اور وہی عین شریعت ثابت بالکتاب والسنت بھی ہے چنانچہ طبقہ ۱۰ اور طبقہ ۲۰ میں اس کی تفصیل مذکور ہے۔

صراط مستقیم میں امام شہید رحمۃ اللہ علیہ نے وحدۃ الوجود کو محض شدتِ عشق کا نتیجہ بتایا ہے۔ یعنی شدت عشق و استغراق سے عاشق کو ایسا نظر آتا ہے۔ جو واقعہ نہیں۔ اس عشق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ "فنائے عالم یعنی غیبت و عدم شعور بما سوائے محبوب حتی کہ بنفس خود" (ص۵) اس کی تفصیل ص۱۲ میں ہے۔ کہ جس طرح لوہا آگ میں لال ہو کر انا النار پکار اٹھے۔ لیکن وسط کتاب میں بدعاتِ صوفیہ کے ضمن میں ہے :۔

"وازجملۂ بدعات ملاحدہ وجودیہ کہ درخواص وعوام اشتہار یافتہ باقوال اکابر طریقت مشتبہ گردیدہ گفتگو ہائے توحید وجودالحادی است کہ بگمان اتحاد خود با خدا ازاں لذتیات نفسانی مبارزند و بتسویل شیطانی ومکر نفوس خبیثہ بیاں آں گفتگو را معارف وحقائق می پندراند الخ ص۱۵۴"

(مکاتیب سید سلیمان ندوی ص ۱۲۸-۱۲۹)

دوسرے مکتوب گرامی میں ان ہی کو تحریر فرماتے ہیں :۔

"وحدۃ الوجود کے باب میں آپ نے کئی دفعہ پوچھا، وحدۃ الوجود کی کئی تشریحات ہیں۔ اور ان کے اختلاف معنیٰ کے بنا پر حکم بدل جاتا ہے۔ ان ہی میں سے ایک وہ ہے۔ جس کو جاہل صوفیہ مانتے ہیں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ خالق ومخلوق میں فرق اعتباری رہ جاتے، اور ہر مخلوق کو دعوائے خالقی ہو جائے سو یہ تمام تر کفر ہے اور اسکا ماخذ

تو افلاطنیت معلوم ہوتی ہے اور ہندوؤں کا فلسفہ بھی اسی قبیل کا ہے۔
ہندوستان میں یہ مسئلہ[لے] مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کی روایت کے مطابق آٹھویں صدی میں آیا۔ ورنہ حضرات چشت کے کلام میں حضرت سلطان الہند خواجہ معین الدین سنجری سے لیکر حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ تک کے ملفوظات میں اسکا ذکر یاد نہیں آتا۔ مجدد الف ثانی۔ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب، مولانا اسماعیل شہید وغیرہ وحدۃ الوجود یا وحدۃ شہود کی جو تشریح کرتے ہیں۔ اس کا مقصد مسئلہ قیومیت کی تفصیل ہے۔ "اَنْتَ قَیُّوْمُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِیْهِنَّ" حدیث صحیح میں وارد ہے۔ اور اس کی تشریح بر مذاق وحدۃ الوجود یہ ہے کہ ساری مخلوقات اپنے وجود و بقا میں ہر آن اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے۔ جسطرح وہ اپنے خلق میں محتاج تھی۔ انتم الفقراء سے ثابت ہوتا ہے کہ ہماری حقیقت فقرِ محض ہے۔ اور 'اللہ ھو الغنی' سے ظاہر ہے کہ وہی غنی ہے۔ فقر کے دوسرے معنی عدم کے ہیں۔ ہماری حقیقت عدم ہی ہے جس میں وجود یا کسی صفت کی نیرنگی اسی ذات غنی کی صفات کے ظلال ہیں ظل کی حقیقت عدم ہی ہے۔ عدم نور کا نام ظل ہے۔ تاہم کسی ظل کا وجود اصل کے بغیر نہیں ہوتا۔ اسلئے ظل کا وجود اپنی ذات میں ہم معنی عدم ہے۔ لیکن اصل کے پرتو سے وجود کا ایک وہمی نقش پالیتا ہے۔ یہ ان حضرات کا وحدۃ الوجود ہے گو ہمارے نزدیک حضرت مجدد صاحبؒ کا یہ مسلک اخیر مسلک نہیں، اخیر مسلک وہی وحدت تنزیہیہ ہے جس پر شرع وارد ہے۔ کما فی المکتوبات' ہمارے حضرت کے یہاں

لے :- فقیر کے سامنے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا۔ "وحدۃ الوجود کو پہلے پہل سہروردی حضرات ہندوستان لائے حضرت ذکریا ملتانی وغیرہ۔" واللہ اعلم۔ (اشرف)

وحدۃ الوجود کا تصور ایک حالی کیفیت ہے۔ جس کی نظر میں اللہ تعالیٰ کی محبت و عظمت و جلالت اتنی چھا جائے کہ ساری مخلوقات اس کی نگاہوں سے چھپ جائیں۔ جیسے آفتاب کے طلوع سے سارے ستارے چھپ جاتے ہیں۔ مگر معدوم نہیں ہوتے جیسے مجنوں کا یہ قول ؎

تمثل لی لیلیٰ بکل سبیل

جس وحدۃ الوجود کو ہم نے فلاسفۂ افلاطونی کا خیال کہا ہے یا ہندوؤں سے ماخوذ بتایا ہے وہ یہی ہے کہ ذات الٰہی ہی پھیل کر عالم بن گئی ہے۔ جیسے انڈا ہی پھٹ کر چوزہ بن جاتا ہے جو ایک رباعی میں خیام کی طرف منسوب ہے۔

حق جان جہاں است و جہاں جملہ بدن　　ارواح و ملائکہ حواس ایں تن

افلاک و عناصر و موالید اعضا　　توحید ہمیں است و دگر ہا ہمہ فن"

اِن مباحث و اقتباسات سے اس مسئلہ کی حقیقت اور حضرت والا کا مسلک پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ وحدۃ الوجود محض ایک کیفیت حالی کا نام ہے جو گو مقاصدِ سلوک میں نہیں لیکن راہ سلوک کے راہیوں کی ایک 'حالت' ہے جس میں محبت و عظمت و جلالتِ ربّ اتنی چھا جاتی کہ غیر اللہ نظروں سے چھپ جاتا ہے۔ لیکن اسکا یہ مقصد ہرگز نہیں۔ کہ غیر معدوم ہو جاتا ہے۔ یہ 'حالت' دگر احوال کی طرح بعض افراد کیلئے مفید و مثمر برکات تو ہو سکتی ہے۔ لیکن مقصود توحید تنزیہہ ہے دگر ہیچ۔ (واللہ اعلم)

ایک مکتوب میں ایک ناقد کو لکھتے ہیں:۔ "مولانا رومیؒ اور مولانا جامیؒ وغیرہ کی نسبت جو کچھ خیالات آپ نے ظاہر کئے ہیں باوجود اس کے کہ میں وحدۃ الوجود کے مسئلہ میں انکی عامیانہ تشریح کا قائل نہیں۔ تاہم ان بزرگوں کی نسبت زبان درازی ناپسند کرتا ہوں۔" ★

فنا و عبدیت

فنائے تام و عبدیت کاملہ جو طریق کی غایت قصوی ہے اور جس کا درس[1] ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے شیخ کی بارگاہ سے ان الفاظ میں ملا تھا کہ :-

"ہم نے جو کچھ دیکھا، سُنا اور پڑھا ہے۔ اس کا مقصد اپنے کو مٹانا ہی سمجھا ہے"

وہ بھی اسی توحید کاملہ کا ثمرہ ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی جلالت وعظمت چھاتی ہے تو اپنی ہستی کے گمان سے بھی وحشت ہونے لگتی ہے۔ اپنے ہیچ در ہیچ اور محتاج ولاچار ہونے کا ایقان اور ہر خوبی و وجود کا ان ہی کی ذات سے ہونے کا یقین غالب و مستحضر ہو جاتا ہے۔ نگاہوں میں وہی سما جاتا ہے۔ دل اسی کے جلوؤں سے مسرور اور اس کی رضا و لقا کے جذبات سے معمور ہو کر مخلوقات کو گم کر دیتا ہے۔ اسوقت بندہ اسی کی قوت سے دیکھتا ہے۔ اسی سے چلتا ہے اسی سے سنتا ہے۔ اسی سے بولتا ہے اور کائنات کے ذرّے ذرّے میں اسے جمالِ ازلی اور نورِ سرمدی کا پرتو نظر آتا ہے۔ حضرت شیخ نے ایک

---

[1] حضرت مفتی محمد حسن صاحب نور اللہ مرقدہ نے راقم سے تذکرہ کیا تھا کہ جب سیدی ومولائی حضرت شیخ مولانا تھانوی کی خدمت اقدس میں تشریف لے گئے تو رخصتی کے وقت سید صاحب نے فرمایا حضرت کچھ نصیحت کیجئے۔ مولانا نے فرمایا "میں اتنے بڑے عالم وفاضل کو کیا نصیحت کر سکتا ہوں۔ سید صاحب

بقیہ حاشیہ دوسرے صفحہ پر

مرتبہ اپنے کو مٹانے کی تشریح ان الفاظ میں ارقام فرمائی تھی۔

" اپنے کو مٹانا یہی ہے کہ اپنے کسی کمال کو اپنا ذاتی نہ سمجھا جائے بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی عطا بلا استحقاقِ بندہ سمجھا جائے، اور اپنے کسی عمل کو مؤثر مستقل نہ سمجھا جائے، دل میں کبر و نخوت و عجب باقی نہ رہے۔ اور یہ حاصل ہوتا ہے اپنے ضعف اور بیچارگی کے تصور اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت کے استحضار سے۔"

ایک خط میں تحریر فرمایا،

"تواضع کی کیفیت کی کمی اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت کے مراقبہ سے دور ہوگی۔"

ایک سالک کے اس حال کی اطلاع یابی پر کہ "عمل ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ منافقت اور ریا تقریباً ہر عمل میں محسوس ہوتی ہے اس وجہ سے انجام کا بڑا خوف ہے۔" حضرت والا قدس سرہٗ نے تحریر فرمایا،

"یہ کیفیت بھی اچھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بے نیازی کے استحضار سے

کا نرم و پاکیزہ دل یہ الفاظ سن کر گداز ہوگیا اور آپ آبدیدہ ہو گئے، حضرت مولانا تھانوی پر بھی سید صاحبؒ کے اس تاثر سے رقت طاری ہوگئی اور ارشاد فرمایا "ہم نے جو کچھ دیکھا، پڑھا اور سنا ہے اسکا مطلب فنا و عبدیت ہی سمجھا ہے" میں نے حضرت شیخؒ (سید صاحب) سے ایک مرتبہ استفسار کیا تھا، کہ آپ کی پہلی ملاقات مولانا تھانویؒ سے کس طرح ہوئی تھی، فرمایا "بڑی مدت سے خدمت میں حاضری کا خیال تھا، مگر ہمارے احباب اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک سفر میں لاہور کی واپسی کے بعد بغیر اطلاع کے میں حضرت والاؒ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ رخصتی کے وقت حضرت والا (مولانا تھانویؒ) نے ارشاد فرمایا۔ "ہم نے جو کچھ دیکھا، سنا اور پڑھا ہے، اس کا مقصد اپنے کو مٹانا ہی ہے۔ (اشرف)

یہی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ مگر اس سے مایوسی نہ پیدا ہو۔ کہ وہ کفر ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ رحمت و مغفرت کا نیک گمان رکھا جائے۔" (تذکرہ ص۲۸)

ایک طالب نے اپنے ارادہ کو ذاتِ حق کے ارادے میں فنا کر دینے کا ذکر کر کے پوچھا یہ اخلاص کے منافی تو نہیں۔ حضرت سیّدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ارقام فرمایا:۔

" ارادہ کی یہ فنائیت اخلاص کے خلاف نہیں ہے۔ ارادہ کی فنائیت یہ ہے کہ بندہ اپنے ارادہ کو مؤثر نہ جانے، بلکہ مؤثر صرف مشیئت الٰہی کو سمجھے باقی ارادہ تو فنا نہیں ہوتا جب تک بندہ ارادہ نہ کرے کوئی فعل ہی نہیں ہو سکتا۔"

ایک والانامہ میں لکھتے ہیں:۔

" آپ نے تحدیثِ نعمت کے طور پر جو حالات لکھے ہیں۔ وہ سب محمود ہیں اور ان پر حق تعالیٰ کا جو محسن حقیقی ہے۔ اکثر شکریہ ادا کیجئے، ورنہ ذرا سا غرور و تکبّر اور اپنے نفس کی طرف نظر رکھنے سے سارا کیا کرایا خاک میں مل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ان شرور سے محفوظ رکھیں۔ ہمیشہ تواضع، صغرِ نفس اور فنا کا حال غالب رہے اور ہر وقت یہ سمجھے کہ جو کچھ ہے وہ اس بے استحقاق پر محض ان کا کرم ہے۔ ورنہ کچھ نہیں ہے۔"

ایک سالک کو ارقام فرماتے ہیں:۔

" مکائد نفس بہت دقیق ہیں۔ اللہ تعالیٰ پناہ میں رکھیں، تواضع اور فنائے ذات کی راہ پیش نظر رہے ...... فنائے نفس کیلئے۔ اللھم اجعلنی فی عینی صغیرا کی دعا مفید ہے۔ اپنے کو سب سے بدتر سمجھنا سب سے بہتر ہے۔ اسکا ہمیشہ اور ہر کام میں خیال رہے۔ اور اپنے عیوب پیش نظر

رہیں اور اُنکی اصلاح کا خیال غالب، اور اس باب میں اپنے نفس کے مکائد پر نظر رہے۔"

دوسرے مکتوبات میں انہیں کو مزید تاکید فرماتے ہیں :-

"...... اپنے میں شکستگی، افتقار، تواضع پیدا ہونی چاہیئے ...... بڑی چیز یہ ہے کہ اپنے پر نظر بڑائی کی نہ پڑے (کہ) یہ راستہ مردودیت کا ہے۔ اَبیٰ وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ۔ ہر حال میں تواضع اور فنا پر نظر رہے۔ تمام ذمائم امراض قلب کو ایک ایک کر کے دفع کرنے کی کوشش کی جاتی رہے"

ایک طالب کے احوال کا جواب ان الفاظ میں تحریر فرمایا :-

"بے شبہہ یہی بات ہے، ہمارے اعمال پوست ہی پوست ہیں۔ انسان جسقدر ترقی کرتا ہے۔ اپنے احوال و اعمال متوقع مراتب سے کم نظر آتے ہیں اور یہی صحیح حال ہے۔"

ایک مرتبہ فرمایا :- "احساس نقص نقصان کی بات نہیں، احساس کمال نقصان کی بات ہے، بلکہ احساسِ نقص تو ترقی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔"

ایک گرامی نامے میں ارقام فرماتے ہیں :-

"اصلاح کامل تو کسی زمانہ میں بھی نہیں ہو سکتی، کیونکہ جیسے جیسے کمال کی طرف آدمی بڑھتا ہے۔ اس کے نقائص اور زیادہ اس پر واضح ہو جاتے ہیں، مگر بندہ کو چاہیئے کہ اپنی کوشش میں لگا رہے۔"

حضرت شیخ کا ایک شعر ہے ؎

جب سے اے دل اپنے عیبوں پر نظر اپنی پڑی
اپنے دعوائے ہنر سے شرم سی آنے لگی

اس شعر کے متعلق فرمایا تھا۔ کہ یہ شعر اہلِ علم اور مولوی حضرات کیلئے ہے۔"

ایک مرتبہ مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنایا کہ ایک دن نماز کے بعد مولانا نے مقتدیوں کی طرف منہ کر کے ارشاد فرمایا۔ "جب سے اللہ تعالیٰ نے میری اس دعوت کو فروغ دیا۔ مجھے اپنے اوپر استدراج کا خطرہ ہے۔ اس لئے سب بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے لئے دعا فرمائیں۔"

ہمارے حضرتؒ نے یہ نقل کرنے کے بعد فرمایا۔ "ہمارے بزرگ بڑا بننے کو ابتلا سمجھتے تھے کہ کہیں پول نہ کھل جائے۔"

حضرت والا نور اللہ مرقدہ پر فنا و عبدیت کا جس قدر غلبہ تھا، اس کا کچھ ہلکا سا اندازہ شاید مندرجہ ذیل واقعات سے ہو سکے۔

راقم نے حضرت شیخ قدس سرہٗ سے ایک مرتبہ تنہائی میں پوچھا۔ کہ حضرت بزرگوں سے فیض کس طرح حاصل کیا جاتا ہے۔ میرے سوال کا منشاء حضرت شیخؒ نے یہ سمجھا۔ کہ میں بزرگی کی نسبت انکی طرف کر رہا ہوں۔ جس سے چہرہ اقدس کا رنگ متغیر ہو گیا، اور بے اختیار زبانِ مبارک سے نکلا۔ "یہ تو انانیت ہے لا الہ الا اللہ، استغفر اللہ" اور ارشاد فرمایا، "آپ کا کیا مطلب ہے۔ میں نے پھر عرض کیا۔ فرمایا "جو بزرگ ہوں ان سے فیض حاصل کرنے کے متعلق حضرت والا (مولانا تھانوی) رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ بتایا تھا، پھر اسکی تصریح فرمائی، اس طرح گویا اپنے متعلق بزرگی کے ادنیٰ گمان تک کو

برداشت نہیں فرمایا۔ فقیر سے فرماتے تھے "جس کے خیال میں اپنی بڑائی کا گمان آئے وہ اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کے دائرے سے خارج ہے (اللّٰہم اعذنا من شرور انفسنا) پھر یہ آیت پڑھی: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (لقمان - ۲) اور فرمایا مختال سے یہی مطلب ذہن میں آتا ہے۔

راقم نے ایک مرتبہ اپنی دوری و مہجوری کا ذکر کر کے عرض کیا کہ حضرت اس خادم کی عرض بھی وہی ہے جو آپ نے اپنے شیخؒ کے سامنے پیش کی تھی ؎

دیر سے آیا ہوں ساقی دور سے آیا ہوں میں ہو عطائے خاص مجھ کو جو عطائے عام ہے

ارشاد فرمایا۔ "یہاں کیا رکھا ہے اللہ ہی اللہ ہے۔ یہاں خود پیغمبری وقت پڑا ہوا ہے۔"

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ پشاور تشریف لائے، راقم نے عرض کیا، حضرت کسی چیز کی تو ضرورت نہیں۔ ارشاد فرمایا۔ "جی ہاں ایک چیز کی ضرورت ہے۔ عرض کیا ارشاد ہو۔ فرمایا۔ "نجات"

ایک مرتبہ درِ دولت پر حاضری ہوئی۔ حضرت کمرہ میں تشریف رکھتے تھے، میں نے آنے کی اطلاع کی۔ آواز سن کر فرمایا آجائیے۔ اندر گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ حضرت والاؒ پر ہیبت کا غلبہ ہے رنگ زرد ہے اور زبان مبارک سے یہ کلمات نکل رہے ہیں۔ "بڑی پٹائی ہوگی، بڑی پٹائی ہوگی"۔ میں گھبرا گیا کہ کہیں مجھ کو تو نہیں سنایا جا رہا ہے۔ لیکن شیخؒ محاسبہ کے عالم میں تھے۔ اور اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہہ رہے تھے "پوچھا جائیگا۔ ہم نے جو علم دیا تھا۔ اسے تو نے اپنے لئے استعمال کیا"

سچ ہے جتنا علم الٰہی بڑھتا ہے۔ اتنی ہی خشیت بڑھتی ہے۔ چنانچہ سید الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "انا اعلمکم باللّٰہ و اخشاکم للّٰہ"

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔" اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا "

اگر کوئی طالب حضرت کے احسانات و برکات کے متعلق کچھ لکھتا تو فوراً اپنی بے مائگی اور ہیچ میرزی کا اظہار فرما دیتے۔ کسی نے لکھا:۔" ہر وقت نظر کرم کا طالب ہوں "۔۔ جواب میں تحریر فرمایا:۔

" میری نسبت آپ جو کچھ ظاہر کرتے ہیں، وہ صرف آپ کا حسنِ ظن ہے۔ باقی ہیچ ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کی طلب کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ مجھ کو واسطۂ محض بنا کر آپ کو بیش از بیش عطا فرمائیں۔"

حضرت سیدیؒ دار منزل کے کمرہ میں عموماً صوفے پر بیٹھتے تھے باقی حضرات بھی اسی طرح صوفوں یا کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ حضرت کے خدام میں سے ایک صاحب صوفی ادریس صاحب ہمیشہ زمین پر بیٹھتے۔ ایک مرتبہ فقیر صوفے پر اور صوفی ادریس صاحب زمین پر بیٹھے تھے۔ کہ ایک صاحب آئے، اور صوفی صاحب کو دیکھ کر زمین پر بیٹھ گئے۔ اس لئے میں بھی صوفہ چھوڑ کر نیچے بیٹھ گیا۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ہم دونوں کو دیکھ کر نیچے بیٹھ گئے۔ اور مزاحاً فرمایا:۔

" آپ مجھے گورو بنانا چاہتے ہیں۔"

حضرت والاؒ سے فقیر کا تعلق گو ۱۹۴۳ء سے تھا۔ خط کے ذریعے بیعت بھی ہو چکی تھی۔ لیکن ملاقات کی سعادت آپ کی کراچی تشریف آوری کے بعد ۱۹۵۰ء میں حاصل ہوئی۔ سینہ سے لگایا اور فرمایا:۔

" آپ نے خواب دیکھا تھا۔ ہم آہی گئے "

پھر فرمایا:۔

"بہتر ہے کہ پہلے ملاقات نہ ہوئی ورنہ میرے عیوب آپ پر ظاہر ہو جاتے۔ ملاقات نہ ہونے کی وجہ سے میرے عیوب اسے عرصہ پوشیدہ رہے۔"

پھر جامی کا شعر پڑھا ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

بن دیکھے کی محبت اچھی ہوتی ہے۔ عیوب کا پتہ نہیں چلتا۔"

حبِّ الٰہی وخشیتِ ربّانی

سلوک عشق ومحبت کا راستہ ہے۔ اس کی ہر منزل محبت کی شعلہ سامانیوں سے ہی طے ہوتی ہے۔ محبت کا بیج یومِ الست قلب انسانی میں بویا گیا تھا۔ سلوک کے مجاہدات سے اسکی آبیاری ہوتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت ہی وہ سرمایہ ہے جو سالک کے مردہ دل میں جان ڈالتا ہے۔ آتشِ محبت ماسوا کے تصورات کو مٹا کر "جلوۂ جانانہ" سے ہم کنار کرتی ہے۔ اور داغ محبت وہ چراغِ طور ہے جس کی تجلیاں عارف کے دل کو تاباں و درخشاں رکھتی ہیں۔ اگر محبت نہ ہو تو دل اور پتھر میں کوئی فرق نہیں۔ اسلئے حضرت رحمہ اللہ محبت وخشیت الٰہی کی بڑی تلقین فرماتے تھے۔ ایک خط میں مولانا مسعود عالم ندویؒ کو لکھتے ہیں :-

"آپ کے اس دوسرے خط نے مجھے بہت بامید بنا دیا ہے۔ میں یہ سمجھ چکا تھا کہ وہابیوں کی خشکی آپ پر ایسی غالب آگئی ہے کہ عشق و محبت کی گنجائش آپ کے دل میں نہیں رہی ہے۔ الحمدللہ کہ میری یہ غلطی آپ کی نسبت آج جاتی رہی۔ میرا ایک پرانا شعر ہے۔

اظہار کرکے عشق و محبت کے راز کو پھر سے بنا دیا مجھے امیدوار آج (مکاتیب ص ۴۱)

ایک مرتبہ فرمایا۔

"محبت الٰہی اور خشیت تو دین کی بنیادی چیزیں ہیں۔ محبت اللہ تبارک و تعالیٰ کے احسانات میں غور و فکر کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ڈر کسی جابر و قاہر سے خوف کھانے کی طرح نہیں۔ بلکہ اپنے اعمال کے بدلہ ملنے کا اندیشہ ہے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے تھے ' لا لی ولا علی ' حالانکہ تمام امت ان کے کارناموں پر رطب اللسان ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا:۔

"اللہ تعالیٰ عز کا خوف سانپ بچھو کے خوف کی طرح نہیں۔ بلکہ محبوب کی ناراضگی کے خیال کی طرح ہے۔"

اگرچہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذاتِ باکمال اپنی دلستانیوں کی بنا پر سالک کے لئے سراپا جمال و محبت ہے۔ مگر جلال الٰہی کا تصور عشق کو ان حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ جو مجازی اور فانی محبتوں کا خاصہ ہے۔ بلکہ محبت الٰہی خشیت ربانی و تقویٰ کے ساتھ مقرون ہوتی ہے کہ سب سے بڑے عاشق ربانی، حبیب باصفا، محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

اما واللہ اِنّی لاتقاکم للہِ — خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ
واخشاکم لہ — اللہ کا لحاظ کرنے والا اور اس سے ڈرنے والا ہوں

...ن لئے معرفتِ الٰہی حضرت حق کی بارگاہ قدس میں جرات و دلیری نہیں سکھاتی.
بلکہ خشیت و عبدیت کی تعلیم دیتی ہے. حضرت الشیخ قدس سرہٗ فرماتے تھے:

"محبت کی دوگونہ کیفیت (کا مقصد ہونا) اس آیت سے بھی مفہوم ہے
"قَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ." اللہ تعالیٰ سے رجا عمل کے ساتھ
جمع ہوتی ہے. بغیر عمل رجا نفس کا فریب، شیطان کا دھوکہ اور کید ہے.
عمل کرتے ہوتے لرزاں و ترساں رہے. کہ نہ معلوم قبول ہو یا نہ قبول ہو.
والدین کی نافرمانی کرتے ہوئے ان کی مہربانی اور محبت کی امید رکھنا
حماقت ہے.

حضرت والا قدس سرہٗ ارقام فرماتے ہیں:
"اپنے کام میں لگے رہیں اور اللہ تعالیٰ سے خشیت و محبت کی دوگونہ دولت
طلب کیجئے، ایمان کی حقیقت انہیں دونوں کے بیچ میں ہے. والہانہ
جذبہ گو لذت بخش ہو، مگر مقصود نہیں، مقصود وہ محبت ہے، جسکا
نتیجہ اتباع و اطاعت ہو. یہ دعائے ماثورہ اِس کے لئے ہے:
"اللّٰھم اِنّی اسالك حبّك وحبّ من یحبّك وحبّ عمل یقرّب الی
حبّك"۔ جوش و خروش کی کمی کی فکر نہ کیجئے. کام میں لگے رہیئے.
اور اصلاح و تربیت کی دھن میں لگے رہیئے، تا آنکہ اللہ تعالیٰ کے سوا
دل سے ہر چیز کی محبت فنا ہو جائے اور لا اِلٰہ الا اللہ کی تکمیل ہو.....
قلب میں خشیت الٰہی اور محبت الٰہی کے دوگونہ جذبات کا ظہور ہو،

اور جوارح سے ہمیشہ احکام الٰہی کی تعمیل اس کی رضا کی خاطر ہو۔"

ایک سالکِ صادق و مسترشد خاص کو تحریر فرماتے ہیں :۔

"اگر آپ کو اپنے اعمال حسنہ کے متعلق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سراب ہیں تو ایسا سمجھنا اس بنا پر ہے۔ کہ آپ کو ان میں چمک دمک اور لطف اور تڑپ نہیں محسوس ہوتی۔ جو نتیجہ ہے محبت طبعی اور محبت عقلی میں فرق نہ کرنے کا، محبت طبعی بہیمی چیز ہے۔ جس کے آثار ظاہرہ حیوانات تک میں محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن محبتِ عقلی میں کمالِ سادگی ہوتی ہے۔ اور اسکا منشاء صرف طلبِ رضائے دوست اور اس کے حکم کی تعمیل ہے، اس لئے آپ کے دل میں یہ وسوسہ نہ آئے کہ یہ کچھ نہیں ہے، ہاں یہ نتیجہ اس طرح ظاہر ہو۔ کہ دوست کی رضا معلوم نہیں حاصل ہو یا نہیں، اسکا علاج یہ ہے۔ کہ اس کا دوسرا رخ بھی سامنے رہے۔ اور وہ رجاء کا رخ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے امید بھی رکھنی چاہیئے۔ کہ انشاء اللہ تعالیٰ وہ قبول ہی فرمائے جائینگے ایمان ان دونوں کیفیتوں کے درمیان ہے۔ جیسا کہ اس حدیث کا منشاء ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ کسی کو اس کا عمل جنت میں نہیں لے جائیگا۔ کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا آپ کو بھی نہیں ؟ فرمایا مجھے بھی نہیں لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے، ـــــ اس کیفیت کو 'ہیبت' کہتے ہیں۔"

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے :۔ "(خوف و رجاء کی) دونوں کیفیتیں درست ہیں۔ ایک خوف ہے اور دوسری رجاء، اور ایمان دونوں کے بیچ میں ہے عین خوف کی حالت میں رجاء ہو اور رجاء کی حالت میں خوف۔"

خشیت کے بارے میں دعائے ماثورہ ہے۔ اللّٰھم اِنّی اسئلك من خشیتك ما تحول به بیننا وبین معاصیك :۔ (اے اللہ تجھ سے میں ایسی خشیت

چاہتا ہوں جو ہمارے اور تیرے گناہوں کے درمیان حائل ہو جائے)۔

گویا خشیت مطلوبہ وہ ہے۔ جو گناہ سے انسان کو روک دے، اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی۔ کہ وہ غلبۂ خشیت مطلوب نہیں جو انسان کو اعمال سے معطل کر دے اسی طرح وہ خوف بھی پسندیدہ نہیں جو اعمال خیر پیدا نہ کر سکے، کہ وہ نام خشیت ہے بحقیقت خشیت نہیں۔ حضرت سیدی نوراللہ مرقدہ ایک سالک کے بعض احوال کا جواب ارقام فرماتے ہوئے اس حقیقت کو واضح فرماتے ہیں :۔

" مبارک کہ یہ خشیت بنیاد ہے۔ اس خشیت کی جس کا اثر یہ ہے کہ بندہ گناہوں سے باز رہتا ہے۔ اور جس کے لئے دعاء مانگی جاتی ہے۔ اگر خشیت یہ اثر پیدا نہ کرے۔ تو وہ صرف کیفیت نفسی ہے جو مطلوب نہیں ــــ آثار رحمت کا یہ اثر جس کا نتیجہ رجاء ہے یہ بھی مطلوب ہے کہ 'الایمان بین الخوف والرجاء' اور وہ آپ کو حاصل ہے۔ گو احساس نہیں اگر ایسا ہوتا تو خشیت سے افاقہ نہ ہوتا۔"

حضرت سیدالملۃ قدس سرہٗ محبت و خشیتِ الٰہی کے دو گونہ جذبات کی وضاحت فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :۔

" یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم میں خدا کی محبت وپیار کے ساتھ اس کے خوف و خشیت کو بھی جگہ دی ہے۔ غور کرو۔ انسان میں کاموں کے محرک دو ہی جذبے ہوتے ہیں۔ خوف اور محبت، یہ دونوں جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں۔ اور ایک ساتھ یا آگے پیچھے بھی، ان دونوں جذبات کے لوازم بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ ادعائے محبت کا نتیجہ ناز، تبختر اور کبھی کبھی گستاخی اور کبھی اپنے مہربان و محبوب پر غایت اعتماد کی بنا پر نافرمانی بھی ہے، اور ظاہر ہے

کہ جذبہ محبت کے ان لوازم اور اثرات کا انسداد صرف خوف کے جذبہ سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے خالق و مخلوق کے درمیانی رابطہ کی تکمیل نہ تنہا خوف سے ہو سکتی ہے اور نہ تنہا محبت سے، بلکہ ان دونوں کے اشتراک، امتزاج اور اعتدال سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اور یہی نبوت محمدی کی تعلیم ہے۔ اسلام ..... نے (یہودیت و عیسائیت کی افراط و تفریط کے برعکس) اسی نقطہ اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے..... وہ خدا کی نسبت یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے اور رحمٰن و کریم بھی۔ وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور رحیم بھی، وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے، خفا بھی ہوتا ہے اور نوازتا بھی ہے۔ اس سے ڈرنا بھی چاہیئے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہیئے۔

..... وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا	اور اسکو (اسکے عذاب سے) ڈرتے ہوئے
اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ	اور (اسکے فضل و کرم کی) لو لگاتے ہوئے
الْمُحْسِنِيْنَ۔ (اعراف-۷)	پکارا کرو۔ بیشک خدا کی رحمت اچھے کام کرنے والوں کے قریب ہوتی ہے۔

چند نیک بندوں کی مدح میں فرمایا :۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ	وہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے تھے اور ہم کو
وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا (انبیاء-۶)	امید اور ڈر کے ساتھ پکارتے تھے۔

اس سے پرلطف بات یہ ہے کہ اسلام خدا سے لوگوں کو ڈراتا تو ہے مگر اس کو جبار اور قہار کہکر نہیں، بلکہ مہربان اور رحیم کہکر، چنانچہ خدا کے سعید بندوں کی صفت یہ

...الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (یٰس-۱)	اور رحم کرنیوالے سے بن دیکھے ڈرا،
...الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (ق-۲)	جو رحم کرنیوالے سے بن دیکھے ڈرا،

نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کی زبان اس مہربان کے جلال کے سامنے گنگ ہے۔

وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ   اور رحم والے کے ادب سے تمام

(طٰہٰ - ۶)   آوازیں پست ہو گئیں۔

دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے وہ دو قسم کے تھے، ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ تھا، اس لئے وہ صرف خدا کے خوف و خشیت کی تعلیم دیتے تھے۔ مثلاً حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ، دوسرے وہ جو محبتِ الٰہی میں سرشار تھے اور وہ لوگوں کو اسی خمخانۂ عشق کی طرف بلاتے تھے، مثلاً حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ۔

لیکن پیغمبروں میں ایک ایسی ہستی بھی آئی، جو ان دونوں صفتوں کی برزخِ کبریٰ، جلال و جمال دونوں کا مظہر اور پیار و ادب دونوں کی جامع تھی۔ یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ایک طرف آپ کی آنکھیں خوف الٰہی سے اشکبار رہتی تھیں، اور دوسری طرف آپ کا دل خدا کی محبت اور رحم و کرم کے سرور سے سرشار رہتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں یہ دونوں منظر آپؐ کے چہرہ انور پر لوگوں کو نظر آجاتے تھے......

رحمتِ الٰہی اللہ تعالیٰ کے غضب پر سبقت لے گئی ہے۔

الغرض اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ وہ خوف اور محبت کے کناروں سے ہٹا کر جہاں سے ہر وقت نیچے گرنے کا خطرہ ہے، خوف و خشیت اور رحم و محبت کے بیچ کی شاہراہ میں انسانوں کو کھڑا کرے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ الایمان بین الخوف والرجاء، ــــ ایمانِ کامل خوف اور امید کے درمیان ہے۔ کہ تنہا خوف لوگوں کو خدا

کے رحم وکرم سے نا امید اور محض رحم وکرم پر بھروسہ ان کو خودسر اور گستاخ بنادیتا ہے جیسا کہ اس عملی دنیا کے کاروبار میں نظر آتا ہے۔ اور مذہبی حیثیت سے اس کے نتائج کا مشاہدہ عملاً یہودیوں اور عیسائیوں میں کیا جاسکتا ہے۔ اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم میں ان دونوں متضاد کیفیتوں کو ایمان اور عقیدہ کی رو سے برابر کا درجہ دیا، لیکن ساتھ ہی عاجز و درماندہ انسانوں کو بھی بشارت سنائی، کہ خدا کی رحمت کا دائرہ اس کے غضب کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہے، فرمایا۔

وَرَحْمَتِىْ وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ (اعراف۔ ۹) — اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے

اور اس کی تفسیر خود صاحب قرآن علیہ السلام نے ان الفاظ میں کی۔

رحمتی سبقت غضبی (بخاری) — میرے غضب سے میری رحمت آگے بڑھ گئی۔

———— (رحمت ورافت، محبت و پیار کے انہیں جذبات کے اظہار کیلئے اسلام نے خالق کا اسم ذات جو تجویز کیا۔ وہ بھی انہیں معانی پر دلالت کرتا ہے کہ) "ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لئے ...... ہر قوم نے عَلَم اور نام کیلئے اسی وصف کو پسند کیا ہے۔ جو اس کے نزدیک اس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہے۔"

حب الٰہی اسلام نے خالق کے لئے جو نام اور عَلَم اختیار کیا ہے وہ

ۛلہ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے دو شعر ہیں جس میں یہی تعلیمات منظوم ہوگئیں ہیں ؎

تو محبت میں قدم حدِ ادب سے باہر نہ رکھ — وہ ہمہ خوبی و محبوبی سراپا ناز ہے

ادب سے دیکھ لیں مشتاق دور سے انکو — مجال ہے جو انہیں کوئی ہمکنار کرے

لفظ اللہ ہے ـــــ اللہ کے معنٰی "محبوب اور پیارے" کے ہیں جس کے عشق و محبت میں نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات سرگرداں، متحیر اور پریشان ہے حضرت مولانا فضل رحمٰنؒ گنج مراد آبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے 'اللہ' کا ترجمہ وہ ہندی میں 'من موہن' یعنی "دلوں کا محبوب" کیا کرتے تھے، ـــــ لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں خدا کا دوسرا علَم ....لفظ "رحمان" ہے۔ جو رحم و کرم و لطف و مہر کے معنٰی میں صفت مبالغہ کا صیغہ ہے،

قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ اَوِ ادْعُوا	اس کو "محبوب" (اللہ) کہو یا "مہربان"
الرَّحْمٰنَ اَیًّامَّا تَدْعُوْا فَلَہُ	(رحمان) کہو، جو کہکر پکارو سب اچھے نام
الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (بنی اسرائیل-۱۲)	اسی کے ہیں۔

اسلام میں حبّ الٰہی کا تصور .... اب ان آیتوں اور حدیثوں کو دیکھو جن سے یہ روشن ہوتا ہے۔ کہ اسلام کا سینہ اُس ازلی و ابدی عشق و محبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے۔ اور وہ خمخانہ الست کا پہلا حکم ایمان ہے۔ ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت "حبّ الٰہی" ہے۔ اور یہ وہ دولت ہے۔ جو اہلِ ایمان کی پہلی جماعت کو عملاً نصیب ہو چکی تھی۔ زبان الٰہی نے شہادت دی۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا	اور جو ایمان لائے، وہ سب سے
لِلّٰہِ (بقرہ-۲)	زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں

اس نشۂ محبت پر باپ، ماں، اولاد، بھائی، بیوی، جان، مال، خاندان سب کو قربان اور نثار ہو جانا چاہیئے ....

ایمان کے بعد بھی اگر نشۂ محبت کی سرشاری نہیں ملی تو وہ بھی جادۂ حق سے سے دوری ہے .... حضرت مسیحؑ نے فرمایا "درخت اپنے پھل سے پہچانا

جاتا ہے" ہر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری آثار اور جسمانی علامات سے پہچانی جاتی ہے۔ تم کو زید کی محبت کا دعویٰ ہے۔ مگر نہ تمہارے دل میں اس کے دیدار کی تڑپ ہے۔ نہ تمہارے سینہ میں صدمۂ فراق کی جلن ہے۔ اور نہ آنکھوں میں ہجر و جدائی کے آنسو ہیں۔ تو کون تمہارے دعویٰ کی تصدیق کرے گا۔ اسی طرح خدا کی محبت اور پیار کے دعویدار تو بہتیرے ہو سکتے ہیں۔ مگر اس غیر محسوس کیفیت کی مادی نشانیاں اور ظاہری علامتیں اس کے احکام کی پیروی اور اس کے رسول کی اطاعت ہے، خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اعلان کا حکم ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (آل عمران - ۴)

"اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو کہ خدا بھی تم کو پیار کرے گا"

محبت کیونکر حاصل ہو۔ وحیِ محمدی نے اس رتبۂ بلند کے حصول کی تدبیر بھی بتادی فرمایا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۔ (مریم - ۶)

"جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے۔ رحمت والا خدا ان کیلئے محبت پیدا کرے گا"

اس آیت میں محبت کے حصول کے دو ذریعے بتائے گئے ہیں۔ ایمان اور عمل صالح یعنی نیک کام، چنانچہ طبقاتِ انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں۔ جن کو ان ذریعوں سے خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے ————"

دنیا کی عیش و مسرت میں اگر کوئی خیال کانٹا سا چبھتا ہے۔ اور ہمیشہ انسان کے عیش و سرور کو مکدر اور منغص بناکر بے فکری کی بہشت کو فکر و غم کی جہنم بنا دیتا ہے تو وہ ماضی و حال کی ناکامیوں کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی ہے پہلے کا نام حزن و غم اور دوسرے کا خوف و دہشت ہے۔ غرض غم اور خوف یہی دو کانٹے ہیں۔ جو عاجز و درماندہ انسان کے پہلوؤں میں ہمیشہ چبھتے رہتے ہیں۔ لیکن جو محبوب حقیقی کے طلبگار اور اس کے والہ و شیدا ہیں،

ان کو بشارت ہے۔ کہ ان کے عیش کا چمن زار ان کانٹوں سے پاک صاف رکھے ' ....

عام مسلمانوں میں پیغمبر اسلام کا لقب "حبیب خدا" ہے۔ دیکھو کہ حبیب و محبوب میں خلّت و محبت کے کیا کیا ناز و نیاز ہیں۔ آپ خشوع و خضوع کی دعاؤں اور خلوت و تنہائی میں کیا مانگتے تھے، کیا چاہتے تھے اور کیا سوال کرتے تھے؛ امام احمد اور بزاز نے مسندوں میں، ترمذی نے جامع میں حاکم نے مستدرک میں اور طبرانی نے معجم میں متعدد صحابیوں سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں محبت الٰہی کی دولت مانگا کرتے تھے۔ انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اپنے اہل و عیال کی جان ہے۔ لیکن محبوب خدا کی نگاہ میں یہ چیزیں ہیچ تھیں۔ دعا فرماتے تھے خداوندا

أسئل حبّك وحبّ من يحبّك	میں تیری محبت مانگتا ہوں۔ اور جو تجھ
وحبّ عمل يقرب الى حبّك۔	سے محبت کرتا ہے اسکی محبت اور اس کام
(احمد، ترمذی، حاکم)	کی محبت جو تیری محبت سے قریب کر دے۔
اللّٰهمّ اجعل حبّك احبّ اليّ	الٰہی تو اپنی محبت کو میری جان سے'
من نفسی واهلی ومن الماء	میرے اہل و عیال سے ٹھنڈے پانی
البارد (ترمذی وحاکم)	سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بنا۔

عرب میں ٹھنڈا پانی دنیا کی تمام دولتوں اور نعمتوں سے زیادہ گراں اور قیمتی ہے۔ لیکن حضور کی پیاس اس مادی پانی کی خنکی سے نہیں بجھتی تھی۔ وہ صرف محبتِ الٰہی کا زلالِ خالص تھا جو اس تشنگی کو تسکین دے سکتا تھا، عام انسان روٹی سے جیتے ہیں۔ مگر ایک عاشقِ الٰہی (مسیحؑ) کا قول ہے کہ "انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا" پھر وہ کونسی روٹی ہے جس کو کھا کر انسان کبھی بھوکا نہیں ہوتا۔ حضورؐ دعا فرماتے ہیں:-

اللّٰھمّ ارزقنی حبّك وحبّ — خداوند! تو اپنی محبت اور اسکی محبت جو

من ینفعنی فی حبك (ترمذی) — تیری راہ میں نافع ہو روزی کر،

عام ایمان خدا اور رسول پر یقین کرنا مگر جانتے ہو کہ اس راہ میں آخری منزل کیا ہے

صحیحین میں ہے۔

من کان اللّٰہ ورسوله احبّ — یہ کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے

الیه مما سواھما (مسلم، بخاری کتاب الایمان) — تمام ماسوا کی محبتیں ہیچ ہو جائیں۔

جمالِ حق کا پہلا مشتاق، اور مستور ازل کے زیر نقاب چہرہ کا پہلا بند کشا، زندگی کے آخری مرحلوں میں ہے۔ مرض کی شدت ہے۔ بدن بخار سے تپ رہا ہے۔ اٹھ کر چل نہیں سکتا۔ لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلان خاص کی طاقت پاتا ہے مسجد نبوی میں جانثار حاضر ہوتے ہیں۔ سب کی نظریں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف لگی ہیں۔ نبوت کا آخری پیغام سننے کی آرزو ہے دفعتہً لب مبارک ہلتے ہیں۔ اور یہ آواز آتی ہے۔ لوگو! میں خدا کے سامنے اس بات کی برأت کرتا ہوں کہ انسانوں میں میرا کوئی دوست ہے، مجھکو خدا نے اپنا پیارا بنایا ہے۔ جیسے ابراہیمؑ کو اس نے اپنا پیارا بنایا تھا۔ یہ تو وفات سے پہلے کا اعلان تھا۔[1] عین حالت نزع میں زبانِ مبارک پر یہ کلمہ تھا۔ "خداوندا! بہترین رفیق" (صحیح بخاری ذکر وفات نبویؐ)

...... محبت کا یہ پرکیف نغمہ دنیا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زبان مبارک سے سنا، تسلی وتشفی کا یہ روح افزا پیام آپ ہی کے مبارک لبوں سے ادا ہوا۔ عفو وکرم کے بحر بیکراں کا یہ ساحل امید آپ ہی کے دکھانے سے ہمیں نظر آیا......

.... صلی اللہ علیہ وسلم." (تفصیل کیلئے دیکھو سیرت النبی ج ۴ ص۵۲۱ تا ص۵۵۲)

---

[1] صحیح مسلم کتاب المساجد

محبت کی اسی اہمیت کے پیش نظر حضرت سید الملۃ قدس سرہٗ راہ سلوک معرفت کے جادہ پیماؤں کو حب الٰہی سے سیراب، ان کے سینوں کو آتش عشق سے روشن اور ان کے اعمال میں اسکا اثر نمایاں دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک طالب نے عرض کیا۔
"حضرت درد دل کیسے حاصل ہو" فرمایا

جو آج لذتِ دردِ نہاں کا جویا ہے ۔۔۔ وہ پہلے سوز سے دل کو تو داغدار کرے
ابھی تو مشق فغاں کنج میں ہزار کرے ۔۔۔ اثر کے واسطے کچھ اور انتظار کرے

پھر ارشاد فرمایا:۔ محبت نہ ہونے کی حسرت بھی بڑی نعمت ہے۔

محبت تو اے دل بڑی بات ہے ۔۔۔ یہ کیا کم ہے اس کی جو حسرت ملے
یہی زندگی جاودانی بنے ۔۔۔ جو آبِ حیات محبت ملے
ترے عشق کے غم کی دولت ملے ۔۔۔ تو سارے غموں سے فراغت ملے

اس کے بعد ارشاد فرمایا:۔ اُس کی خواہش ہو۔ تو اہل اللہ کی صحبت اختیار کرے محبت خاصانِ خدا کے قلوب کا خاص نور ہے"۔

ایک مرتبہ تسبیحاتِ فاطمہؓ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔
"کہ 'سبحان اللہ' کا مطلب ہے۔ کہ وہ تمام کمیوں سے بری اور پاک ہے۔ 'الحمد للہ' کا مطلب ہے۔ کہ تمام محبوبیتیں اور خوبیاں اللہ ہی کے لئے ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے تو محبت سے جی چاہتا ہے۔ کہ چمٹ جائے۔ لیکن آگے 'اللہ اکبر' کہہ کر یہ بتایا گیا۔ کہ وہ اتنی بڑی ذات ہے کہ وہاں یہ بات ممکن نہیں۔

پاؤں تو حدِ ادب سے عشق میں باہر نہ رکھ
وہ ہمہ خوبی و محبوبی سراپا ناز ہے"

حب عقلی و شرعی مطلوب ہے حضرت سیدی نور اللہ مرقدہٗ حب طبعی کی بجائے ایک محقق عارف کی حیثیت سے حبِ عقلی و شرعی کی تلقین فرماتے تھے۔ حبِ عقلی کا خاصّہ پابندی احکام ہے۔ اور اس کی ترقی بھی اوامر الٰہیہ کے ظاہری و باطنی امتثال اور اعمال صالحہ پر منحصر و موقوف ہے۔ طبعی محبت گو ایک نعمت ضرور ہے۔ لیکن اِسکی بقا اور مقبولیت کا انحصار بھی کتاب و سنت کے اتباع و فرمانبرداری پر ہے۔ کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (ال عمران۔ ۱۱)	آپ کہہ دیجئے۔ کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔

ایک سالک کو لکھتے ہیں:۔

"اگر آپ کو اپنے اعمال حسنہ کے متعلق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سراب ہیں، تو ایسا سمجھنا اس بنا پر ہے کہ آپ کو ان میں چمک دمک اور لطف و تڑپ نہیں محسوس ہوتی۔ جو نتیجہ ہے محبتِ طبعی اور محبت عقلی میں فرق نہ کرنے کا۔ محبت طبعی ہی چیز ہے۔ جس کے آثار ظاہرہ حیوانات تک میں محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن محبت عقلی میں کمال سادگی ہوتی ہے۔ اور اس کا منشاء صرف طلبِ رضائے دوست اور اس کے حکم کی تعمیل ہے۔ (تذکرہ سلیمان ص۶۱۳)

ایک طالب کے خط کے جواب میں ارقام فرماتے ہیں:

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض و برکات ہر وقت جاری ہیں اپنے میں استفادہ کا مادہ ہونا چاہیئے۔ اور اس کی صورت حضور علیہ السلام کی

محبت عقلی" ہے. جسکا مظہر اتباع احکام و سنت ہے."

گویا حب الٰہی ایک شجرِ طیبہ ہے. اور اس کے برگ و بار اعمال صالحہ ہیں یایوں کہیئے کہ حب الٰہی اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور و بقا اوامر الٰہی اور سنت نبوی کے ظاہری و باطنی اتباع کا صلہ و نتیجہ ہے۔ اسلئے مطلوب و مقبول عشق الٰہی اور حب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا حصول بغیر احکام شرعیہ کی کامل پابندی کے ممکن نہیں.

حضرت والا قدس سرہٗ ایک طالب کو اس شکایت کے جواب میں "کہ طبعی کمزوری کی بنا پر بعض اوقات دوسروں کے اصرار (کی وجہ) سے لغزش ہو جاتی ہے"
تحریر فرمایا؛ ـــــــــ

"کسی شخص کے کہنے سے یا اصرار سے کام کرنا اگر امرِ مباح ہے۔ یعنی شرع سے اسکی اجازت ہو، توخیر کسی مسلمان کی خوشی کے ثواب کی نیت سے کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ امر اگر غیر مباح اور ناجائز ہے تو کسی حال میں اس کا کرنا درست نہیں۔ لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق۔ دوسرے جس شخص کے اصرار سے آپ کرتے ہیں۔ اس کی رضا آپ کو مقصود ہوتی ہے ـــــــ تو آیا رضائے الٰہی مقصود ہونا چاہیئے یا کسی غیر کی رضا، پھر دعوئے عشق یا تمنائے عشق کے کیا معنی۔"

ایک طالب کو لکھا ـــــــــ

"یہ طبعی احوال ہیں۔ جو بدلتے (ادلتے) رہتے ہیں۔ طبعی احوال پر حکم نہیں لگایا جا سکتا، ایمان کا تعلق عقلی کیفیت (سے) ہے ـــــــ آپکی استقامت و اصلاح احوال کے لئے دعا کرتا ہوں اس سے ترقی تنزل کا اندازہ ہوتا ہے۔ معمولات اور احکام الٰہی کی اطاعت اور گنا

سے پرہیز یہی اصل چیز ہے۔"

جوش و خروش جو طبعی محبت کا خاصہ ہیں۔ وہ بھی باوجود محمود ہونے کے مقصود نہیں حضرتِ والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک سالک کو لکھتے ہیں:

"ابتدائی جوش و شوق میں جو کمی ہے۔ وہ فطری ہے۔ یہ مرحلہ زندگی میں پیش آتا ہے یہ کوئی افسوس کی چیز نہیں۔ جوش و شوق ہو یا نہ ہو عمل میں کوتاہی نہ ہونے پائے، جس طرح آغازِ شباب میں عروسِ نو کے ساتھ جو شوق و جوش طبع کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ وہ رفتہ رفتہ تمکین سے بدل جاتا ہے۔ اور بجائے بوالہوسی کے دیرینہ محبت و باہمی وفاداری اس کی جگہ لیتی ہے۔ میرا ایک شعر ہے۔

دیکھئے ملتی ہے کب دولت سکونِ عشق کی
ہائے وہ تو جوش تو ہنگامۂ آغاز ہے

ایک اور صاحب کو ارقام فرمایا:

"........ محبت کا اقتضائے حال اور کیفیات و جذبات پر عقل کو غالب کرنا اور عقل پر حکمِ شرع کو غالب کرنا اصل دین ہے۔

استغراق مقصود نہیں اسی طرح استغراق بھی مقصود نہیں۔ بلکہ غلبۂ محبت کے باوجود ہوش و حواس کی بقا اور احکامِ الٰہی کی کامل فرمانبرداری مطلوب ہے۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک طالب کو تحریر فرماتے ہیں:—

"باقی جو آپ کی تمنا ہے کہ آپ کو عشقِ الٰہی اور عشقِ رسولؐ ملے اور اس میں استغراق ہو جائے تو جہاں تک تمنا کا تعلق ہے مناسب ہے لیکن یہ سمجھنا کہ آپ کو عشقِ الٰہی اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حاصل نہیں۔ صحیح

نہیں ہر مومن کو اسکا مرتبہ کچھ نہ کچھ حاصل ہے۔ اور آپ کی یہ صورت تمنا اس کی دلیل ہے۔ البتہ اس میں ترقی اعمال خیر میں ترقی ہی سے ممکن ہے۔ جس قدر اعمال خیر میں ترقی ہوگی۔ اور محبوب حقیقی کے احکام کی تعمیل میں ترقی ہوگی۔ اسی قدر اس مرتبہ میں ترقی ہوگی، انشاء اللہ تعالیٰ باقی استغراق اور انہماک کی طلب تو یہ ناسمجھی سے ہے۔ استغراق و انہماک کمال نہیں چنانچہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم اس سے پاک تھے۔ آپ غور کریں۔ کہ کسی محبوب کے احکام کی تعمیل میں دیوانہ پن اور بے خبری دلیل کمال ہے یا ہشیاری اور بیداری کمال کی دلیل ہے سنا ہے کہ انگریز سپاہی شراب میں مست ہو کر لڑتا ہے اور پٹھان پوری ہشیاری اور بیداری سے بتائیے ان دونوں میں شجاعت اور بہادری کا اعلیٰ نمونہ کس میں ہے۔"

ایک سالک کو ارقام فرماتے ہیں:۔

"ابھی تک آپ کی سمجھ میں ذکر کی حقیقت نہیں آئی، اس سے مقصود محبت الٰہی کی ترقی ہے ـــــ "استغراق" اور "حضور" دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ استغراق، تو اس کا نام ہے۔ کہ انسان کا شعور باطل ہو جائے۔ بوجہ شدت انہماک کے تو یہ مطلوب و ممدوح نہیں۔ البتہ 'حضور' مطلوب و ممدوح ہے۔ وہ اس کا نام ہے کہ فی الجملہ ذکر میں مذکور یعنی اللہ تعالیٰ کا نام ہو۔ یا قلب کی طرف توجہ یا خود ذکر کی طرف دھیان ہو، ان میں سے جو بات جس وقت اور جتنی بھی حاصل ہو جائے وہ شکر کے قابل ہے۔ کیونکہ وہ عطائے الٰہی ہے۔ اختیاری نہیں!"

حاصل یہ ہے کہ حبِّ الٰہی مقصود ہے۔ لیکن جوش وخروش اور محبت کے طبعی انفعالات مطلوب نہیں۔ بلکہ اسکی عقلی وشرعی کیفیت درکار ہے۔ اور ایسی ہی محبت جو جوشِ طریقت کو ہوشِ شریعت کا تابع رکھے، روحِ سلوک ہے۔ اس محبت سے جو دل روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ سرمدی کیف ویقین سے مالا مال ہو جاتے ہیں۔ شکوک وشبہات، اوہام واشکالات، بے یقینی وتذبذب نورِ ایمان کی روشنی سے کافور ہو جاتے ہیں۔ اسی کے متعلق عارف رومی نے کہا ہے۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت وناموس ما اے تو افلاطون وجالینوس ما

کہ اللہ تعالیٰ بڑا رؤف ورحیم ہے۔ اس کے در پر جو بھی دردِ دل کی سوغات لیکر حاضر ہوتا ہے۔ نامراد نہیں لوٹتا۔ اس کا دریائے فیض تو ہر وقت جاری ہے، نگاہِ لطف تو بہانہ تلاش کرتی ہے

وہ چشمِ محبت تو جویائے محبت ہے دیکھیے تو ذرا کر کے اس سے کوئی یارانہ

حضرت والا ایک دل شکستہ طالب کو تحریر فرماتے ہیں۔

"مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ سراسر امید ہیں وہ رؤف ورحیم ہیں۔"

ایک طالب کو جس نے اپنے حالات میں کوتاہی اور کمی کا تذکرہ کیا تھا تحریر فرماتے ہیں۔

"آپ نے اپنے موجودہ حالات جو لکھے ہیں۔ وہ بے شبہہ گذشتہ سے فروتر ہیں۔ مگر کوئی مایوسی کی بات نہیں۔ بحمداللہ تعالیٰ جب تک قلب میں اپنی کمی پستی کا احساس اور بہتر حالت وکیفیت کی طلب کا جذبہ ہے روح کی زندگی کی نشانی باقی ہے۔ اور جب تک یہ کیفیت باقی ہے۔

علاج بہت آسان اور حالات امید افزا ہیں۔

باز آ، باز آ، ہر آنچہ ہستی باز آ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اللہ تعالیٰ گنہگاروں کو بھی اپنا بندہ کہتا ہے۔ اور ان کو مایوسی سے روکتا ہے۔

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ (القرآن)	اے میرے وہ گنہگار بندو! جنہوں نے اپنے جانوں پر ظلم کیا ہے۔ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

اللہ اکبر! یہ کیسی نوید جانفزا ہے۔ بس اتنی دیر ہے کہ بندہ "استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ" پڑھکر پھر اپنا کام شروع کردے۔ پھر وہی بخشش ہوگی۔ پھر وہی نوازشیں ہوں گی۔

غور کیجئے۔ اگر بادشاہ سے ملاقات نہ ہو، تو ایک درجہ کی محرومی ہے۔ لیکن دربار میں بار پانے کے بعد پھر وہاں سے فرار، اور کسی دوست سے دوستی بڑھاکر پھر انقطاع نہ صرف اپنی محرومی بلکہ اس بادشاہ کی ناراضی اور اس دوست کے ملال کا باعث ہے۔"

اس اقتباس سے معلوم ہوا۔ کہ محبوب ازلی تو خود سراپا رحمت اور جویائے محبت ہے اگر انسان کی طرف سے معمولی کوشش بھی ہو تو توفیق خداوندی دستگیری فرماکر عطا سے مالا مال کر دیتی ہے۔

ان کے کرم کے ہم نثار، انکی عطا کا کیا شمار
دیدیا عاصیوں کو بار، اپنے حریم ناز میں

وصول بذریعہ جذب ہے حضرت شیخ قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے :-

" وصول تو ہر ایک کا جذب ہی سے ہوتا ہے - یہ الگ بات ہے کہ کوئی راہ سلوک کو پہلے طے کرتا ہے کوئی بعد میں "

انہیں کے دینے سے ملتا ہے جس کو ملتا ہے

حضرت سیدی نور اللہ مرقدہٗ کا ارشاد ہے کہ :-

" بندہ اگر کوشش کرے تو وہ ہدایت کیلئے اسے خود قبول فرمالیتے ہیں جیسے بچہ اگر قدم اٹھائے اور دو چار قدم چل کر گر جائے تو ماں باپ پیار سے خود اٹھا لیتے ہیں - اسی طرح اللہ میاں بھی گود پھیلائے ہوئے ہیں - کہ میرا کون سا بندہ میری طرف آتا ہے - کہ اسے میں اپنی رحمت سے قبول کر لوں "

ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

" کام میں لگے رہیئے - منزل مقصود تک تو رسائی انشاء اللہ تعالیٰ ایک دن ہو ہی جائے گی - "

آہی جائیگا کبھی اس تک بھی ساقی دور جام
منتظر بیٹھا ہوا جو بھی تیری محفل میں ہے

اجتباءٗ و انابت " اجتباء " (چناؤ) کا راستہ ان کی خصوصی رحمت و عنایت کا راستہ ہے ' انابت ' کا راستہ عام سنت الٰہی ہے - اس لئے بندہ کو چاہیئے عام راستے یعنی " انابت " والے راستے کو اختیار کرے - تو انشاء اللہ ہدایت تو ایک دن نصیب ہو ہی جائیگی - اپنا کام کوشش و سعی کرنا ہے نوازنا ان کا کام ہے

ارشاد ہے:۔ اللّٰہُ یَجْتَبِیْ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَاءُ وَیَھْدِیْ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ ۔۔۔ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا ۔۔۔

طلب و وصول اِس سلسلے میں حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ یہ چیز خاص طور پر فرمایا کرتے تھے کہ:۔۔۔ "ہم طلب وکوشش کے مکلف ہیں، وصول کے نہیں اس لئے سالک کیلئے ہمت کرکے کوشش کرلینا ہی کافی ہے۔ اس راستہ میں ہر قدم راہ بھی اور منزل بھی، ذریعہ بھی اور مقصد بھی، یعنی اپنی ہمت وکوشش سے رضائے الٰہی کی جستجو میں لگا رہے۔ اور اس راستہ میں جتنی گھاٹیاں آئیں گی وہ حصول ہی کا حکم رکھیں گی، کیونکہ سالک کا کام صرف محنت وجستجو ہے، حضرت والاؒ فرماتے ہیں:۔ ؎

جد وجہد دہر میں ہے ذوق وشوق لطف دید — حاصل ہر سعی میری سعی لاحاصل میں ہے
منزل مقصود ہے، راہ طلب کا ہر قدم — وہ سر منزل ہے جو اب تک رہ منزل میں ہے
ہر ضرب تیشہ ساغر کیف وصال دوست — فرہاد کی جو بات ہے مزدور کی نہیں

وصول غیر اختیاری ہے بعض سالکین 'وصول' کی فکر میں ذریعہ 'وصول' سے ہی غافل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ وصول اختیاری نہیں اور انسان غیر اختیاری امور کا مکلف نہیں۔ اس لئے کوشش کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید کامل رکھنی چاہئے وہ کسی کی محبت اور طلب کو ضائع نہیں کرتی، اور نجات کی کوئی نہ کوئی راہ نکال دیتی ہے ایک طالب نے لکھا۔" ان کی رحمت کا ہی محتاج ہوں۔ ان ہی سے امید ہے کہ اس نااہل سے کرم والا معاملہ فرمائیں گے" اس کے جواب میں سیدی حضرۃ الشیخ قدس سرہٗ نے تحریر فرمایا:۔۔۔

" انشاء اللہ تعالیٰ، اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ حسنِ ظن ہی رکھنا چاہیئے۔ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ

عبدی بی کا منشاء یہی ہے۔"

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، مقصد یہ تھا، کہ حب الٰہی اور خشیت الٰہی کے جذبات کے ساتھ انسان ایمان کی زیادتی اور اعمالِ صالحہ کی بجاآوری میں لگا رہے۔ تو انشاء اللہ تعالیٰ منزل مقصود تک رسائی ہو ہی جائے گی، مگر راستہ میں منزل تک پہنچنے کی بیتابی نہیں چاہیئے۔ اور نہ وصول کو مقصد سمجھنا چاہیئے۔ ذرائع وصول یعنی ایمان باللہ اور اعمالِ صالحہ کی بجاآوری میں لگا رہے۔ وہ خود کبھی نہ کبھی شرف قبول سے نوازیں گے ؎

گر نشینی بر سر کوئے کسے عاقبت بینی تو ہم روئے کسے

صدیقین و مخلصین تو اس کی رضا و طلب میں اپنا سب کچھ قربان کر دینے ہی کو وصول و فوز سمجھتے ہیں ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے۔